دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

نومبر 2020

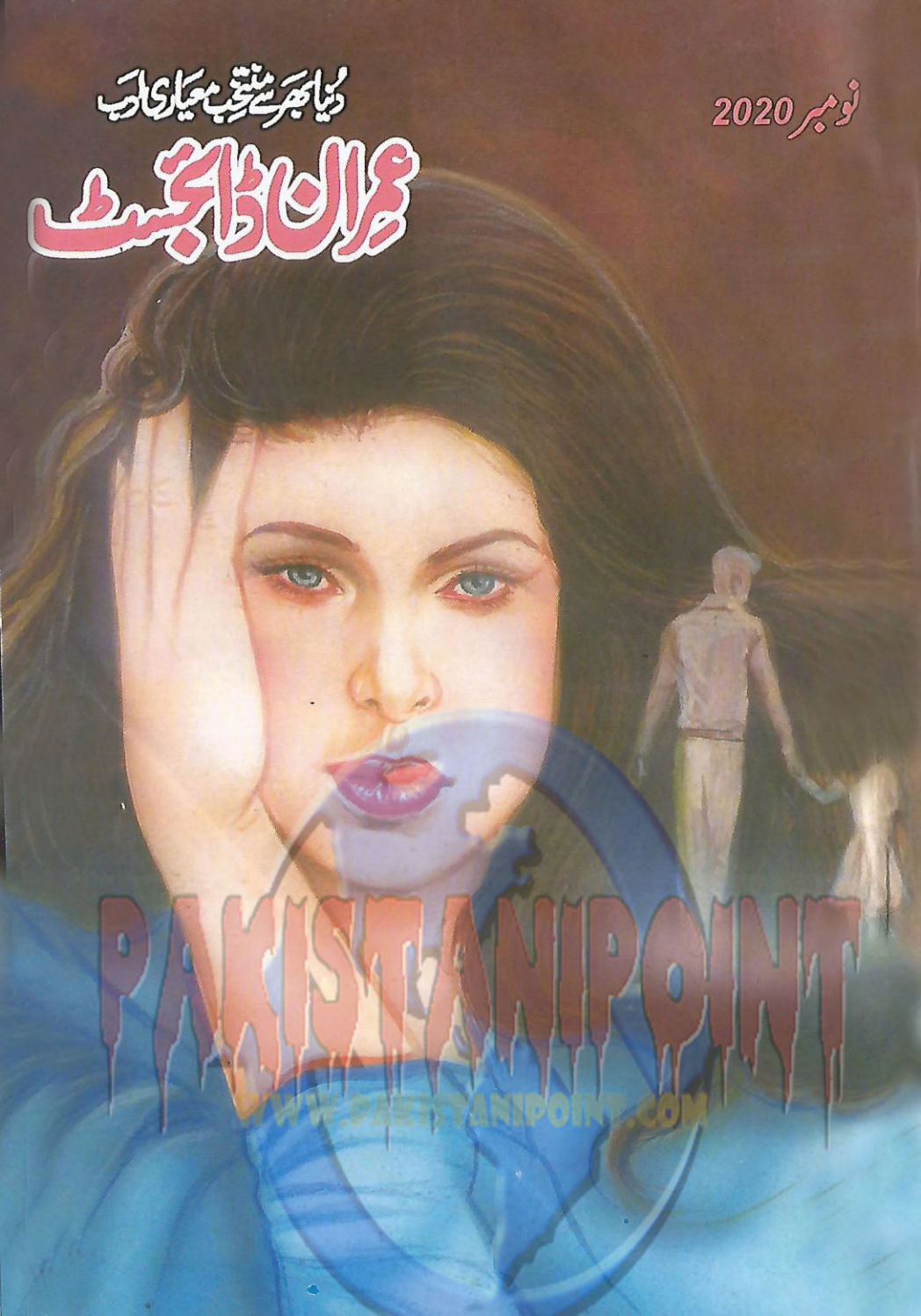

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

لاش کی بیداری

بین الاقوامی شہرت کی مالک اس سفاک مجرمہ کی سنسنی خیز داستان جس کی انٹرپول سے لے کر مختلف سیکرٹ سروسز میں دھوم تھی جو ہانگ کانگ کی خطرناک مجرمہ ہے۔ اس پر کئی ملکوں میں بغاوت کرانے اور ان کے سرکاری راز چرانے کا الزام ہے۔ وہ بھیس بدلنے کے ساتھ آواز بدلنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور کم از کم بیس زبانوں کی ماہر ہے۔

6 قانون والا

نیا حساب

کرشن چندر نے اپنی کہانیوں میں ہمیشہ طبقاتی سوال کو اٹھایا ہے۔ لہٰذا ان کے کردار مل مزدور، کسان، نمک کی کان میں کام کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ جاگیردار اور سرمایہ دار رہے ہیں۔ یہی ان کی خاصیت ہے جو کہ انہیں باقی افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک رومان پرور اور ناتجربہ کار نوجوان کی آپ بیتی اس کے انکار کے باوجود اس کے باپ نے اسے حساب کتاب سیکھنے پر لگادیا تھا۔

54 کرشن چندر

دوزخ

خلاء میں تیرتے ہوئے دو مسافروں کا احوال ان کا خلائی جہاز تباہ ہوچکا تھا۔ اب انہیں صرف وہ آلات ہی خلائی اسٹیشن تک پہنچا سکتے تھے جو محفوظ رہ گئے تھے۔ زیر نظر تحریر پڑھنے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ انسانوں میں محبت کے جذبے کی شدت کیا ہوتی ہے اور یہ جذبۂ محبت انسان سے کیا کچھ کروالیتا ہے جبکہ مشینی انسان بے حس ہوتے ہیں۔

61 اخلاق احمد

دمک رہے ہیں بام و در

لمحے جب کھوجائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی لیے زندگی کی تلاش میں تھا کہ ایک چاند گھر کی دہلیز پر اس کا منتظر تھا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

64 ماریہ حکیم

ایک دریچہ کھلا رہا

اگر کوئی لڑکی رخصتی سے پہلے بیوہ ہوجائے تو اس پر منحوس کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ وسوسوں اور اندیشوں نے اس کی پر بہار زندگی میں الجھنوں کا زہر گھول دیا تھا۔ ان بکھرے گیسوؤں کی کہانی جنہوں نے سلجھنے میں قسمت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

93 نزہت جبیں ضیاء

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ستارے ہم کو دیکھیں گے

جنون کی راہ پر دیوانگی کے پھول کھلتے ہیں۔ اس نے بھی چمن زاروں میں بہاروں کے خواب دیکھے تھے مگر رنجشوں کی منہ زور آندھیوں نے سب کچھ بدل دیا۔ صبح وصال کے ماروں کا فسانہ، برق جس آشیانے پر گری اسے بنانے میں ایک زمانہ لگا تھا۔

کوثر ریاض 103

روشنی سفر میں ہے

ہمارے معاشرے میں قربانی ہمیشہ عورت دیتی ہے۔ وہ بھی سیاہ رات میں دہلیز کو پیچھے چھوڑ آئی تھی لیکن تاریک اندھیروں کے سوا اس کے مقدر میں کچھ نہ تھا۔ ایک لاچار و بے بس مامتا کی کتھا وہ اپنی اولاد کے لیے طعنہ سننے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

خالدہ 137

خونی عفریت

ماہرین نفسیات کے مطابق انسان اپنی جبلتوں کے زیر اثر جیتے ہیں۔ ان جبلتوں میں جذبہ بقاء جسمانی تقاضے، مثلاً کھانا پینا، سونا جاگنا، جنسی تسکین اور حصول مسرت، ہر انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ بنیادی اور جبلی ضروریات کے حصول میں گھٹن، معاشرتی عدم توازن اور رسم ورواج رکاوٹ بن جاتے ہیں پھر افراد میں بغاوت جنم لیتی ہے کیونکہ جبلی تقاضوں کو اپنی تسکین چاہیے ہوتی ہے۔

ایم الیاس 144

خواہش

زندگی ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے مگر ان کو نہیں جن کی زندگی روگ بن جائے۔ ایک ایسے شخص کی بے بسی جس نے ایک ایسی عورت سے شادی کی جو پہلے ہی اپنے چڑیا گھر سے بیاہی جاچکی تھی۔ اس نے اپنے روگ کا علاج ڈھونڈلیا تھا مگر......

طاہر حسین 178

زخم دل بھرتا نہیں

دھندلے آئینوں میں کھوئی ایک لڑکی کا فسانہ، وقت نے اس کے پاؤں میں بھاری زنجیریں ڈال دی تھیں۔ دہکھلتی آنکھوں کی کہانی، انہیں زندان کے واحد روزن سے زندگی نظر آگئی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کا فسانہ جسے تنہائی نے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔

صائمہ خان 186

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37- اردو بازار، کراچی

لاش کی بیداری

قانون والا

بین الاقوامی شہرت کی مالک اس سفاک مجرمہ کی سنسنی خیز داستان جس کی انٹرپول سے لے کر مختلف سیکرٹ سروسز میں دھوم تھی۔ جو ہانگ کانگ کی خطرناک مجرمہ ہے۔ اس پر کئی ملکوں میں بغاوت کرانے اور ان کے سرکاری راز چرانے کا الزام ہے۔ وہ بھیس بدلنے کے ساتھ آواز بدلنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور کم از کم بیس زبانوں کی ماہر ہے۔

قدم قدم پر حیران اور پر لطف سنسنی خیز واقعات سے بھرپور کرنل زاہد کی خطرناک مہم

دوسری اور آخری قسط

رتنا نے خوف زدہ نظروں سے زاہد کو دیکھا۔ اچانک اس کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے۔ وہ بھرآئی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مسٹر زاہد آپ یقین کیجیے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ سانتا کے قتل سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہ گئی پرکاش کی بات تو میں سچ مچ اسے بہت چاہتی تھی۔ اور اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ راجن زندہ ہے تو میں پرکاش سے ہرگز شادی نہیں کرتی۔“

”میں جانتا ہوں آپ بے گناہ ہیں اور اگر آپ مجرم ہوتیں تو اب تک آپ کی لاکھ صفائیوں کے باوجود میں آپ کو گرفتار کر چکا ہوتا۔“ زاہد اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی غلطی صرف اتنی ہے کہ آپ نے مجرموں کے ڈر سے اپنی زبان بند رکھی۔ ویسے یہ بات آپ کو کب معلوم ہوئی کہ راجن زندہ ہے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے۔“ رتنا نے کہا اور سرسوتی کا لایا ہوا خط زاہد کی طرف بڑھا دیا۔ رتنا کے ہاتھ سے خط لے کر زاہد اسے چند سیکنڈ تک پڑھتا رہا، پھر بولا۔

”سرسوتی اور آپ کی بیٹی میگھنا کہاں ہے؟“

”میں نے دوسری منزل پر ایک کمرے میں ٹھہرا دیا ہے۔“ رتنا بولی۔ ”کیا آپ ان سے ملنا چاہیں گے؟“

”ابھی نہیں۔“ زاہد مسکرایا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا ”سرسوتی نے آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتایا؟“

رتنا کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”وہ ایک بیوہ مراٹھن ہے جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ روپ نگر کی رہنے والی ہے اور گزشتہ چار برس سے میگھنا کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ راجن اسے ہر ماہ پانچ سو روپے بھیجتا تھا اور اس رقم سے اپنی اور بے بی کی گزر بسر کے علاوہ وہ ایک اچھے انگریزی اسکول میں پڑھا بھی رہی تھی راجن اس دوران کبھی کبھی اس سے آ کر ملتا رہتا تھا۔“

”کیا وہ جانتی ہے میگھنا سے راجن کا کیا رشتہ ہے؟“ زاہد نے پوچھا۔

”نہیں، راجن نے اسے بتایا تھا کہ میگھنا اسے کسی میلے میں ملی تھی اور وہ میگھنا کے ماں باپ کو تلاش کر رہا ہے۔“

”ہوں.....“ زاہد نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا۔

”مسز رتنا میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس پر آپ کو یقیناً گہرا صدمہ پہنچے گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ آپ کچھ خطرناک لوگوں کی سازش کا شکار ہوئی ہیں۔ راجن شروع سے ہی ایک خطرناک گروہ کا نمائندہ رہا ہے۔ صرف راجن ہی نہیں بلکہ پرکاش دوبے بھی اسی گروہ کا آدمی تھا۔ سانتا اور پرکاش کا قتل اسی گروہ کے لوگوں نے کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں پرکاش کے پاس کوئی ایسی اہم چیز تھی جس کی تلاش مجرموں کو ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چیز پرکاش نے موہن پیلس کے کسی خفیہ تہ خانے میں چھپا رکھی تھی۔ راجن آپ کی ہمدردی حاصل کر کے اس تہ خانے تک پہنچنا چاہتا ہے۔“

”لیکن میں کیا کروں؟“ رتنا پریشانی کے عالم میں بولی۔

”آپ زبان بند رکھیے اور جس طرح میں کہوں وہی کرتی جائیے۔“

”کیا میں راجن سے ملوں؟“

”بالکل اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجیے کہ وہ آپ سے کیا چاہتا ہے؟“

”پتا نہیں کیوں مجھے راجن سے ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

”گھبرائیے مت، جس وقت راجن یہاں آئے گا تو آپ اکیلی نہیں ہوں گی۔“ زاہد مسکرایا۔ پھر بولا۔ ”میں راجن سے ملاقات کے وقت آپ سے دور نہیں رہوں گا۔“

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

''اوہ تھینک یو۔'' رتنا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب مجھے اجازت دیں۔'' زاہد کھڑا ہوگیا۔

''وہ کل رات ایک بجے آئے گا۔'' رتنا بولی۔

''کوئی بات نہیں۔'' زاہد نے اسے دلاسا دینے والے انداز میں کہا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

موہن پیلس سے باہر آ کر زاہد نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ پر ایک گھنے پیڑ کے قریب روکی۔ پیڑ کے نیچے بیٹھے بھکاری نے اسے چونک کر دیکھا اور گاڑی کی طرف لپکا۔

''خدا بھلا کرے بابا۔ بال بچے آٹے دال کی فکر سے آزاد رہیں۔''

ڈاگا کو پھٹے پرانے لباس میں ٹین کا ڈبہ اٹھا کر اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اپنے بٹوے سے روپیہ نکال کر اس کے ڈبے میں ڈالتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''اب یہ ڈرامہ ختم کرو اور پہلی گاڑی سے روپ نگر چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں ہری نگر میں رہنے والی سرسوتی دیوی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ ادھیڑ عمر کی اس بیوہ کا مکان نمبر تین سو چار ہے اور کل شام تک تمہاری واپسی ضروری ہے۔''

ڈاگا نے ایک روپے کے سکے کو اپنے ٹین کے ڈبے میں ہلا کر سر ہلاتے ہوئے زور سے کہا۔ ''خوش رہو بچہ۔ مالک تمہاری گاڑی چالو رکھے۔'' اور دوبارہ پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

خنک آلود سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

وہ دونوں فٹ پاتھ سے ملے ایک چھوٹے سے ٹکوٹے پارک کی بینچ پر بیٹھے تھے۔ یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے جاوید اپنی چرمی جیکٹ کے کالر اوپر کرتے ہوئے ڈاگا سے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ادھر ہنکانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''بھئی زاہد صاحب کی مصلحتیں وہی جانیں۔'' ڈاگا نے مختصر جواب دیا اور سڑک کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

دراصل وہ آج دوپہر میں ہی روپ نگر سے لوٹ آیا تھا۔ پھر سرسوتی دیوی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ سننے کے بعد زاہد نے اس کی ڈیوٹی جاوید کے ساتھ لگا دی تھی۔ شام کے پانچ بجے سے ہی وہ اور جاوید تکو نے پارک کی اس بینچ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اسی دوران وہ کئی بار اٹھ کر آس پاس کے علاقے میں بھٹکنے کے بعد واپس آ چکے تھے۔

ڈاگا کو رہ رہ کر اس پچویشن پر ہنسی آ رہی تھی کہ وہ اپنے ہی فلیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ ادھر جاوید کا یہ حال تھا کہ وہ اس نگرانی سے اکتا کر سنجیدگی سے خودکشی کے باری میں سوچنے لگا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ زہر مار کر لیا جائے۔'' جاوید ڈاگا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ورنہ جس پیڑ پر میں گزشتہ دو دنوں سے بسیرا کر رہا ہوں وہاں کھانا نہیں ملے گا۔''

ڈاگا نے مسکرا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، کھاؤ، میں نے شام کو پانچ بجے کافی کچھ کھا لیا تھا۔''

''سمجھ دار آدمی ہو۔'' جاوید نے اپنی اندرونی جیب سے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکالی اور اس میں سے کچھ سینڈوچ نکال لیے۔

''یعنی اپنا توشہ ساتھ رکھتے ہو؟'' ڈاگا ہنسا۔

''دور اندیش آدمی ہوں۔'' جاوید بولا۔ ''اور ابھی اتنا بڑا سراغرساں بھی نہیں ہوا کہ کھانے پینے کا خیال نہ رہے۔''

ڈاگا نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی شاٹ دوربین سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ تیسری منزل پر اس کے فلیٹ میں ہونے والی روشنی اس بات کی علامت تھی کہ سیما ابھی جاگ رہی ہے۔

جاوید کھانے کے دوران گہری سوچ میں ڈوبا

ہوا تھا۔ اس کے اب تک کے تجربات میں شاید یہ پہلا کیس تھا جس میں اتنے حادثات ہونے کے باوجود وہ ابھی وہیں تھے جہاں سے چلے تھے۔ ایلسی بار والے ہنگامے کے بعد سے پرکاش دوبے اور سانتا کے قتل تک تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آتے رہے۔ سیکریٹ ہاؤس سے پراسرار لڑکی کے فرار کا واقعہ ایک معمہ ثابت ہوا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مجرموں کے بارے میں جانتے ہوئے وہ ابھی تک کچھ نہ کر سکے تھے۔

دفعتاً ڈاگا نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور دوربین اس کی طرف بڑھادی۔ جاوید نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی۔ اور ڈاگا کے فلیٹ کی گیلری میں دیکھنے لگا۔

وہ تعداد میں تین تھے گیلری میں جلتے بلب کی دھیمی روشنی میں ان تینوں کے ہولے صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے جھک کر اپنی آنکھ قفل کے سوراخ سے لگادی۔ چند لمحے بعد وہ سیدھا کھڑے ہو کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہنے لگا۔

جاوید نے ان تینوں کے ہاتھوں کی حرکت اور بار بار سر ہلانے سے اندازہ لگایا کہ وہ کسی مسئلہ پر ایک دوسرے پر الجھے ہوئے تھے۔ پھر جاوید نے ان تینوں کو نیچے آنے والے زینوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ دو منٹ بعد ہی وہ فلیٹ والی عورت سے کچھ دور کھڑی ایک لمبی سیاہ گاڑی میں جا بیٹھے۔ جاوید پھرتی سے کھڑا ہو کر ڈاگا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہیں رہنا میں ان لوگوں کے پیچھے جا رہا ہوں۔“

”لیکن وہ لوگ کار میں ہیں۔“

”فکر مت کرو۔“ جاوید مسکرایا۔ ”میری موٹر سائیکل سامنے والے ملک بوتھ کے پیچھے کھڑی ہے۔“ پھر ڈاگا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے ملک بوتھ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

سیاہ کار کا انجن بیدار ہوتے ہوئے وہ اپنی موٹر سائیکل تک پہنچ چکا تھا۔ پھر جب ان تینوں کی گاڑی لگ بھگ دو ڈھائی سو گز آگے نکل گئی تو وہ بھی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا۔ مین روڈ پر آ کر اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی لیکن ہیڈ لائٹ آف ہی رہنے دی۔

لگ بھگ دس منٹ بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیاہ گاڑی کا رخ آبادی سے نکل کر شہر سے باہر جانے والی سڑک کی طرف ہو گیا تھا۔ چوڑی اور کھلی سڑک پر آ کر اسے ایسا لگا کہ آگے جانے والی گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھ گئی ہو۔ اس نے بھی اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور ایک مناسب فاصلے سے تعاقب جاری رکھا۔

تیز اور یخ بستہ ہوا ہڈیوں کو سن کیے دے رہی تھی۔ جاوید کو ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ بھی ہینڈل پر جمے جمے برف ہو گئے ہوں۔ سردی کی شدت سے اب اس کے دانت بجنے لگے تھے۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ آگے جانے والی گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ کار سڑک کے بائیں جانب ایک گھنے پیڑ کے سائے میں رک گئی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار کم کرتے ہوئے سوچا۔ کہیں اسے اپنے تعاقب کا احساس تو نہیں ہو گیا!

یقیناً ایسا ہی تھا۔ موٹر سائیکل کو کچے میں اتارتے ہوئے اس کے ذہن نے فیصلہ کن جواب دیا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ویرانے میں ان لوگوں کے گاڑی روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟

اس نے موٹر سائیکل کو ایک خودرو جھاڑی کے پیچھے کھڑا کیا اور نشیب سے گردن ابھار کر سامنے دیکھا۔ سیاہ کار لگ بھگ دو سو گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ شاید ابھی تک باہر نہیں نکلے تھے اور اگر نکلے بھی ہوں تو کم از کم وہ انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چند لمحے تک نشیب ہی میں بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ

لیا۔ سڑک کے دونوں طرف ڈھلوان میدانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جس طرف وہ تھا اس طرف کے میدانی حصے میں جگہ جگہ خودرو گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ بھی پھیلے ہوئے تھے۔

جاوید کے ذہن میں سردست کوئی واضح منصوبہ نہ تھا اس لیے بلا مقصد ڈھلوان میں اتر کر جھکے جھکے ہی اس طرف بڑھنے لگا جدھر سیاہ کار کھڑی تھی۔ وہ ایک لمبا چکر لے کر اس گھنے درخت کے قریب جا نکلا۔ پھر زمین پر گھٹنوں کے بل سرکتے ہوئے وہ ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔ لیکن اوپر پہنچ کر اس نے جیسے ہی سر اٹھایا کہ اس کے دیوتا کوچ کر گئے پیڑ کے نیچے تو کیا دور دور تک سیاہ کار کا پتا نہ تھا۔

وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے سڑک پر آ گیا۔ اب اسے کامل یقین ہو گیا تھا کہ وہ تینوں اس بات سے باخبر ہو چکے تھے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ جاوید نے اندازہ لگایا کہ جس وقت وہ ڈھلان میں اتر کر ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد کار کی طرف بڑھ رہا ہوگا۔ اسی دوران وہ لوگ اپنی گاڑی کو اسٹارٹ کیے بغیر دھکیل کر آگے لے گئے ہوں گے۔ پھر ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے جا کر انہوں نے اطمینان سے گاڑی اسٹارٹ کی ہوگی اور نکل گئے ہوں گے۔

کبھی کبھی حتیاطی تدابیر بھی کس قدر تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔'' جاوید نے سوچا اگر وہ ڈھلان میں اترنے کی حماقت نہ کرتا تو شاید ان کی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ضرور سن لیتا۔

اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونسے اور سردی سے ٹھٹھراتا اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ پھر جھاڑیوں سے موٹر سائیکل نکال کر شہر کی طرف چل دیا اپنے اوپر اتنا غصہ شاید اسے کبھی نہ آیا ہوگا اور شائد یہ جھلاہٹ کا ہی ردعمل تھا کہ ایکسیلیٹر پر بار بار اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک اس کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کے روشن دائرے میں وہی سیاہ کار سڑک پر اس طرح ترچھی کھڑی تھی کہ راستہ رک گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ان تینوں کی ذہانت کا معترف ہو گیا۔ بات اب بالکل واضح ہو چکی تھی۔ وہ لوگ آگے جانے کے بجائے اسے گھیرنے کے لیے پیچھے پلٹ پڑے تھے۔

اس نے موٹر سائیکل کی رفتار کم کرتے ہوئے انجن بند کیا اور پوری قوت سے بریک لگائے۔ ابھی گاڑی پورے طور سے رکی بھی نہ تھی ان تینوں نے نشیب سے نکل کر اسے گھیر لیا۔ ان میں دو کے ہاتھ میں ریوالور اور تیسرے کے پاس رائفل تھی۔

''نیچے اترو۔'' ان تینوں میں سے ایک غرا کر بولا۔ لہجہ غیر ملکی ہی تھا۔ لیکن تینوں کے چہروں پر نقاب ہونے کی وجہ سے وہ ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکا۔

اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے وہ کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''دیکھو شریف لوگوں میری جیب میں ایک سو کہتر روپے اسی پیسے اور ہاتھ پر رولیکس ریڈیم ڈائل گھڑی کے سوا اور کچھ نہیں۔''

اسی لمحہ کار کا دروازہ کھلا، ستاروں کی مدہم روشنی میں جاوید نے ایک عورت کو باہر آتے دیکھا ابھی وہ اس عورت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''یہ وہ نہیں ہے۔'' کار سے اترنے والے طویل قامت نے کہا۔

دوسرے ہی لمحہ جاوید بری طرح چونکا۔ بولنے والا انگریزی ہی میں بولا تھا مگر اس کا لہجہ یوروپینوں جیسا ہرگز نہ تھا۔ اب اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ تھی کہ وہ کن لوگوں سے ٹکرا گیا ہے۔

''اگر یہ وہ نہیں تو اس کا کیا کریں؟'' ان تینوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''یہ بھی کم خطرناک نہیں، اسی کا ساتھی ہے۔'' طویل قامت تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''اس

کے ہاتھ پیر باندھ کر گاڑی میں ڈال دو۔"

"چلو اترو۔" ان میں رائفل والے نے آگے بڑھ کر اپنی رائفل کا کندا جاوید کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا۔ جاوید خاموشی سے نیچے اتر آیا اور موٹر سائیکل سڑک پر ہی ایک طرف گر گئی۔

ان میں سے دو نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑے ہی تھے کہ اس نے نیچے جھک کر ایک کے سینے میں ٹکر ماری، لیکن دوسرے ہی لمحہ رائفل کا کندہ اس کے سر کی پشت پر پڑا۔ وہ ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ رائفل والے نے دوسرا وار کیا اور جاوید کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

موہن پیلس رات کی سیاہ چادر میں لپٹی کھڑی تھی۔

تقریباً ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ پائیں باغ میں جھینگروں اور زمینی کیڑے مکوڑوں کی سسکاریوں میں جیسے گہرے سناٹے کو زبان مل گئی تھی۔

دفعتاً پائیں باغ میں اونچی اور گھنی مہندی کی باڑھ کے عقب سے ایک سایہ نکل کر رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بڑی احتیاط سے چوکنے انداز میں چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اسی لمحہ باڑھ کے دوسرے کنارے سے ایک اور سایہ نکلا اور پہلے والے سائے کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگا۔ پھر چند لمحوں میں ہی دونوں سائے دو تین منٹ کے وقفہ سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

☆☆☆

رتنا شام سے عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ آج کی رات کوئی غیر معمولی بات ہو کر رہے گی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اس وقت سے اب تک کمرے میں ہی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اچانک کسی نے اس کی خوابگاہ کے دروازے پر تین بار دھیرے سے دستک دی رتنا کا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں دروازے کی سمت دیکھا پھر اپنی پوری قوت یکجا کر کے اونچی آواز میں بولی۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

دروازے کا ایک پٹ کھلا اور کوئی اندر آ گیا۔ رتنا نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی رکھے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا کمرے میں روشنی ہوتے ہی اس کی نظر اندر آنے والے پر پڑی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

آنے والے نے بھورے رنگ کی چرمی جیکٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر اس طرح کھڑا تھا کہ اس کے چہرے کی ایک سائیڈ ہی روشنی میں تھی۔ میرے خیال میں تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔" آنے والا نرم لہجے میں بولا۔ "اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"ہاں میں تمہارا انتظار کر رہی تھی اور میں نے تمہیں پہچان بھی لیا۔"

"مجھے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔" رتنا نے کہا۔

"تمہارا خط ملنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تم راجن ہی ہو سکتے ہو۔"

"لیکن میرے چہرے کا دوسرا حصہ دیکھ کر تمہیں یقیناً حیرت ہوگی۔" راجن مسکرایا اور چند قدم آگے بڑھ کر رتنا کے قریب پہنچ گیا۔

راجن کے جلے ہوئے چہرے اور بائیں ہاتھ کے نیچے لٹکے گوشت کو دیکھ کر رتنا کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی مگر دوسرے ہی لمحہ راجن نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ڈرو مت۔" راجن تلخی سے مسکرایا۔ "یہ مذاق قسمت نے میرے ساتھ کیا ہے تمہارے ساتھ نہیں۔"

"میں سچ کہتی ہوں مجھے علم نہ تھا کہ تم زندہ ہو ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" راجن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم آج اس شہر کی مالدار ترین عورت ہو، تمہاری بیٹی تمہارے پاس ہے اور میں تمہارے راستے سے سامنتا کو بھی ہٹا چکا ہوں اب تمہیں کیا چاہیے؟"

رتنا جو اس دوران خود کو سنبھال چکی تھی بولی۔

"تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم نے یہ سوال کر کے میری مشکل حل کر دی۔ ویسے مجھے غلط نہ سمجھنا۔" راجن سنجیدگی سے بولا۔ "اگر تم چاہو تو میرے پاس ایک پلان ہے۔"

"بولو۔"

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں گزشتہ کئی برسوں سے غیر ملکیوں کے ایک خطرناک گروہ کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ پرکاش بھی انہی کا آدمی تھا مگر میں اس مجرمانہ زندگی سے اوب گیا ہوں۔ اس عمارت میں کہیں وہ تہہ خانہ ہے جہاں پرکاش نے کچھ اہم کاغذات چھپا رکھے ہیں۔ اگر تم وہ تہ خانہ تلاش کرنے میں میری مدد کرو تو میں وہ کاغذات حاصل کر کے ان خطرناک مجرموں سے اپنی جان چھڑا سکتا ہوں۔"

"لیکن مجھے قطعاً علم نہیں کہ یہاں کوئی تہ خانہ بھی ہے۔"

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تہ خانہ کا راستہ میں خود تلاش کر لوں گا۔" راجن نے کہا۔ پھر اپنے لہجے میں بے حد نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یقین کرو رتنا اگر میں وہ کاغذات ان مجرموں کے حوالے کر دوں تو وہ لوگ نہ صرف مجھے اپنے چنگل سے آزاد کر دیں گے بلکہ اچھی خاصی رقم بھی دیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد پھر کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آؤں گا۔"

رتنا کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ طنزیہ مسکراہٹ ابھری اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟"

راجن نے چونک کر [illegible] دیکھا۔ پھر چند [illegible] خاموش رہ کر بولا۔

"ممکن ہے میرے اندر کا خود غرض آدمی [illegible] دار ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو کروڑوں روپے [illegible] دولت سے محروم ہونے کے ساتھ تم جیل بھی جا [illegible] ہو۔"

"لیکن میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" رتنا گھبرا [illegible] بولی۔

"کیا یہ جرم نہیں کہ ایک شوہر کی موجودگی میں [illegible] نے دوسری شادی کی۔" راجن طنزاً مسکرایا۔ "[illegible] سامنتا کے قتل کا شک بھی تم پر کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر میں جیل گئی تو کیا تم بچ جاؤ گے؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں، لیکن اگر میں ڈوبا [illegible] تمہیں ساتھ لے کر ڈوبوں گا۔"

"میں جانتی تھی کہ تم جیسے کمینے شخص کا یہی جواب ہو سکتا تھا۔" رتنا نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی راجن کا دایاں ہاتھ گھوم گیا۔ کمرے میں رتنا کے گال پر پڑنے والے تھپڑ کی آواز گونجی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

اچانک دروازہ کھلا اور کرنل زاہد اندر آتے ہوئے بولا۔

"شاباش میرے شیر بہت اچھے جا رہے ہو۔"

راجن زاہد کی آواز سنتے ہی پھرتی سے پلٹا۔ ایک لمحہ کے لیے زاہد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل کا ایک چاقو چمک رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ چاقو والے ہاتھ کو لہراتا ہوا غرایا۔

زاہد تیکھے انداز میں مسکرایا۔ "میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ مسز رتنا کو بہکانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیا بکتے ہو، رتنا میری بیوی ہے۔"

"بے شک، لیکن نا تو تم نے سامنتا کا خون کیا ہے اور نہ تم رتنا کے ہمدرد ہو۔" زاہد بولا۔

''اوراب تم یہ بتاؤ گے کہ ٹریزی واکو ما کہاں ہے؟''

راجن نے کوئی جواب دینے کے بجائے زاہد پر چھلانگ لگادی۔ حملہ اتنا ہی اچانک تھا کہ رتنا کی چیخ نکل گئی۔ لیکن زاہد نے بڑے اطمینان سے جھک کر راجن کی چاقو والی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے پوری قوت سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا تھا۔ لیکن چند سیکنڈ میں ہی اسے ایسا لگا جیسے کلائی کی ہڈی چیخ جائے گی۔

زاہد نے اس کی کلائی کو موڑ کر بائیں ہاتھ سے ایک بھرپور گھونسا مارا اور راجن کچھ قدم ہٹ کر فرش پر گر پڑا۔ زاہد نے اس سے چھینا ہوا چاقو بند کر کے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''چلو اب ٹریزی کی موجودہ قیام گاہ کے بارے میں بکو، ورنہ میں ٹھوکریں مار مار کر تمہارے چہرے کی دوسری سائیڈ بگاڑ دوں گا۔''

راجن اسے خوں خوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا لیکن اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔ دفعتاً خواب گاہ کی عقبی کھڑکی سے فائر ہوا اور راجن دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں پسلیوں کو دبائے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

زاہد نے فائر کی آواز کے ساتھ ہی باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی اور لپک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ خواب گاہ کی عقبی گیلری بالکل سنسان پڑی تھی۔ زاہد کو حیرت تھی کہ قاتل اتنی جلد کہاں جا سکتا ہے۔

تقریباً سات، آٹھ منٹ تک وہ مختلف کمروں میں بھٹکتا رہا۔ پھر جب خواب گاہ میں واپس آیا تو رتنا کے پاس کھڑی ادھیڑ عمر کی کالی سی عورت کو دیکھ کر چونک گیا۔

فرش پر پڑی راجن کی لاش سے نکلنے والا خون بہہ بہہ کر قالین میں جذب ہو چکا تھا۔ رتنا نے زاہد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ایسا لگتا ہے قاتل چھلاوا تھا یا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔'' زاہد ادھیڑ عمر عورت کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔

''پوری گیلری بھی سنسان پڑی ہے۔ میں کئی کمرے بھی چیک کر چکا ہوں۔''

رتنا زاہد کو ادھیڑ عمر عورت کی طرف گھورتا دیکھ کر بولی۔

''یہ سرسوتی ہے۔ بے بی کی آیا۔''

زاہد ایک لمحہ کے لیے چونکا۔ پھر سرسوتی کے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سرسوتی کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ''کیا تم سرسوتی کی روح ہو؟''

''کیا مطلب۔؟'' سرسوتی چونک کر بولی۔

''میرا مطلب ہے، کہ روپ نگر کے ہری نگر محلے میں رہنے والی سرسوتی ایک ہفتہ پہلے اپنے کوارٹر میں مردہ پائی گئی تھی۔ پھر محلے والوں نے ہی اس کا کریا کرم کیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' سرسوتی حیرت سے بولی۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں ٹریزی واکو ما کہ تمہارا میک اپ واقعی شاندار ہے۔'' زاہد نے اپنی جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اسکیم سچ مچ بہت خوب صورت تھی۔ راجن کی مدد سے تم نے پہلے سرسوتی کو ختم کیا۔ پھر اس کا میک اپ کر کے میگھنا کو اس کے ہوسٹل سے لے آئیں اس بہانے تمہیں موہن پیلس میں داخلے کا ٹوکن مل گیا۔ دوسری طرف راجن اپنی قربانیوں کے بہانے رتنا دیوی کی ہمدردیاں حاصل کرنے آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر رتنا دیوی کو میں پہلے سے خبردار نہ کر دیتا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتیں۔'' وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ ''اس بار بھی تم سے ایک حماقت ہو گئی۔ سرسوتی کا میک اپ کر کے تم نے اپنی شکل تو بدل لی، مگر اپنے ہاتھوں کی ساخت نہ بدل سکیں۔ میں نے ایلسی بار میں ہی یہ بات نوٹ کی تھی کہ تمہارے دونوں ہاتھوں کی سب سے چھوٹی انگلیاں ضرورت سے زیادہ بڑی ہیں۔ ویسے مارتھا کے میک اپ میں تم نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر بھی

خاص توجہ دی تھی۔''

''اور یہی وجہ ہے کہ تم مجھے مارتھا کے میک اپ میں نہ پہچان سکے۔'' سرسوتی مسکرا کر بولی۔

اس دوران رتنا بہت غور سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ لیکن بہت سی ایسی باتیں تھیں جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

''تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ شک نہیں ہوا تھا کہ تم ٹریزی ہو سکتی ہو۔''

''لیکن ہماری تنظیم کا مخصوص کوڈ استعمال کر کے مجھے بہکانے والا ڈرامہ شاندار تھا۔'' ٹریزی ہنس کر بولی۔ ''اگر تمہارے ساتھ والی لڑکی چند حماقتیں نہ کر جاتی تو شاید میں تمہارے چکر میں آ گئی تھی۔''

''مگر تم وہاں سے فرار کیسے ہوئیں؟'' زاہد نے سوال کیا۔

ٹریزی کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ ''شاید تم نہیں جانتے کہ دنیا کے بہترین سائنس داں ہماری تنظیم کے لیے حیرت انگیز سائنسی حربے اور تباہ کن آلات تیار کرتے ہیں۔ اپنی بقا اور حفاظت کے لیے ہم نے خفیہ طور پر بیشتر ممالک کے انجینئر اور سائنس داں خرید رکھے ہیں۔''

ٹریزی نے اتنا کہہ کر اپنے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ سے ملتی جلتی کوئی چیز چمک رہی تھی۔

''یہ دیکھو۔ یہ ہم لوگوں کا ایک معمولی سا حربہ ہے جو تنظیم کے چند بڑوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیا جاتا۔''

''کافی خوب صورت ٹارچ ہے۔'' زاہد بولا۔

''ہاں، تم اسے لائٹ فائر کہہ سکتے ہو۔'' ٹریزی نے کہا۔ ''لو اب اس کا کمال بھی دیکھ لو۔'' اتنا کہہ کر اس نے قالین پر پڑی راجن کی لاش کا نشانہ لیا اور ایک بٹن دبا دیا۔ لائٹ فائر سے روشنی کی نیلی دھار نکل کر راجن کے مردہ جسم پر پڑی۔

دفعتاً پورا کمرہ تیز قسم کی نیلی روشنی میں نہا گیا۔ زاہد کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں روشنی کے تیر پیوست ہو گئے ہوں۔ دو تین منٹ بعد جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ جہاں راجن کی لاش پڑی تھی وہاں سفید رنگ کی راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا اور ٹریزی کمرے سے غائب تھی۔

☆☆☆

موہن پیلس سے نکل کر گھر پہنچتے پہنچتے زاہد کو ڈھائی بج گئے۔ اتنی بڑی چوٹ شاید اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ٹریزی کی چالاکیوں نے اسے ذہنی طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر وہ لباس تبدیل کرنے جا رہا تھا کہ اس کے سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ زاہد نے چونک کر فون کی طرف دیکھا اور لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے سیما کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں سیما بول رہی ہوں زاہد صاحب۔''

''بولو، کیا بات ہے؟''

''پچھلے ایک گھنٹہ میں چار پانچ رنگ کر چکی ہوں۔ آپ کہاں تھے؟''

''ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔'' زاہد نے سیما کے لہجے کی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے۔ تم کچھ گھبرائی ہوئی لگتی ہو؟''

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں خطرے میں ہوں۔'' سیما بھاری آواز میں بولی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔''

''تم ڈاگا کے فلیٹ میں ہو نا؟'' زاہد نے پوچھا۔

''ہاں، بیڈ روم میں ہوں۔'' سیما نے جواب دیا۔

''لیکن پورے کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے جام ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں بے حد کوشش کے بعد بھی انہیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ گھٹن اور گرمی کا یہ عالم ہے کہ پورا بدن جھلسا جا رہا ہے۔''

''گھبراؤ مت، میں آ رہا ہوں۔'' زاہد نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے الماری سے ایک عجیب ساخت کا ریوالور نکال کر اس کی نال پر سائلنسر فٹ کیا اور کچھ فاضل کارتوس جیب میں ڈال کر لگ بھگ دوڑتا ہوا بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد ہی اس کی گاڑی کسی تیز رو سیلاب کی طرح ڈاگا کے فلیٹ کی سمت جا رہی تھی۔ ڈاگا کے فلیٹ والی عمارت سے تقریباً ایک فرلانگ پہلے ہی اس نے اپنی جیپ روکی اور پیدل چل پڑا۔ اب وہ بے حد احتیاط سے عمارت کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اس علاقے میں زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگ آباد تھے۔ پوری کالونی پر سناٹے کی حکمرانی تھی۔ ڈاگا والی عمارت کے قریب ایک اور سہ منزلہ عمارت تھی۔ زاہد پھرتی سے اس عمارت کے کمپاؤنڈ کو پار کرتا ہوا براہ راست اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھا اور تیسری منزل کی چھت پر پہنچ کر وہ اس منڈیر کی طرف بڑھا اور تیسری منزل کی چھت پر پہنچ کر وہ اس منڈیر کی طرف لپکا جو ڈاگا والی عمارت کے چوتھے فلور والی گیلری سے ملی ہوئی تھی۔ منڈیر پر چڑھ کر وہ پنجوں کے بل کسی مینڈک کی طرح پھدکا اور گیلری کی سمت بڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ چوتھے فلور سے تیسرے فلور کے زینے پر اترنے میں اسے بیس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ نیچے آ کر اس نے تیسرے فلور کی لمبی بالکنی میں نظر دوڑائی۔ ڈاگا کا فلیٹ آخری سرے پر تھا اور کھڑکی کے قریب اسے دو سائے متحرک نظر آئے۔

زاہد کہنیوں کے بل زمین پر سرکنے لگا۔ چند فٹ آگے بڑھ کر اس نے دیکھا کہ وہ دونوں سائے درمیانے سائز کے ایک سلنڈر کو اٹھائے کھڑے تھے۔ سلنڈر سے منسلک ربڑ کی ایک پتلی سی نلکی دروازے کی نچلی خلاء سے اندر جا رہی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک سایہ سلنڈر میں ہینڈل کو بار بار نیچے اوپر کر رہا تھا۔

مزید چند فٹ آگے کی طرف کھسک کر زاہد گیلری میں پڑے ایک خالی ڈرم کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب وہ ان سے اتنا قریب تھا کہ ان کی تیز سرگوشیاں صاف طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

''کیا خیال ہے؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اب تک وہ بے ہوش ہو چکی ہو گی۔''

''ہاں۔'' دوسرا بولا۔ ''اب یہ سلسلہ بند کرنا چاہیے۔''

''لیکن اس کی مدد کے لیے خود کوئی نہیں آیا۔'' پہلے نے کہا۔

''تم نے اپنے کانوں سے سنا تھا کہ وہ کسی کو بلا رہی ہے۔'' دوسرے نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، میں نے خود سنا تھا کہ وہ ٹیلیفون پر کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا رہی ہے۔''

اچانک کمرے سے گھٹی گھٹی سی چیخیں ابھریں اور اور ایک سائے کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے زاہد سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لوگ کسی قسم کی گیس اندر پہنچا رہے ہیں تو یقیناً کمرے میں بے پناہ تپش اور گھٹن ہو گی۔ پھر اس نے سوچا اگر کھڑکیاں اور دروازے جام ہو گئے ہیں تو کیا سیما کھڑکیوں کے شیشے بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔ پھر اس کے ذہن نے خود ہی دوسرا جواز پیش کیا۔ ممکن ہے اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی ہو یا وہ کسی اعصابی کش مکش میں مبتلا ہو۔

آخر کچھ سوچ کر اس نے سائلنسر لگا ریوالور نکالا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر لگا تار کی فائرنگ جھونک دیئے شیشے ٹوٹنے کی چھنکار نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

''ایسا لگتا ہے وہ اب شیشے توڑ رہی ہے۔'' ان میں سے ایک نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

عین اسی لمحہ زاہد ڈرم کے پیچھے سے نکل کر ان پر جا پڑا۔ وہ دونوں بے خبری میں اس کے نیچے پس کر رہ گئے۔ زاہد نے پہلے ہلے میں ہی ایک کی گردن دبوچ لی تھی۔ اچانک دوسرا اٹرپ کر اس کے نیچے سے نکلا اور گیس سلنڈر کو اٹھا کر زینوں کی طرف بھاگا۔

زاہد نے پوری قوت سے اپنے حریف کی کنپٹی پر گھونسہ رسید کیا اور اس کا حشر دیکھے بغیر زینوں کی طرف چھلانگ لگادی۔

☆☆☆

بند کمرے میں سیما ایک صوفے پر اس طرح پڑی تھی جیسے اس کے ہاتھ پیر مفلوج ہوکر رہ گئے ہوں۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ اس نے کئی جگہ سے کمرے کی دیوار کا پلاسٹر بھی ادھڑتے دیکھا تھا۔ شیشے ٹوٹنے کے چند لمحوں بعد ہی اس نے محسوس کیا کہ اندر کی گھٹن اور تپش کافی کم ہوگئی تھی۔ لیکن اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ خود اٹھ کا کھڑکی کے قریب جاسکتی۔

نہ جانے کیوں شیشے ٹوٹتے ہی اسے یقین ہوگیا تھا۔ کہ زاہد کہیں قریب ہی ہوگا۔ کمرے کی گھٹن دھیرے دھیرے کم ہورہی تھی۔ مگر وہ اس قابل بھی نہ تھی کہ اپنے آپ کو ہلاسکتی۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت سیاہ فام اندر داخل ہوا۔ سیما نے اس کے موٹے بھدے ہونٹ اور الجھی ہوئی گنجان جھاڑیوں جیسے بال دیکھتے ہی اندازہ لگالیا کہ وہ کوئی افریقی ہے۔

سیما پر نظر پڑتے ہی سیاہ فام مسکرایا اس کے موٹے اور بھدے ہونٹوں سے اس کے دانت جھانکنے لگے۔ سیما کو ایسا لگا جیسے کوئی سیاہ روبھیڑیا اپنے شکار کو دیکھ کر دانت نکال رہا ہو۔

''ایسا لگتا ہے ابھی تک یہاں کرنل نہیں پہنچا؟'' سیاہ فام نے انگریزی میں کہا۔

سیما نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیاہ رونے قریب ہی رکھی تپائی پر سے پانی کی صراحی اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور سیما کے قریب آ کر بولا۔ ''لو پیو۔''

سیما نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیاہ رونے قریب ہی رکھی تپائی پر سے پانی کی صراحی اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور سیما کے قریب آ کر بولا۔ ''لو پیو۔''

سیما نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ اٹھا کر گلاس تھاما اور ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ سیاہ فام نے اس سے گلاس لے کر ایک طرف رکھا اور اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کرنل زاہد کو فون کیا تھا نا؟''

''کرنل زاہد؟'' سیما انجان بنتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

''خوب۔'' سیاہ فام مسکرایا۔ ''دیکھو لڑکی میرا نام ولیم کرسٹوفر ہے۔''

سیما کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے کرسٹوفر کو گھورا اور بولی۔ ''تم کرنل زاہد کو کیسے جانتے ہو؟''

''یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں۔''

''پھر میں کسی کرنل زاہد کو نہیں جانتی۔'' سیما نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کیا تم کرنل کی منگیتر نہیں ہو؟''

''شٹ اپ۔'' سیما اپنی تمام تر قوت جمع کر کی چیخی۔

ولیم کرسٹوفر نے دیواروں کے ادھڑے پلاسٹر اور کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کھڑکی کے شیشوں پر فائر کرنے والا کون تھا۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''دیکھو لڑکی، اگر تم نے اب میری بات کا صحیح صحیح جواب نہیں دیا۔ تو میں تمہارے یہ دونوں خوب صورت کان اکھاڑ لوں گا۔''

سیما کرسٹوفر کے سفاک لہجے سے کچھ نروس سی ہوگئی۔ لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ کھڑکی کے ٹوٹے

سیما نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیاہ رونے قریب ہی رکھی تپائی پر سے پانی کی صراحی اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور سیما کے قریب آ کر بولا۔ ''لو پیو۔''

ہوئے شیشوں سے آنے والی تازہ ہوا اب اس کے جسم کو خاصی توانائی بخش رہی تھی۔ اس نے اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہ کیا ڈرامہ تھا؟''

''اوہ یہ.....'' کرسٹوفر مسکرایا۔

''ایک خاص قسم کی گیس کے ذریعے کمرے میں موجود آکسیجن کو ہائیڈروجن میں تبدیل کردیا گیا تھا۔''

''کس خوشی میں؟''

''اس لیے کہ تم گھبرا کر کرنل زاہد کو فون کرو اور وہ تمہاری مدد کے لیے یہاں دوڑ آئے۔''

''لیکن میں نے اسے فون نہیں کیا؟''

''میرا خیال ہے تم اس طرح نہیں بتاؤ گی۔'' کرسٹوفر اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ اچانک اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر سیما کا سر تھام لیا۔ وہ بری طرح اس کی گرفت میں مچلی، کرسٹوفر پوری قوت سے اس کی کنپٹیوں پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

سیما کا سر بہت زور سے چکرایا اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے گنجان دائرے رقص کرنے لگے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ تاریکی کے گہرے سمندر میں ڈوبتی جارہی ہو۔ کرسٹوفر نے بے ہوش سیما کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک دروازے میں کھڑے کرنل زاہد پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' کرسٹوفر کے لہجے میں گھبراہٹ کے بجائے گہرا سکون تھا۔

زاہد نے اسے اپنے ریوالور کی زد پر لیتے ہوئے کہا۔ ''تو تم ہو ولیم کرسٹوفر۔''

''بیشک۔'' کرسٹوفر نے سیما کو اپنے بائیں شانے پر اس طرح ڈال لیا جیسے اس میں کوئی وزن ہی نہ ہو۔ پھر اس کے ہونٹوں سے تیز سیٹی جیسی آواز نکلی۔

عین اسی لمحہ زاہد کے ریوالور کی نال سے ایک شعلہ نکلا۔ مگر کرسٹوفر اپنے کاندھے پر اتنا وزن ہونے کے باوجود کسی بندر کی طرح اچھل کر ایک طرف ہوگیا۔ ریوالور کی گولی کھڑکی کا بچا ہوا شیشہ توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ زاہد دوسرا فائر کرنے ہی والا تھا کہ یکایک کمرہ تاریک ہوگیا۔

اسی لمحہ زاہد نے اپنے عقب میں کئی قدموں کی چاپ سنی تھی۔ وہ پلٹا ہی تھا کہ اس کے بائیں پہلو پر ایک ٹھوکر پڑی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ لڑکھڑاتا ہوا تاریک کمرے میں کئی قدم آگے تک چلا گیا۔ پشت پر پڑنے والی لات کے مقابلے میں پسلیوں پر پڑنے والی ضرب بے حد کاری تھی۔

''اچانک کمرے سے باہر کرسٹوفر کی آواز گونجی۔'' ''لڑکی کو سنبھالو میں اسے دیکھتا ہوں۔''

زاہد نے گیلری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی وہ اپنی تمام تر قوت یکجا کر کے اٹھا۔ اس چھین جھپٹ میں اس کا ریوالور نہ جانے کہاں گرا تھا۔ وہ تیزی سے ٹوٹے ہوئے شیشوں والی عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کھول کر دوسری طرف اتر گیا۔ پھر دوسری عمارت کی چھت پر اتر کر وہ نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کی بائیں پسلیوں میں درد کی تیز لہر ابھری اور وہ چکرا گیا۔

ممکن ہے اس بار وہ پختہ چھت پر گر ہی پڑتا کہ زینوں کے خلاء سے ایک سایہ نکل کر اس کی طرف لپکا اور زاہد کو سنبھال لیا۔

زاہد نے سہارا دینے والے کو نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور ڈاگا کو پہچان کر اپنا چکراتا ہوا سر اس کے شانے پر ڈال کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

جب پہلی بار جاوید کو ہوش آیا تو اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ تینوں بلڈاگ قسم کے سفید فاموں کے درمیان کسی کار کی پچھلی نشست پر بھنچا ہوا بیٹھا تھا۔

ہوش میں آتے ہی ایک بار پھر اسے شدید سردی کا احساس ہوا اور اس کی زبان اپنے حملہ آوروں کی شان میں قصیدے پڑھنے لگی، جواب میں

ان تینوں نے اس پر تھپڑ اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ لیکن جب ان تینوں نے اندازہ لگایا وہ اپنی قصیدہ خوانی بند نہ کرے گا تو انہوں نے اس کے منہ میں حلق تک کپڑا ٹھونس دیا۔ کچھ دیر تک وہ اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ اسے گھٹن کا احساس نہ ہو، مگر اس کا ذہن جلد ہی جواب دے گیا۔

دوسری بار اس کی آنکھ کھلی تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ شدید سردی سے محفوظ تھا۔ اس نے گہری تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی تھی۔ جاوید کو ایسا لگا کہ کہیں وہ سچ مچ اندھا تو نہیں ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس کا سر گھوم رہا ہے، لیکن اپنے کانوں سے ٹکراتی عجیب قسم کی گھنگھناہٹ کو محسوس کرتے ہی اس نے سوچا کہ یہ آواز اس کے دماغ کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب ذہن پورے طور پر بیدار ہو گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اوپر اٹھنے کا احساس وقتی نہیں تھا۔ بلکہ یہ گھنگھناہٹ کسی انجن کے چلنے کی تھی۔ اور وہ چوبی فرش پر پڑا اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا

-

کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی جب تاریکی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی تو اسے اپنی ریڈیم والی گھڑی یاد آئی اس نے فوراً بائیں ہاتھ کو جنبش دے کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کے اندھیرے میں چمکنے والے ہندسوں کو دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کی بصارت باقی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر ایک بار پھر چکرایا۔

"کیا وہ کسی طیارے پر ہے؟" اس نے سوچا۔ مگر وہ کیسا طیارہ تھا اسے عجیب سی الجھن ہونے لگی۔ وہ کئی بار ہوائی سفر کر چکا تھا۔ اپنے گزشتہ تجربات کی بناء پر اس کا ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس وقت وہ کسی ہوائی جہاز پر ہے۔ اسے معلوم تھا کہ ہوائی جہاز کی آواز کم از کم ایسی نہیں ہوتی، ایسی دھیمی گھنگھناہٹ کہ بے داری کے پہلے مرحلے میں اسے اپنے دماغ کی سنسناہٹ سمجھ بیٹھا تھا۔

اس نے گھڑی کے ڈائل پر نظریں جما… ہوئے وقت کا اندازہ لگایا ڈائل میں چمکنے والی تار… اور دن کے حساب سے اسے اس بے ہوشی اور نیم… داری کی کیفیت میں چوبیس گھنٹے سے زائد ہو چ… تھے۔ اچانک اس کا ذہن کرنل زاہد کی طرف گھوم گیا… اس کے ذہن پر عجیب سی جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ اپ… اس قید کا ذمہ دار وہ زاہد کو سمجھ رہا تھا۔ اگر اس نے سی… کی نگرانی پر لگانے سے قبل اسے پورے حالات سے آگاہ کر دیا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ پھر اس نے… اس خیال کی تردید بھی کر دی۔ زاہد نے تو بس اسے سیما کی نگرانی کے لیے کہا تھا۔ پھر بھلا سیاہ کار کا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے اپنے چاروں طرف پھیلی تاریکی سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی تاریک قبر میں دفن ہو اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ بہت تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہو۔ کانوں میں گونجنے والی وہی گھنگھناہٹ اب سیٹی جیسی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اسی دوران ایک جھٹکا سا لگا اور گھنگھناہٹ کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ایک عجیب قسم کا سناٹا تھا۔ جو اس کے دماغ پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔

عین اسی لمحہ تاریکی میں ہلکی سی روشنی کا بڑا سا بیضوی دھبہ دکھائی دیا۔ اور ساتھ ہی یخ بستہ ہوا کا تیز جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا۔

بڑے سے بیضوی دائرے کے ساتھ چند سائے اندھیرے میں رینگ آئے۔ جاوید نے اپنے جسم پر کئی ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور ایک منٹ کے اندر اسے اس تاریک قبر سے باہر کھینچ لیا گیا۔

آسمان کی چھاتی پر ٹنکے ستارے کسی سست رو مسافر کی طرح اپنی منزل کی جانب رواں تھے اور چاروں طرف پھیلے سناٹے کی آغوش میں رات کی شہزادی اپنے سفر کا آخر حصہ طے کر رہی تھی۔

جاوید نے زمین پر پیر ٹکتے ہی پلٹ کر دیکھا۔

ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس سے چند منٹ کی دوری پر بہت بڑے انڈے کی شکل کا ایک دمدار راکٹ زمین پر کھڑا تھا۔ اسے اب یقین ہوگیا کہ وہ اس عجیب وضع قطع کے دیو پیکر راکٹ میں یہاں تک لایا گیا جو اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ پریشانی کے عالم میں جاوید نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ یہ ایک غیر آباد مقام تھا۔ اور حد نظر تک کسی آبادی کے نشان نہ تھے۔ بائیں طرف اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ادھر کافی گھنا جنگل ہوگا۔ داہنی طرف دور تک اونچی نیچی چٹانوں کا لامحدود سلسلہ تھا۔

نہ جانے کیوں اسے اپنی بے بسی پر ہنسی آنے لگی۔ یہ شاید مایوسی کا شدید ردعمل تھا کہ اس کی ذہنی رو غیر سنجیدگی کی طرف مڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

''اے رفیق، میں کہاں ہوں؟''

''جہنم میں۔'' طنزیہ ہنسی کے ساتھ جواب ملا۔

''خوب۔'' جاوید ہنسا، پھر بولا۔ ''کیا آپ لوگ اس جہنم کے ٹھیکے دار ہیں۔''

''چلو، آگے بڑھو۔'' انہوں نے جاوید کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

جاوید چل تو پڑا، لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چلنے کے بجائے گھسیٹ رہا ہو۔ اس کا ذہن بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔ اس وقت نہ کوئی خیال تھا نہ ڈر، کوئی ایسا جذبہ بھی نہ تھا کہ اسے غصے یا جھلاہٹ کا نام دیا جا سکتا۔ اس کے پاؤں بالکل مشینی انداز میں اٹھ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جاوید نے خود کو ایک ایسی پتھریلی عمارت کے سامنے پایا جو بیک وقت کوئی پرانا مندر بھی لگتی تھی اور گرجا بھی۔ وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے اندر لے گئے۔ عمارت کافی وسیع تھی اور اس کے کئی کمروں میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن تھیں۔

جاوید کو ایک کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔ کمرے میں وہ جس چیز پر گرا وہ شاید ایک چرمی گدا تھا جس میں پیال یا ایسی کوئی چیز بھری ہوئی تھی۔

کمرہ نہایت تنگ اور تاریک تھا اور روشنی کا اس میں کہیں گزر نہیں تھا۔

چرمی گدے پر گرتے ہی ایک بار پھر نقاہت نے اس کے ذہن پر حملہ کیا اور وہ اپنے گھٹنوں پر لگنے والی چوٹ سے لاپروا ہو کر چت لیٹ گیا۔

قبر نما کمرے کا اندھیرا آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔

دوسری صبح اسے ایک شخص نے بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ جاوید نے کراہ کر کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی چھت کے قریب والے روشندان سے چمکدار سنہری دھوپ آ رہی تھی۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اس سے پہلے کہ آنے والا شخص دوبارہ اس کا گریبان تھام کر جھنجھوڑے وہ کھڑا ہوگیا۔

کمرے میں آنے والے اجنبی کے ہونٹوں پر ایک بھدی سی مسکراہٹ ابھری۔ پھر اس نے جاوید کی چرمی جیکٹ کا کالر تھاما اور کھینچ کر باہر لے آیا۔

چند لمحوں میں ہی وہ ایک ایسے کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کی دیواریں سیاہ پتھر کی تھیں اور کمرے کے وسط میں بچھی ایک بڑی میز کے گرد کئی کرسیاں پڑی تھیں جاوید نے اندازہ لگایا کہ کمرے کی چھت کافی بلند تھی اور چھت سے منسلک پتھریلے ستونوں پر مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بے حد نفاست اور مشاقی سے تراشی گئی تھیں۔

کمرے کے وسط میں پڑی کرسیوں پر چار آدمی بیٹھے کسی ایسی زبان میں گفتگو کر رہے تھے جو کم از کم جاوید کے لیے ناقابل فہم تھی۔ اپنے خدوخال اور رنگت کے اعتبار سے وہ چاروں ہی غیر ملکی تھے۔ لیکن ان کی سفید رنگت کے باوجود اور ان کے سیاہ بالوں اور خمیدہ آنکھوں کے سبب وہ ان کی قومیت کا اندازہ

نہیں کرسکا۔ ان کے چہروں کی یکسانیت کے باوجود آنکھوں میں درندگی جھلک رہی تھی۔

جاوید پر نظر پڑتے ہی وہ خاموش ہوگئے۔ اس نے اپنا گریبان پکڑ کر لانے والے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک نظر آرہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک نے جاوید کو لانے والے سے اسی ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا۔

جس کا جواب اس نے بھی اسی زبان میں دیا۔

چند سیکنڈ کے بعد کرسی پر بیٹھے شخص نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

''کچھ کھاؤ گے؟''

جاوید جو اپنی حرکات وسکنات سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ قطعاً خوف زدہ نہیں ہے بولا۔ ''کیوں نہیں، میرے ملک میں تو مرنے کے بعد بھی مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے لوگ قورمہ پلاؤ کھاتے ہیں۔''

اسی شخص نے جاوید کے قریب کھڑے شخص سے پھر کچھ کہا اور وہ شخص جاوید کا ہاتھ تھام کر دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں بھی کمرے کے وسط میں ایک میز کے گرد کچھ کرسیاں پڑی تھیں اس شخص نے جاوید کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

برابر والے کمرے سے اٹھتی اشتہا انگیز قسم کی خوشبو جاوید کے نتھنوں سے ٹکرائی اور نقاہت کے ساتھ شدید بھوک کا احساس بیدار ہونے لگا۔ اس نے وقت گزارنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھا اور کمرے کی پشت پر کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں چند لمحوں کے لیے بیرونی منظر میں ڈوب گئیں۔ باہر دور تک پھیلی بھوری اور سیاہی مائل چٹانیں چمکیلی دھوپ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ چٹانوں کے نشیبی حصوں میں کہیں کہیں خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ نیلے اور شفاف آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کافی بڑے بڑے گدھ اڑ رہے تھے اور کبھی کبھی ان کی تیز سیٹیوں جیسی آواز فضاء میں گونج اٹھتی۔

چند منٹ بعد وہی شخص اپنے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ٹرے کو میز پر رکھا اور جاوید سے کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ میز کے قریب آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے جاوید نے ٹرے کا جائزہ لیا۔ بڑی چائے دانی اور کپ کے علاوہ ایک پلیٹ میں کسی پرندے کا بھنا گوشت اور چند سلائس بھی تھے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقفہ میں اس نے پلیٹ صاف کردی۔ اب وہ چائے دانی سے پیالے میں چائے انڈیل رہا تھا۔ چائے کے تین چار گھونٹ حلق سے اترتے ہی جیسے اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو پورے طور پر توانا محسوس کررہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دماغ میں روشنی سی ہوگئی ہو۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اسے پکڑ لانے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ جہاں اسے دھر لیا گیا تھا وہاں چوتھے طویل قامت اور سیاہ فام شخص کی موجودگی سے یہ بات تو صاف ہوگئی تھی کہ وہ اسی ولیم کرسٹوفر کی قید میں تھا۔ جس نے کرنل زاہد کا بیڈ روم تباہ کردیا تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ لایا گیا ہے کہ جہاں سے فرار ہونے کا تصور بھی حماقت کے مترادف تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اپنے ہی ملک کے کسی حصے میں ہے یا دوسرے ملک کے۔

اچانک اس کا ذہن اس عجیب ساخت کی راکٹ کی طرف گھوم گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے انڈے جیسی شکل والے راکٹ سے ہی یہاں لایا گیا ہے تو ان لوگوں نے شہر کے کس حصے سے اپنی پرواز شروع کی ہوگی۔ پھر اس نے سوچا کہ ممکن ہے کرنل زاہد کو یہ خبر ہی نہ ہو کہ وہ ولیم کرسٹوفر کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔

اچانک اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

جاوید چونک کر پلٹا۔ دروازے میں وہی شخص کھڑا تھا جو اس کے لیے ناشتہ لے کر آیا تھا۔ اس نے جاوید کو اشارے سے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اور مڑنے لگا۔ جاوید تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔

''تمہاری مہمان نوازی اور اتنے اچھے ناشتے کے لیے شکریہ۔''

اس شخص نے پلٹ کر جاوید کو ایک نظر دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ جاوید اس شخص کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بار پھر اسی کمرے میں داخل ہوا جہاں کچھ دیر پہلے لایا گیا تھا۔ وہ چاروں اب بھی وہیں بیٹھے تھے۔

ان چاروں میں سے ایک نے جاوید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''میں ایک سرکاری جاسوس ہوں۔'' جاوید نے کہا دراصل یہ جاننے کے بعد کہ وہ ولیم کرسٹوفر کا قیدی ہے۔ اس نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کرنل زاہد کی زبانی کرسٹوفر کے وسائل اور اس کی خطرناک شخصیت سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ میں غیب داں نہیں ہوں۔'' جاوید نے لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''شاید تمہیں علم نہیں کہ جلد یا بدیر تم ذبح کر دیئے جاؤ گے۔''

''بے شک تم لوگ ایسا کر سکتے ہو اور اگر یہ سچ بھی ہے تو ایک نہتہ شخص کر بھی کیا سکتا ہے۔'' جاوید بولا۔

''شائد تم نہیں جانتے کہ تم کس کی قید میں ہو؟''

''قید۔'' جاوید استعجابیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر سچ مچ یہ قید ہے تو کافی شاندار قید ہے۔ ویسے تمہارا ناشتا بے حد لذیذ تھا خصوصاً پہاڑی پرندوں کا بھنا ہوا گوشت مجھے پسند آیا۔''

ان چاروں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ ادھر جاوید دوبارہ بولا۔ ''ٹریزی راجن اور پرکاش کو تو ہم پہچان ہی چکے تھے۔ رہ گئی ایلسی تو خود اسے ٹریزی نے ٹھکانے لگا دیا ممکن ہے پرکاش اور راجیشور دیال کے علاوہ سانتا کو بھی ٹریزی ہی نے ٹھکانے لگا دیا ہو، لیکن تم لوگ ابھی تک معمہ بنے ہوئے ہو۔''

''ٹریزی کو تم لوگوں نے کس طرح شناخت کیا۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''دراصل میرا چیف بڑا روشن ضمیر آدمی ہے۔ وہ ہر جمعرات کو پیر چھتہ کے مزار پر حاضری دیتا ہے اور مراقبے کے عالم میں غیب کی باتیں بتاتا ہے۔'' جاوید نے مسکرا کر کہا۔

ان میں سے شاید کسی کی سمجھ میں جاوید کی بات نہیں آئی تھی۔ ان چاروں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر وہی شخص بولا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہارا چیف کہیں روپوش ہو گیا ہے۔''

''ظاہر ہے میرے اس طرح غائب ہو جانے کی وجہ سے وہ محتاط ہو گیا ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں، ہم جلد ہی تمہاری تنہائی دور کر دیں گے۔''

''خیر تم مجھے قتل کر سکتے ہو، لیکن زبردستی میری شادی نہیں کر سکتے۔'' جاوید نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''شادی؟'' وہ اسے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ''شادی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''لو اب شادی کا مطلب بھی پوچھو گے۔'' جاوید اس طرح شرمایا کہ وہ سب ہنسنے لگے۔ پھر اس شخص نے کہا۔

''تم تنہائی دور کرنے والی بات سے غلط مطلب اخذ کر بیٹھے۔ میرا مطلب تھا کہ جلد ہی تمہارا چیف اور اس کی منگیتر یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' جاوید

نے حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''وہ اکیلا ہزاروں پر بھاری ہے۔''

''اچھا۔'' اس شخص کا لہجہ بھی تحقیر آمیز تھا۔ ''بے فکر رہو ہمارے سامنے اس کی حیثیت شیر کی کچھار میں پھنسی بکری سے زیادہ نہیں۔''

''اور پھر تم ہم سب کو ذبح کر دو گے۔'' جاوید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس کا فیصلہ ہمارا چیف کرے گا۔''

''اوہ تو تم لوگوں کا چیف بھی ہے۔'' جاوید سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن کر بولا۔

''ہاں۔'' وہی شخص بولا۔ ''ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ راجیشور دیال نے جو فائل پرکاش کو دی تھی وہ فائل کہاں گئی؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''کسی ایسی اسپنج ڈویل کے بارے میں جانتے ہو جس کے پیٹ میں کافی قیمتی ہیرے تھے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' جاوید نے جھنجلاتے کر جواب دیا۔

''تمہارا چیف تو ضرور جانتا ہوگا۔''

''ممکن ہے جانتا ہو، مگر ہاں کیا تم ٹریزی کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے؟''

''کیوں؟ یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ ٹریزی سے میری مڈبھیڑ دوبارہ ہو چکی ہے۔ ایک بار میں رتنا دیوی سے بھی مل چکا ہوں اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ راجن اور سانتا ٹریزی کے ہی گرگے تھے اب اگر تم ٹریزی کے آدمی ہو تو تمہیں ان تمام باتوں کا علم ہونا چاہیے جو تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

گفتگو کرنے والا شخص چند لمحہ خاموش ہو کر بولا۔ ''تمہارا چیف تمہارے غائب ہونے والی رات سے ہی لاپتا ہے۔ وہ دو روز سے اپنی قیام گاہ پر بھی نہیں گیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ شہر میں اس کی کوئی دوسری پناہ گاہ بھی ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔'' جاوید نے فوراً کہا۔ ''اور میں ہی کیا اب تو خود اس کے فرشتے بھی اس موجودہ قیام گاہ کے بارے میں کچھ نہ بتا سکیں گے۔''

''دیکھو تم پوری بات نہیں سمجھ رہے۔ گفتگو کرنے والے کا لہجہ بے حد نرم ہو گیا۔ ''دراصل ہم درندے نہیں کہ لوگوں کو خواہ مخواہ قتل کرتے پھریں۔ یوں بھی اگر تم لوگوں کو قتل کرنا ہوتا تو یہ اسی روز ہو سکتا تھا جب تمہارے چیف کی خواب میں ٹائم بم پھٹا۔''

''اچھا تو وہ دھماکہ بھی تم لوگوں نے ہی کیا تھا۔'' جاوید ایک بار پھر انجان بن گیا۔

''ہاں ہم چاہتے تو تمہارے چیف کو اور تمہیں کسی وقت بھی ختم کر سکتے تھے۔ لیکن ہم تمہارے چیف سے ایک اہم معاملہ طے کرنا چاہتے ہیں جب تک وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگتا کوئی تصفیہ نہیں ہوگا۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' جاوید نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''تم ہمیں اپنے چیف کا پتا بتا دو۔'' اس شخص نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ معاملہ ختم ہونے کے بعد تم فوراً رہا کر دیے جاؤ گے۔''

''جو کچھ میرے علم میں تھا بتا چکا۔'' جاوید نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''تمہاری مرضی۔'' گفتگو کرنے والا شخص اب شانے اچکاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تینوں ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔

جاوید کا خیال تھا کہ شاید وہ لوگ اب اس پر کسی قسم کی زیادتی کریں گے۔ لیکن وہ چاروں خاموشی سے باہر نکل گئے اور جاوید کے پیچھے کھڑے شخص نے ان لوگوں کے باہر جاتے ہی اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

رات نہ صرف سرد بلکہ تاریک بھی تھی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے مطلع بالکل صاف تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے شمال کی جانب سے تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے

نیا حساب

کرشن چندر

کرشن چندر نے اپنی کہانیوں میں ہمیشہ طبقاتی سوال کو اٹھایا ہے۔ لہٰذا ان کے کردار مل مزدور، کسان، نمک کی کان میں کام کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ جاگیردار اور سرمایہ دار رہے ہیں۔ یہی ان کی خاصیت ہے جو کہ انہیں باقی افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

ایک رومان پرور اور ناتجربہ کار نوجوان کی آپ بیتی اس کے انکار کے باوجود اس کے باپ نے اسے حساب کتاب سیکھنے پر لگادیا تھا۔

یہ نظر کہانی میں کرشن چندر نے معاشرت میں پنپتے سوالات چھوڑ کر سوچنے پر مجبور کردیا ہے

شروع میں میرا مزاج رومانی تھا اور طبیعت حساس تھی۔ مجھے پھدکتی ہوئی چڑیاں پسند تھیں اور نیلا آسمان اور دھنک کے کھلتے ہوئے رنگ اور وہ عورتیں، ہنستے ہوئے جن کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں اور ندی جو پتھروں سے ٹھوکر کھا کر چلتی ہے مگر میرے والد نے میری ایک نہ چلنے دی۔ (ان کا نام گوبند رام ہے) انہوں نے کہا۔ ''بیٹا سری رام، یہ دنیا رنگ کے پہیوں پر نہیں چلتی ہے بلکہ حساب کے پہیوں پر چلتی ہے۔ اس لیے تمہیں شاعر نہیں انجینئر بننا ہوگا۔''

ہمیشہ سے مجھے حساب سے نفرت رہی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا یا اللہ، یہ دو اور دو چار کیوں ہوتے ہیں، پانچ کیوں نہیں ہوتے؟ ڈھائی کیوں نہیں ہوتے؟ ایک اور ایک ملا کر دو کیوں ہوتے ہیں؟ ایک کیوں نہیں ہوجاتے۔ جیسے کبھی کبھی زندگی میں ہوجاتے ہیں مگر حساب میں نہیں ہوتے، کبھی نہیں ہوتے۔ آپ لاکھ کوشش کر کے دیکھ لیجیے مگر مجھے چوں کہ انجینئر بننا تھا اس لیے میں نے حساب سیکھنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردیں اور ڈپلوما حاصل کرتے وقت فرسٹ کلاس فرسٹ بھی حاصل کیا۔ اس خبر سے سب سے زیادہ خوش شاردا کو ہوئی، جس کے ساتھ بچپن میں میری منگنی ہوچکی تھی اور جسے میں بھی بہت پسند کرتا تھا۔ ہم لوگ ساتھ ساتھ کھیلتے تھے ساتھ پڑھتے تھے۔ ساتھ ساتھ سوچتے ہم نے تقریباً طے کرلیا تھا کہ وہ گھر کیسا ہوگا جس میں ہم رہیں گے، بچوں کی تعداد کتنی ہوگی اور وہ ناشتے میں مجھے کیا کھلایا کرے گی؟ ہم نے سب حساب کرلیا تھا۔

مگر جب انجینئرنگ کالج سے مجھے فرسٹ کلاس فرسٹ کا ڈپلوما ملا تو ایک دن میرے والد کو لالہ بیوہاری لال ملے جن کی فرم میں میرے والد اکاؤنٹنٹ تھے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس پر غور کر کے میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اب میری شادی شاردا سے نہیں بلکہ مدھومتی سے ہوگی جو لالہ بیوہاری لال کی اکلوتی لڑکی تھی اور بڑی حسین تھی اور اس وقت نینی تال میں تھی۔ مجھے اب مدھومتی کا دل جیتنے کے لیے نینی تال جانا ہوگا۔ اگر میں نے مدھومتی کا دل جیت لیا یا کم سے کم مدھومتی نے میری مخالفت نہ کی تو لالہ بیوہاری لال مجھے اپنا گھر داماد بنالیں گے۔

''مگر میرا ان کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھے گا۔'' میں نے اعتراض کیا۔ (میں اعتراض نہ کرتا مگر اس وقت میرے ذہن میں شاردا کا سانولا اور شرمیلا چہرہ بار بار آرہا تھا، آنکھوں کے تیکھے کونے آنسوؤں سے

بھیگ چلے تھے۔ میں کیا کہوں گا اس سے۔ اب تو ہم نے اپنے گھر کے لیے پردوں کے رنگ تک چن لیے تھے)

اس لیے میں نے ذرا زور دے کر کہا۔ ''دیکھیے پتا جی! لالہ بیوہاری لال کروڑ پتی ہیں۔ انہیں ان کی شان اور مرتبے کے مطابق ایک کروڑ پتی برمل جائے گا اس میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

''وہ ایسا داماد نہیں چاہتے ہیں جس کا اپنا خاندان کروڑ پتی ہو۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اکثر ایسے امیر خاندانوں کے بیٹے اپنے باپ کے بزنس میں اپنے سسر کا روپیا پھنسوا دیتے ہیں۔ اس سے بڑی گڑبڑ ہوتی ہے۔ تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ روپیا

الگ پھنس جاتا ہے۔ آدمی جذباتی دلدل میں الجھ جا
ہے۔ لالہ بیوہاری لال ایسی کوئی الجھن نہیں چاہتے
اس لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ تم آج
نینی تال کے لیے روانہ ہو جاؤ اور مدھومتی کا دل جیت
کی کوشش کرو۔ تمہیں بہت زیادہ کوشش نہیں کر
پڑے گی کیونکہ لالہ بیوہاری لال خود بھی کافی کوشش
کر لیتے ہیں۔ ادھر وہ آج کل کنسٹرکشن لائن میں
رہے ہیں۔ اگر گھر داماد انجینئر ہوگا تو ٹھیکوں میں
کتنی بچت ہوگی؟ ذرا خود سوچو کہ پھر تم کیا سے
ہو جاؤ گے؟ پھر میرے بڑھاپے پر غور کرو۔ ماں کے
چہرے پر لٹکتی ہوئی جھریوں کو گنو۔ اس جہیز کا حساب
کرو جو تمہیں اپنی تین کنواری بہنوں کی شادی میں د

پڑے گا۔ اس رقم کو آنے پائیوں میں گنو جو تمہیں اپنے چار چھوٹے بھائیوں کی تعلیم میں صرف کرنا ہوگی۔ ٹھیک سے حساب کرو۔"

میں نے جو ٹھیک سے حساب کیا تو نینی تال جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میرا فیصلہ سن کر شاردا بہت روئی تھی سسکتے سسکتے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔"رام جی، یہ کیسے طرح کا حساب ہے؟" میں نے کہا۔"اسے ہائر میتھمیٹکس Higher mathematics کہتے ہیں۔"

شاردا کی سانولی، بھولی بھالی صورت مدھومتی کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ مدھومتی کا اجلا اجلا تیز روشن حسن ہیرے کی طرح جگمگاتا تھا اور اسی طرح سخت تھا۔ اس کے ہونٹ یاقوت تھے تو آنکھیں نیلم، گال لعل تو دانت موتیوں کی لڑیاں۔ وہ جب ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ منہ کی چھلنی سے پکھراج کے شفاف دانے بکھر کر گر رہے ہیں۔ ایک دن جب وہ اسی طرح بلا وجہ زور سے ہنس رہی تھی تو میرا جی چاہا کہ اس کے منہ کے نیچے اپنا رومال کھول کر رکھ دوں اور پکھراج کے سارے دانے سمیٹ لوں مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ ممکن ہے وہ اعتراض کرے اور میرے حساب میں گڑبڑ ہو جائے۔

میں مدھومتی کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ بڑی کھلنڈری، خودسر اور شریر لڑکی تھی۔ بے حد بدمزاج اور حاکمانہ طبیعت پائی تھی اس نے۔ وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتی تھی مگر ہر سال پاس ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ کالج اس کے پتا نے قائم کیا ہوا تھا۔ وہ بات بات میں پروفیسروں کا مذاق اڑاتی تھی۔ ایک روز کیمسٹری کے پروفیسر نے اس سے پوچھا (وہ بے چارا نیا نیا آیا تھا اور مدھومتی کو نہیں جانتا تھا۔ ورنہ پوچھتا ہی کیوں؟)"فولاد کیسے بناتے ہیں؟"

مدھومتی بولی۔"لوہے سے بناتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں لوہے سے تو بناتے ہیں مگر کیسے بناتے ہیں؟"

"انجینئر لوگ بناتے ہیں مگر کیسے بناتے ہیں؟"

"کارخانے میں بناتے ہیں۔" مدھومتی تنک کر بولی۔

"ارے کارخانے میں بناتے ہیں، مگر کیسے بناتے ہیں؟" پروفیسر نے ذرا گرم ہوکر"کیسے" پر بہت زور دے کر پوچھا۔

"اب یہ بہت نامناسب بات ہے پروفیسر صاحب!" مدھومتی بولی۔"کہ آپ کے ہر سوال کا جواب میں ہی دیتی جاؤں، کیمسٹری کے پروفیسر آپ ہیں، میں نہیں ہوں۔"

مگر اس وقت تو میں نے اسے دور دور سے دیکھا تھا۔ جیسے لوگ دوربین سے چاند کو دیکھتے ہیں مگر اس وقت میں مدھومتی کے ساتھ چل رہا تھا۔ ہاتھ میں ہاتھ لیے ہوئے تاریک دیواروں کے درمیان چھوٹی سی پہاڑی سڑک پر چاندنی اور سایے کی شطرنج بچھی ہوئی تھی۔ تاریک فضا میں ان دیکھے پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ وقت الجبرے کے کسی مشکل سوال کی طرح خاموش تھا اور مدھومتی کی کمر میرے ہاتھ کے جھکتے ہوئے لمس سے ہر لحظہ ایک نیا زاویہ بناتی تھی۔ نینی تال آنے سے پہلے میں نے برسوں پرانی کرم خوردہ کتابوں کو کھولا اور شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ، بائرن اور لانگ فیلو کے شعر جیومیٹری کی شکلوں کی طرح یاد کیے، محبت کی مثلث میں کون سے شعر کس وقت منطبق ہوتے ہیں، انہیں یاد رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ عشق کا سارا میزانیہ بگڑ جاتا ہے۔ میں نے آج رات کی تاریکی لمبی سیر میں مدھومتی کے بدلتے ہوئے موڈ اور مزاج کو دیکھ کر ہر عنوان سے شعر پڑھے بلکہ جمع کیے۔ آدمی جب اعداد جمع کرتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ سب مل کر ایک نتیجہ مرتب کرتے ہیں اس لیے جب اتنے سارے شعر جمع کیے جائیں تو ان کا ایک اثر کیوں نہ ہوگا۔ اس سے کوئی نتیجہ کیسے برآمد نہ ہوگا؟

جانے یہ میرے شعروں کے جمع کرنے کا عمل

تھا کہ لالہ بیوہاری لال کے خطوں کا کہ رومانی فضا کے نازک خطوط کا، کہ ان زاویوں کا جو میرا ہاتھ اس کی کمر سے بنا رہا تھا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مدھومتی کا غرور اور مزاج شہد میں پگھل گیا تھا۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور چلتے چلتے رک رک کر میرے کندھے پر سر رکھ دیتی اور چلتے چلتے میں چونک جاتا۔ دیودار کے پھیلے ہوئے تاریک مبہم سایوں کے درمیان مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کہیں پر کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کہیں پر اس پھیلی ہوئی تاریکی کے اندر دو بھیگی بھیگی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں اور کسی کا سانولا شرمایا ہوا چہرہ مجھ سے کوئی شکایت کر رہا ہے۔

اور چلتے چلتے میں دو تین بار اپنے سر کو جھٹک دیا۔ مجھے اس عدد کا خیال نہ کرنا چاہیے جسے میں تفریق کر چکا۔

اس طویل سیر کے دوران میں کہیں پر مدھومتی کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ مجھے پسند کر سکتی ہے۔ پہلی بار اس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جن سے ایک خوب صورت عورت اپنی انگلی میں پہنے ہوئے ہیرے کی ایک نئی انگوٹھی کو دیکھتی ہے۔ پہلی بار اس نے میرے چہرے کو نئی نظروں سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ میں کتنے قیراط (carat) کا ہوں۔

پھر اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کل بھی اکیلی میرے ساتھ چائنا پیک پر جائے گی۔ کل مجھے بہت صبح اس کے بنگلے پر پہنچ جانا چاہیے۔ وہ میرے لیے ایک گھوڑا اور اپنے لیے ایک ڈانڈی منگوا کر رکھے گی۔ احتیاطاً ممکن ہے راستے میں تھک جانے پر کہیں ان کی ضرورت پڑ جائے۔ ورنہ ہم جائیں گے پیدل ہی۔ اس نے مجھ سے کہا اور زور سے میرا ہاتھ دبایا۔

اس رات میں نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا۔ اس خط پر صرف تین حروف کندہ تھے۔ QED

اگر اس دنیا میں صرف حساب ہی سب کچھ ہے تو میرا یقین ہے کہ میرا باپ میرا خط پا کر بہت خوش ہوگا۔

دوسرے دن وہ بہت پریشان حال اور بڑے موڈ میں مجھے ملی۔ ''میں آج تمہارے ساتھ چائنا پیک نہیں جا سکتی۔''

''کیوں؟''

''اور تم بھی نہیں جا سکتے۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔

''کیوں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

معلوم ہوا مدھومتی کا ایلسیشن کتا بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ صبح آیا اسے سیر کرانے لے گئی تھی کہ وہ ایک پہاڑی ڈھلان پر سے پھسلا اور اس کی پچھلی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ بہت بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ مدھومتی اسے بار بار پیار کرتی تھی مگر کتا آخر کتا ہے، یعنی وفاداری کے علاوہ ایک جسم بھی رکھتا ہے اور جب جسم میں شدید درد ہو تو کتے ایسا کچی محبت کرنے والا جانور بھی محبت کرنے کے بجائے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

''تم اسے ڈانڈی میں بٹھا کر فوراً اسپتال لے جاؤ اور ڈاکٹر سے کہو فوراً اس کا علاج کرے۔''

''نینی تال میں مویشیوں کا اسپتال کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں۔'' میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اسے جانوروں کے اسپتال لے جانے کے لیے تمہیں کون کہتا ہے۔ اسے ملی تال کے اسپتال میں لے جاؤ۔ آدمیوں کے اسپتال میں۔''

''اگر ڈاکٹر نے اس کا علاج کرنے سے انکار کیا تو؟''

''کیسے کرے گا؟'' وہ گرج کر بولی۔ ''یہ اسپتال میرے باپ کا قائم کیا ہوا ہے۔ تم جاؤ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کیے دیتی ہوں۔''

جس ڈانڈی میں وہ میرے ساتھ چائنا پیک جانے والی تھی، اسی ڈانڈی میں، میں نے کتے کو سوار کیا، خود ایک گھوڑے پر بیٹھا۔ اسپتال کے باہر پہنچ کر مزدوروں نے ڈانڈی رکھ دی اور میں انہیں

انتظار کا کہہ کر اسپتال کے اندر داخل ہوا۔

ایک مثلث نما برآمدے کے اندر ایک لمبا کوریڈور تھا۔ اس کوریڈور میں جا بجا بینچ بچھے ہوئے تھے جن پر پژمردہ اور ملول، بیمار اور ان کے ساتھ آنے والے رشتے دار اور دوست بڑی بے چینی اور بے صبری سے اسپتال کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔'' ایک اردلی نے مجھے بتایا۔

''کیا بڑے ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں؟'' میں نے اسپتال کے در و دیوار پر ایک نیم مائکانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ پوچھتے وقت خود بخود میرے لہجے میں ایک تیزی سی آ گئی تھی۔ آخر اس اسپتال کو مدھوستی کے باپ یعنی میرے ہونے والے سسر نے قائم کیا تھا۔

اردلی میرے تحکمانہ لہجے سے چونک گیا۔ پھر اس نے اپنا پوز فوراً بدل لیا اور جھک کر کسی قدر انکساری کے لہجے میں بولا۔ ''بڑے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔''

''تو انہیں جا کر خبر کرو، مدھوستی میم صاحب کا کتا آیا ہے۔''

اردلی جا کر کافی دیر تک نہیں لوٹا۔ میں کوریڈور میں ٹہل ٹہل کر مریضوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بڈھے ہولے ہولے کھانس رہے تھے اور باری باری کھانس رہے تھے۔ جب ایک کھانسنا بند کرتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ان دونوں میں کس طرح کا سمجھوتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بچہ انتہائی دبلا پتلا کمزور اور پیلا اپنی ماں کی گود میں برابر روئے جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بچے کو جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے آج تک کبھی مناسب غذا نہیں ملی اور بے چاری ماں اپنے بیٹے کی بھوک کا علاج کسی دوا سے کرنے کے لیے اسے شفاخانے لے آئی تھی۔ ایک آدمی پورے بینچ پر لیٹا ہوا جانوروں کی طرح ڈکراتا تھا اور تین آدمی اسے سنبھالنے میں لگے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا، رات سے درد گردہ میں مبتلا ہے۔ آگے جا کر ایک کونے میں کھاٹ پر ایک آدمی کا جسم پڑا تھا اور جگہ جگہ اس کے جسم سے خون جاری تھا اور بہت سا خون جسم سے بہہ کر کھاٹ کے نیچے ایک چھوٹی سی دلدل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا اس آدمی پر جنگل میں باگھ نے حملہ کیا تھا۔ کچے گوشت کے لوتھڑے سے اس کی ٹانگوں سے ادھڑ رہے تھے اور اس کا چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور تقریباً جان نکنی کی سی حالت تھی۔ اس کی بیوی اور اسکا بڈھا باپ گھبرا گھبرا کر کبھی ایک اردلی اور کبھی دوسرے اردلی کے پاس جا کر ہاتھ جوڑتے تھے اور ان سے ڈاکٹر کو جلد خبر کر دینے کے لیے منت سماجت کرتے تھے۔

یکا یک بڑا ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے دو اردلی مودب اور نپی تلی چال چلتے ہوئے آئے۔ ایک اردلی نے میری طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر جلدی سے میری طرف لپکا۔

''سمندر کہاں ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''سمندر تو بمبئی میں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور پہاڑ پر جھیل ہوتی ہے، سمندر نہیں ہوتا۔''

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سمندر مدھوستی کے کتے کا نام تھا۔ اس مسئلے پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھے چند لمحوں تک شرمندہ رہنا پڑا۔ بعد میں ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سمندر باہر ڈانڈی میں پڑا ہے وہ اتنا بھاری ہے کہ میں اسے گود میں اٹھا کر نہیں لا سکتا اور ڈانڈی والے بھی انکاری ہیں۔

''کوئی مضائقہ نہیں۔'' ڈاکٹر نے تیز لہجے میں ایک اردلی کو حکم دیا۔ ''اسٹریچر باہر لے کر جاؤ اور مدھوستی میم صاحب کے کتے کو فوراً اندر لے کر آؤ۔''

دو اردلی اسٹریچر لے کر فوراً بھاگے۔

بڈھے باپ کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور خوف اور دہشت سے اس کے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کو بچا لیجیے۔ اسے باگھ

نے کاٹ کھایا ہے۔"

"ابھی دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر نے بڈھے باپ کو بڑی نرمی سے تسلی دیتے ہوئے کہا اور چند قدم آگے چل کر کوریڈور کی طرف جانے لگا مگر پھر یہ دیکھ کر رک گیا کہ دو اردلی کتے کو اسٹریچر پر رکھے ہوئے بڑی احتیاط سے لا رہے تھے۔ بڑا ڈاکٹر جلدی سے اسٹریچر کے قریب جا پہنچا اور اس سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔

"ہیلو سمندر پور ڈاکی what a shame بٹ ڈونٹ وری You have been hurt we will set you right in a minute اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "he is a brave dog

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کتا ہماری زبان نہیں سمجھتا؟"

ڈاکٹر نے بڑی نخوت سے کہا۔ "صرف انگریزی سمجھتا ہے۔" پھر اس نے میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی نیچ نسل کا کتا ہوں، مگر دو ٹانگوں والا۔

جب کتے کا اسٹریچر اس نوجوان زخمی کی چارپائی کے قریب سے گزرا، جسے باگھ نے کاٹ کھایا تھا تو اس نوجوان کی بیوی نے ڈاکٹر کے پاؤں چھو لیے اور رو رو کر بولی۔ "جرا ایک پل اسے دیکھ لیو، ڈاکٹر صاحب بھگوان کے لیے۔"

"ابھی آتا ہوں، ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر نے پھرا کر اپنا پاؤں پیچھے کر لیا اور اسٹریچر کے ساتھ ساتھ آپریشن روم میں داخل ہو گیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگ آپریشن روم سے نکلے۔ سمندر کے سب زخموں پر ٹانکے لگا دیے گئے تھے۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی جوڑ کر اسے پلاسٹر میں رکھ دیا گیا تھا۔

"اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

پھر اس نے سمندر کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرا اور بڑے پیار سے بولا۔ "brave dog!"

کتے نے بڑے کمزور سے انداز میں اپنی دم ہلائی پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اردلی کتے کو بڑی احتیاط سے دوبارہ اسٹریچر پر رکھنے لگا۔

جب اسٹریچر دوبارہ کوریڈور سے گزر رہا تھا تو ڈاکٹر ہمیں جلدی سے الوداع کہہ کر اس زخمی نوجوان کی کھاٹ کی طرف گیا میں بھی کتے کے اسٹریچر کے ساتھ نہ جا سکا اور ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے جا کر اس کی نبض دیکھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا۔" بڈھا باپ کراہتے کراہتے بولا۔ "کسی طرح میرے بادل کی جان بچا لیجیے۔"

"مگر یہ تو مر چکا ہے۔" ڈاکٹر نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

جب تک میں زندہ ہوں اس بڈھے کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتا تھا، کبھی ڈاکٹر کی طرف اور ہولے ہولے انکار میں سر ہلائے جاتا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے آنسو ابھر رہے تھے اور وہ شدید جدوجہد سے انہیں روک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی داڑھی تھی اور اتنی جھریاں تھیں جتنی کسی ہل چلائے ہوئے کھیت میں ہوتی ہیں۔ چند لمحوں میں اس کے چہرے کی جھریوں سے پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ اس کا چہرہ طوفان میں ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ پہلے چند لمحوں میں جیسے اس کے ہونٹوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ پھر یکا یک اس کی آواز ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑی اور وہ چیخ کر بولا۔ "مگر ابھی تو یہ زندہ تھا ڈاکٹر صاحب! ابھی تو یہ زندہ تھا میرا بادل!"

ڈاکٹر چند لمحوں کے لیے چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر کچھ سمجھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

واپسی پر میں سارے راستے چپ رہا۔ میں نے گھوڑا چھوڑ دیا تھا اور ڈانڈی والوں کو بھی رخصت کر دیا تھا کیونکہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے ازراہ ہمدردی مدھومتی کے کتے کو اسٹریچر پر ہی لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور اپنے دو اردلی ساتھ کر دیے تھے۔ وہ بڑے عمدہ اور زندہ دل اردلی تھے اور طرح طرح کے گیتوں سے میرا دل بہلاتے رہے مگر میں چپ رہا۔

مدھومتی بے حد خوش ہوئی۔ اس نے اردلیوں کو بیس روپے انعام میں دیے اور جب اردلی چلے گئے تو اس نے اپنا گال میرے گال سے لگا کر مجھے انعام دیا۔ پھر دوپہر تک اپنے کتے کی طرف متوجہ رہی اور میں چپ چاپ کھڑا رہا اور اندر ہی اندر میرا دل بیٹھتا رہا۔

وہ مجھے اداس دیکھ کر بولی۔ ''تم تو ایسے بسور رہے ہو جیسے تمہیں میرے سمندر کے بچ جانے کی رتی بھر خوشی نہ ہو؟''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟'' وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔

میں نے اسے اسپتال کا سارا واقعہ سنا دیا۔

سن کر وہ فوراً سر جھٹک کر بولی۔ ''باؤلے ہوئے ہو، یہ جانگلو اکثر تو باگھ کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ باگھ تو ان کو کھاتے ہی رہتے ہیں اور کھاتے ہی رہیں گے۔ ایسے سینکڑوں کیس ہو چکے ہیں اور ہزاروں لوگ اسپتالوں میں مرتے رہتے ہیں اور جانے اس لمحے جب تم ہم دونوں بات کر رہے ہیں کتنے لاکھ لوگ اس دنیا میں ایک منٹ میں مر جاتے ہیں۔ اس طرح حساب کرنے لگو گے تو دنیا میں کوئی کام نہ کر سکو گے سری رام!''

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر بنگلے کے برآمدے میں لے آئی اور آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔ ''آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں گرم گرم چائے کے گھونٹ پیتے ہیں اور تم سے کیٹس کے پیارے پیارے شعر سنتے ہیں۔ ہائی کیٹس کے شعر کتنے نرم اور ملائم ہوتے ہیں، بالکل میرے کتے کے بالوں کی طرح۔''

دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی، مجھے رجھاتی، پرچاتی رہی مگر میرا دل کسی طرح نہیں بہلا اور میں انتہائی کوشش کے بعد بھی چپ، بجھا اور اداس بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سی جامد و ساکت اداسی تھی جس نے میرے محسوسات کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نہ بول سکتا تھا نہ ہنس سکتا تھا۔ نہ سوچ سکتا تھا۔

چائے آئی، اس نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی۔ پھر بسکٹوں کی پلیٹ آگے بڑھا کر بولی۔ ''لو کھاؤ۔''

میں نے خاموشی سے انکار کیا تو اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر زبردستی میرے منہ میں ڈال دیا۔ بولی۔ ''کھانا پڑے گا۔ کھاؤ۔''

میں بسکٹ کھانے لگا۔ پھر ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ میں بسکٹ چبا رہا تھا۔ آپ ہی آپ میکانکی انداز میں میرے جبڑے چل رہے تھے اور میں بسکٹ کھا رہا ہوں وہ نہ پھینکا سے نہ میٹھا ہے، نہ نمکین، وہ بسکٹ بھی نہیں ہے۔ بلکہ کچے گوشت کا ایک لجلجا سا ٹکڑا ہے۔

یکا یک مجھے زور سے ابکائی آئی اور میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ مدھومتی مجھے پکارتی ہی رہ گئی۔

نہیں نہیں آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں نے شاردا سے شادی نہیں کی۔ شادی تو میں نے مدھومتی ہی سے کی ہے۔ یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب میں نوجوان اور ناتجربہ کار تھا اور زندگی کے حساب میں پختہ نہیں تھا۔ اب تو میں ایک کامیاب آدمی ہوں۔ ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ہوں۔ اب کہیں پر کتنے ہی لوگ مر جائیں، میرے بسکٹ کا ذائقہ کبھی نہیں بدلتا۔

☆☆

دوزخ

اخلاق

خلاء میں تیرتے ہوئے دو مسافروں کا احوال ان کا خلائی جہاز تباہ ہوچکا تھا۔ اب انہیں صرف وہ آلات ہی خلائی اسٹیشن تک پہ نچا سکتے تھے جو محفوظ رہ گئے تھے۔ زیر نظر تحریر پڑھنے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ انسانوں میں محبت کے جذبے کی شدت کیا ہوتی ہے اور یہ جذبۂ محبت انسان سے کیا کچھ کروالیتا ہے جبکہ مشینی انسان بے حس ہوتے ہیں۔

خلاء میں تیرنے والے دو انسانوں کا احوال، وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے

تاریک خلا میں ایک سیٹی سی گونجی اور ایک دھماکا ہوا، چند چنگاریاں اڑیں، بیکراں خلا میں ان دونوں کے جسم کسی نامعلوم سمت تیرتے چلے گئے۔

اس نے سیاہ تاریکی میں کسی نامعلوم ستون کو، کسی بہرحال رسی کو پکڑنے کی کوشش کی، مگراس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ کس سمت میں تیر رہی ہوں میں، اس نے سوچا۔ مشرق یا مغرب، زمین کی طرف یا روشنی سے دور۔ اس کے جسم پر چڑھے ہوئے ٹرانزسٹرائزڈ خلائی لباس کے اسپیکر میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور وہ چونک پڑی۔

”ہیلو سوزی رپورٹ سیفٹی کیپٹن جیمز اسپیکنگ رپورٹ سیفٹی۔“

”اوہ جمی۔“ اس نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔ کہاں ہوتم؟“

”خلا میں کسی نا معلوم سمت میں تیرتا جا رہا ہوں۔ بہرحال ہمارا رابطہ تو برقرار ہے اور ہاں...... ہم زمین پر نہیں ہیں۔ لہذا بے تکلفی سے جمی کی بجائے کیپٹن جیمز کہہ کر مخاطب کرو۔ خلائی جہاز بلاشبہ ایک شہاب ثاقب سے ٹکرا کر تباہ ہو چکا ہے۔ مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے رتبے اور عہدے کا......“

”اچھا، اچھا۔“ سوزی بولی۔ ”کیا میں کیپٹن کرافورڈ سے یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتی ہوں کہ انہوں نے اپنے ابتدائی پیغام میں مجھے مس سوزن ویلوٹ کی بجائے سوزی کہہ کر کیوں مخاطب کیا؟“

دوسری طرف بالکل خاموشی چھا گئی تھی، سوزی نے دوبارہ پوچھا۔

”کیپٹن جیمز، آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“

اسپیکر بدستور خاموش رہے۔

”جیمز۔“ سوزی کے لہجے میں تشویش تھی، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ سیاہ تاریک خلا کی خاموشی اچانک چلانے لگی، ماحول پر چھانے لگی۔

”جیمز۔“ وہ چلائی۔ ”جمی۔“

”مس سوزن ویلوٹ۔“ دوسری طرف سے جیمز کی آواز آئی۔ ”میری خاموشی آپ کے سوال کا جواب تھی، اگر میں آپ کو سوزی کہہ کر نہ پکارتا تو اب

تک غالباً خلاء کے پراسرار ماحول سے خوف زدہ ہوکر آپ یا تو پاگل ہوچکی ہوتیں یا عورتوں کی اعلا روایات کے عین مطابق بے ہوش۔'' سوزی کو ہنسی آ گئی۔

''انہی عادتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔'' جیمز کے لہجے میں مصنوعی غصہ تھا۔ ''خلائی جہاز تباہ ہو چکا ہے، عملے کے دونوں افراد خلا میں بے یقینی کے عالم میں موجود ہیں اور تشویش کے بجائے محترمہ ہنس رہی ہیں، خیر شادی کے بعد سب ٹھیک کرلوں گا۔''

سوزی ایک دفعہ پھر ہنسی، زندگی اور حرارت سے بھرپور توانا ہنسی، سکوت کی چادر سے بے خبر اپنے جذبے کی شدت سے مجبور ہوکر آنے والے سنہرے دنوں کے خیال کو اپنے پورے وجود پر طاری کر کے خوشبو کی طرح لہرائی خوب صورت ہنسی، پھر اچانک وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''جمی۔'' وہ بولی۔ ''وہ انسانوں کو تلاش کرنے والے الیکٹرانک آلے کب تک ہمیں تلاش کرلیں؟''

جیمز کچھ دیر تک خاموش رہا۔ ''ہمارے خلائی جہاز میں انسانوں کو تلاش کرنے والے دو ہی آلے تھے اور.....''

اور کیا جمی؟'' سوزی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں خلائی جہاز کے ساتھ وہ بھی تو تباہ نہیں ہوگئے؟''

''نہیں۔'' جیمز پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ''دونوں سلامت ہیں اور دس منٹ کے اندر اندر اگر خدا نے اور ان آلوں کے کمپیوٹرائز نظاموں نے چاہا تو وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔ لہٰذا امید یہی ہے کہ اگلے پندرہ منٹ میں ہم کسی بھی خلائی اسٹیشن کے شعبہ خلائی تحفظ میں زمین پر واپس جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے۔''

وہ دونوں پھر خاموش ہوگئے، شاید ایک دوسرے کے تصور میں گم۔ ایک نئی کائنات میں ایک دوسرے کا سہارا لے کر چلتے ہوئے نیلے پانی کی اجنبی جھیلوں کے کنارے ایک دوسرے کو خاموشی سے تکتے ہوئے یا زمین پر واپس پہنچنے کے خیال میں غرق، مقدس پادری کے روبرو لفظوں کی رسی میں گرفتار ہوتے ہوئے، گھنے جنگلوں میں خزاں رسیدہ پتوں سے اٹی ہوئی پگڈنڈیوں پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے، وہ خاموشی سے سوچتے رہے، انہوں نے یونہی خلا میں تیرتے تیرتے شاید اچانک ایک مکمل دنیا تخلیق کر لی۔ جہاں سورج چاندنی پھیلاتا تھا اور بادل پیار برساتے تھے اور ملک آپس میں سکون کا لین دین کیا کرتے تھے اور امن کی فاختہ ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔ جہاں کا بادشاہ کیوپڈ تھا اور عشق جس کی ملکہ تھی اور جنگ نہ تھی اور جدائی نہ تھی اور زخمی چہرے نہ تھے، جہاں خواہشیں تھیں اور ان کا وجود تھا اور بے ہنگم چہروں والے صنعت کار نہ تھے اور کوئی دیوار نہ تھی پھر بھی ہر چھت پناہ دیتی تھی اور ہر ستون سہارا دیتا تھا اور جہاں کوئی رشتہ نہ تھا، پھر بھی انسان جذبے رکھتے تھے اور مدد کرتے تھے، پر انہوں نے اس دنیا کو لپیٹ کر اپنے ذہن کی جیبوں میں رکھ لیا اور واپس تاریک وساکت خلا میں آ گئے۔

''پانچ منٹ گزر چکے ہیں سوزی۔'' جیمز کی آواز آئی۔ ''اپنے خلائی سوٹ میں لگا ہوا سرخ بٹن دبا دو تاکہ پانچ منٹ بعد جب وہ انسانوں کو تلاش کرنے والے آلے کام کرنا شروع کریں تو ہمیں آسانی سے تلاش کرسکیں۔'' سوزی نے فوراً بٹن دبایا۔

''جمی۔'' وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم اس مصنوعی نیند والے بٹن کو دبا کر سو جائیں تاکہ جب ہماری آنکھ کھلے تو ہم کسی خلائی اسٹیشن میں موجود ہوں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' جیمز کی آواز آئی، سوزی نے فوراً اپنے خلائی سوٹ کی داہنی جانب لگا ہوا مصنوعی نیند کا بٹن دبا دیا جس کو دبانے کے تیس سیکنڈ بعد نیند طاری ہوجایا کرتی تھی۔

''جمی!'' اس نے نیند کی آغوش میں جانے سے قبل پوچھا۔ ''وہ انسانوں کو تلاش کرنے والے دونوں آلے محفوظ تھے نا تباہ تو نہیں ہوگئے تھے؟''

''اوہ.....نو بے بی تم بس اب سو جاؤ، اطمینان سے۔''

سوزی نے آنکھیں بند کیں اور سو گئی، مگر دوسری طرف جیمز جاگتا رہا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ خلائی جہاز میں موجود دو انسانوں کو تلاش کرنے والے

الیکٹرانک آلوں میں ایک جہاز کے ساتھ ہی تباہ ہوگیا تھا۔ دوسرا خلاء میں درست حالت میں تیر رہا ہوگا۔ اس کا مشینی نظام ایک فرد کو حفاظت سے کسی خلائی اسٹیشن تک پہنچا سکتا ہے، فیصلہ اب اس کے ہاتھ میں تھا کہ سوزی اور خود میں سے کس کو بچائے۔ ان دیکھے چاند کی کرنوں پر ایک میزان تیرتا ہوا آیا اور اس کے سامنے معلق ہوگیا، پھر کہیں سے خوب صورتی تیرتی ہوئی آئی۔ پیار کا لبادہ اوڑھے اور میزان کے ایک پلڑے میں بیٹھ گئی۔ تاریک خلا کے سکوت سے وف تیرتا ہوا آیا، موت کا لباس سمائے اور میزان کے دوسرے پلڑے میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں زہریلے سانپ لپٹے مسکرا رہے تھے۔ کوئی جاناں میں کھلا کس کے لہو کا پرچم..... ہر طرف موت کے گجر بجنے لگے، کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟ کیپٹن جیمز کرافورڈ، سیاہ ناگ پھنکارے عشق زندگی کی نذر کیا جاسکتا ہے، مگر زندگی عشق کی نذر نہیں کی جا سکتی ہے۔ محبت تو زندگی کی فصیل کے باہر تنہا قدموں کی چاپ ہوتی ہے..... راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔ پھر بس سیٹیاں بجتی رہ گئیں اور سکوت چلاتا رہ گیا اور خاموشی چیختی رہ گئی اور میزان جیمز کے دل میں جا بیٹھا۔

سوزی کی آنکھ کھلی تو اس کی نظر سب سے پہلے سفید چھت پر پڑی۔ اس کے احساس نے خود کو ایک نرم بستر پر ہونے کا یقین دلایا۔ اس کی نظریں سفید چھت اور سفید دیواروں سے ہوتی ہوئی بائیں طرف کھڑے ہوئے آہنی روبوٹ پر جا رکیں، اسے ہوش میں آتے دیکھ کر روبوٹ مشینی انداز میں پلٹا اور نپے تلے قدموں سے باہر نکل گیا۔

سوزی اچھل کر بیٹھ گئی کمرے میں ایک ہی بستر تھا۔ تھوڑی دیر میں تین روبوٹ اندر داخل ہوئے۔

''ہیلو مس سوزن ویلوٹ۔'' ایک روبوٹ اپنی مشینی آواز میں سرسرایا۔ ''آپ ہوش میں آگئیں۔''

''میں کہاں ہوں؟'' سوزی نے کہا۔

''ایس نائن ایٹ نائن کے خلائی اسٹیشن میں۔'' روبوٹ بولا۔

''جمی کہاں ہے؟'' وہ اضطراب سے بولی۔

''جمی کون؟'' وہ بولا۔

سوزی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''میرا مطلب ہے کیپٹن جیمز کرافورڈ کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' سوزی نے اپنے ذہن میں ابھرتے ہوئے وسوسوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہیں وہ؟''

''آپ کے خلائی جہاز میں دونوں انسانوں کو تلاش کرنے والے آلات میں سے ایک تباہ ہو چکا تھا۔'' اس کی آواز میں ایک سرد اور بے حس کھنک تھی ''اور باقی بچا ہوا آلہ ایک ہی فرد کو بچا سکتا تھا، لہٰذا اس نے آپ کو بچالیا۔''

''مگر..... مگر کیپٹن جیمز کو کیوں نہیں بچایا گیا؟'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ''مجھے کیوں بچالیا..... اسے کیوں مرجانے دیا؟''

''دراصل کیپٹن جیمز نے اپنے خلائی لباس میں موجود وہ سرخ بٹن نہیں دبایا تھا، جس کو دبانے کے بعد ہی آپ لوگوں کی سمت معلوم کی جاسکتی ہے۔''

سوزی کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ غبارے آگئے، وہ ساکت بیٹھی اپنے سامنے والی سفید دیوار کو تکتی رہی۔

''کیپٹن جیمز دراصل اس احمقانہ جذبے کے تحت موت کے منہ میں چلے گئے۔'' روبوٹ بولا۔ ''جو ہم روبوٹس میں نہیں پایا جاتا، انسانی ہمدردی کا احمقانہ جذبہ۔''

وہ مڑے اور آہنی قدم فرش پر بجاتے باہر نکل گئے۔ ایک آنسو دھیرے سے اس کے گالوں پر سے ہوتا ہوا نیچے گرا۔ پھر اس کے وجود کے گرد سپنوں کی سفید برف گرنے لگی اور وہ اس میں دفن ہوتی چلی گئی۔

☆☆

دمک رہے ہیں بام و در

ماریہ حکیم

لمحے جب کھوجائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی لیے زندگی کی تلاش میں تھا کہ ایک چاند گھر کی دہلیز پر اس کا منتظر تھا۔

صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے

گرین ولا کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ ایک طویل سا ہارن دے اور اس کے جواب میں چوکیدار گھر کے کسی گوشے سے نکل کر آہنی گیٹ کے دونوں پٹ اس کے لیے وا کردے اور بڑی آہستگی سے اپنی گاڑی کو پورچ میں لے جائے۔

یہ گھر اس کا اپنا ہی گھر تو تھا جہاں زندگی کے چند برس..... ہاں! صرف چند برس ایک خواب کے عالم میں اس نے بسر کیے تھے لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ خواب سرک کر دھندلکوں میں چھپ گئے تھے۔ وہ عہد ماضی تھا مگر حال کی دہلیز پر کھڑے ہو کر گم شدہ لمحوں کو پکارا تو جاسکتا تھا لیکن ان کا پلٹ آنا ناممکنات میں سے تھا۔ جو لمحات گزر گئے تھے وہ اب واپس نہیں آسکتے تھے اور گزرے ہوئے لمحوں کی داستان دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ دردناک اور تکلیف دہ تھی۔ بے حد تکلیف دہ۔

اس نے گاڑی سے اتر کر کال بیل پر انگلی رکھ دی اندر..... کسی کے بھاری قدموں کی آواز آرہی تھی اور ایک سیکنڈ کے بعد کسی نے گیٹ کھول کر باہر دیکھا۔ شرمینہ نے بھی سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ کوئی نیا چوکیدار تھا۔ چوکیدار نے آسمانی ساری میں لپٹی ہوئی دراز قد شرمینہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کس سے ملنا ہے بیگم صاحبہ؟''

''ظفر صاحب ہیں؟''

''نہیں صاحب تو کہیں گیا ہوا ہے۔''

''اچھا۔''

''ہاں! بچوں کو ساتھ لے کر گیا ہے۔''

''کب تک واپس آجائیں گے؟''

''کچھ پتا نہیں بیگم صاحبہ ہمیں۔''

شرمینہ سوچ میں پڑ گئی، ظفر کا انتظار کرے یا واپس چلی جائے اور پھر چوکیدار نے خود ہی اس کی مشکل آسان کردی۔

''آپ اندر آکر ان کا انتظار کرلیں۔''

شرمینہ گاڑی لاک کر کے اندر آگئی۔

اس کی حسرت بھری نگاہیں گرین ولا کے در و دیوار کا طواف کررہی تھیں۔ پھولوں کے کنج درختوں کے جھنڈ، حوض کے بہتے ہوئے پانی میں تیرتے ہوئے خزاں زدہ، سوکھے پتے، اسے ایک عجیب سی محرومی کا احساس دلا رہے تھے، کیسی ویرانی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی ہر طرف، وہ سفید ٹائلوں والے چمک دار برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ چوکیدار اسے دروازے تک پہنچا کر رخصت ہوگیا۔

اب وہ تنہا تھی۔ اس کمرے میں جسے اس نے کبھی اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ گلابی اور آسمانی رنگوں کے امتزاج سے کمرے کے حسن میں چار چاند لگائے

تھے۔ خوب صورت اور قیمتی ڈیکوریشن پیسز اس نے بڑے چاؤ سے خریدے تھے۔ اپنے من پسند کے ریکارڈز ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیے تھے مگر اب کمرے کی سیٹنگ بالکل بدلی ہوئی تھی، کوئی چیز اس طرح نہیں تھی جیسے اس نے کبھی رکھی تھی۔ کمرے میں مٹسرڈ اور پرپل کلر کا امتزاج تھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑی وہ بے چین نگاہوں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھی اور اپنی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستاروں کو اپنے رومال میں جذب کرتی رہی۔

پانچ سال کا عرصہ بہت طویل تھا لیکن پھر بھی ایسا لگتا تھا۔ جیسے پلک جھپکتے میں گزر گیا ہو۔ اس گھر میں آنا، ظفر کی سنگت میں صبح وشام بسر کرنا اور اس کے ساتھ شاپنگ کرنا، یہ سب کچھ کل کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دل نے تمنا کی کاش! وہ لمحات پھر سے پلٹ آئیں مگر یہ کیسی انہونی سی خواہش تھی۔ گزرے ہوئے لوگ اور بیتے ہوئے لمحے بھلا کب پلٹ کر آتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کا پردہ سرکا کر اس نے گھر کے اندر کی طرف جھانکا۔ سامنے کمرے کے دروازے بند تھے۔ یہ بھی اس کا بیڈروم تھا۔ وہ ریشمی پردے کو اپنے نرم ونازک ہاتھوں سے تھامے اپنے بیڈروم کے بند دروازوں پر نگاہیں جمائے بیٹھی ہوئی گھڑیوں کو یاد کرتی رہی تھی

اور آنسو ایک کے بعد ایک ٹوٹ کر اس کی ساڑھی میں جذب ہوتے رہے۔

پھر ڈرائنگ روم میں بالکل نہ رک سکی۔ باہر برآمدے میں آ گئی۔ رنگ برنگی کرسیوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتی ہوئی وہ ریلنگ کے قریب آ کر رک گئی۔ خزاں کی آخری شام بہت آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ سورج کی آڑی ترچھی کرنیں لمحہ بہ لمحہ غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان سے زمین تک ایک افسردہ سا غبار تھا۔ زرد اور نارنجی سی روشنی تیرگی کی وادیوں سے لپٹنے کے لیے بے قرار تھی سوکھے ہوئے پتوں اور جھلسی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ برآمدے کے ستون سے لپٹی ہوئی چنبیلی کی بیل بہت گھٹی ہوگئی تھی۔ اس کی پتلی پتلی شاخیں برآمدے کے ستون سے لپٹی ہوئی چنبیلی کی بیل بہت گھنی ہوگئی تھی۔ اس کی پتلی پتلی شاخیں بہت آگے تک بڑھ آئی تھیں۔ اس کی نرم و نازک پتیاں شرینہ کے بالکل قریب ہولے ہولے سرسرا رہی تھیں۔

اس نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وقت کسی طرح گزر رہی نہیں رہا تھا۔ اب اس کی بے قراری اور بے چینی ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔ ظفر سے زیادہ وہ بچوں کے لیے بے تاب تھی جنہیں دیکھے ہوئے پانچ طویل برس گزر گئے تھے۔ اس نے افسردگی سے سوچا۔

''وہ تو مجھے پہچان بھی نہ پائیں گے۔''

''کاشف تو اب تقریباً آٹھ سال کا ہوگیا ہوگا۔''

''اور وہ ننھی گڑیا۔ افشین بھی چھ سال کی ہوگئی ہوگی۔''

اس کا دل چاہا وہ بچوں کے کمرے میں جائے، ان کی تصویریں دیکھے، ان کے بستر، ان کے کپڑوں اور ان کے کھلونوں کو پیار کرے، چھو کر دیکھے اور ان چیزوں میں آتی ہوئی ان کی خوش بو کو محسوس کرے مگر..... یہ کیسے ممکن ہے گھر کے ملازم ایک اجنبی عورت کو سارے گھر میں گھومنے پھرنے کی اجازت کس طرح دے سکتے ہیں؟ ہاں اگر کوئی ملازم اس کے وقت کا موجود ہو تو شاید!..... لیکن اس ملازم سے وہ کس طرح آنکھیں ملا سکتی ہے؟

اسی وقت اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، اس نے پلٹ کر دیکھا ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔

اس نے رکسی شرینہ کے قریب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''آیئے بیگم صاحبہ! آپ چائے پی لیجیے۔''

''ارے نہیں بھئی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ میں چائے پی کر آئی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں ایک کپ اور پی لیں۔''

شرینہ نے بہت انکار کیا لیکن ملازم کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ مجبوراً شرینہ کو کہنا پڑا۔

''اچھا ٹھیک ہے ابھی میرا موڈ نہیں ہے، اگر دل چاہا تو تو میں خود ہی چائے بنا کر پی لوں گی۔''

''جی بہتر!'' ملازم نے کہا۔

اس وقت شرینہ جانے کیوں اپنے دل کے خدشے کو زبان پر لے آئی۔

''کیا بیگم صاحبہ بھی صاحب کے ساتھ گئی ہیں؟''

ملازم نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''جی بیگم صاحبہ تو نہیں ہیں..... میرا مطلب ہے صاحب نے شادی نہیں کی۔''

''اچھا!'' شرینہ بظاہر حیرت کا اظہار کیا لیکن اس نے اپنے آپ کو بے حد مطمئن محسوس کیا اگرچہ اسے فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ یہ سراسر خود غرضی ہے ان پانچ سالوں میں سوائے گزشتہ ایک سال کے وہ خود تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی رہی اور ظفر کے بارے میں یہ سن کر خوش ہوگئی کہ اس نے شادی نہیں کی۔ اس کی سوچیں گہری ہوگئیں۔ ملازم اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ

لرا اندر چلا گیا۔ لمحات چپ چاپ گزرنے لگے۔ سوچ نگر کی راہوں پر چلتے ہوئے وہ بہت دور..... بہت پیچھے چلی گئی۔

اور جب وہ چونکی تو اندھیرے بڑی خاموشی سے اس کے اردگرد سمٹ آئے تھے۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''اب ظفر کا انتظار فضول ہے مجھے واپس چلا جانا چاہیے۔''

برآمدی کی سیڑھی کے قریب کھڑے ہوکر اس نے لان میں چاروں طرف نظر دوڑائی، چمپا کے درخت کے نیچے چوکیدار بیٹھا اپنی نسوار کی ڈبیا کے شیشے کو چمکا رہا تھا۔ شرینہ سیڑھیاں اتر کر اس کے قریب چلی آئی۔ چوکیدار اسے قریب آتا دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ شرینہ نے کہا۔

''تمہارے صاحب تو ابھی تک نہیں آئے۔''

''جی بیگم صاحبہ! کلفٹن ملفٹن چلا گیا ہوگا بچوں کو لے کر۔

''اچھا! میں تو اب چلتی ہوں۔''

''جیسا آپ کی مرضی۔''

شرینہ سوچ میں پڑ گئی۔

''صاحب کو کیا بولوں؟ کون بیگم صاحب آیا تھا؟''

''ہاں۔'' شرینہ چونک پڑی پھر بولی۔

''میرا نام شرینہ ہے۔''

''شاہینہ؟''

''شاہینہ نہیں شرینہ۔''

''اچھا! اچھا سمجھ گیا شاہینہ۔''

''شاید نہیں بھئی! شرینہ۔'' وہ ایک دم مسکرادی۔

پھر اپنے پرس میں سے نوٹ بک اور قلم نکال کر اس نے نام لکھا اور سلپ پھاڑ کر چوکیدار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دے دینا صاحب کو اور ان سے کہنا میں کل شام کو آؤں گی۔''

''جی بہت اچھا۔''

''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے شرینہ کو ایک موہوم سی آس تھی کہ ظفر واپس آجائے لیکن وہ گاڑی اسٹارٹ کر آگے بڑھ گئی اور ظفر نہیں آیا۔ سارے راستے وہ سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ گاڑی چلاتی رہی۔

گھر پہنچی تو جواد بھائی اور بھابھی حسب معمول کلب گئے ہوئے تھے۔ ممی اور پاپا کسی فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ بھابھی کے بچے اپنی آیا کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے فواد کے کمرے کے قریب جاکر بڑی آہستگی سے پردے سرکا کر اندر جھانکا مگر اس وقت فواد کے گھر میں ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ یہ وقت ان لوگوں کے گھر میں بیٹھنے کا تھوڑی تھا وہ بوجھل قدموں سیا اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے بے حد گھٹن کا احساس ہوا۔ اس نے ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے، دل کی وحشت پھر بھی کم نہ ہوئی۔

کتنا بوجھ تھا دل میں اور لمحے اپنا زخم چھپائے چپ چاپ گزرے چلے جارہے تھے۔ وہ اپنے دل کے سناٹوں سے ڈر گئی۔

آج اس کے دل کی ویرانیاں حد سے سوا تھیں۔ وہ کپڑے بدلے بغیر ستر پر گر گئی اور دونوں ہاتھوں سر تھامے ہوئے زیر لب بولی۔

''درد وہ سنگ گراں ہے کہ پگھلتا ہی نہیں۔''

نگاہوں پہ تاریک سا دھواں امڈ آیا۔

دھوئیں کے اس پار جانے پہچانے سے سائے لرز رہے تھے۔ خموشی و درد دل کی رازدان بن گئی تھی۔

باہر ہلکے جھونکوں کی کراہوں سے فضا کانپ رہی تھی۔ دم بخود پتے ہوا کے جھٹکوں سے چونک پڑتے تھے۔

ساعتوں کی راہ گزر پر بڑی گمبھیر خاموشی طاری تھی اور اندر..... یادوں کی راہ گزر پر چلتے ہوئے اس کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

معلوم نہیں احساس جرم سے یا احساس درد

سے!

ظفر سے اس کی پہلی ملاقات ایک فنکشن میں ہوئی تھی۔ جب بھی خزاں کی آخری شام تھی وہاں جہاں زمین و آسماں چپ چاپ گلے مل رہے تھے۔ زرد اور نارنجی سی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔

مغرب کی سمت آسمان پر بڑا المناک سکوت طاری تھا۔ زمین سے آسمان تک ایک افسردہ سا غبار اڑ رہا تھا۔ زرد پتوں اور جھلسی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان ہوا کی سرسراہٹیں بہت مدھم تھیں۔ مردہ شاخوں میں سہمی سہمی سی حیات آہستہ آہستہ کروٹیں لے رہی تھیں۔

خزاں کی جاتی ہوئی رات بہار کی رت کی آہٹیں سن کر بار بار چونک پڑتی تھی اور ایسے میں جب ارمغان نے درد بھرا نغمہ چھیڑا تو شرینہ بری طرح جھنجلا گئی اور اس کے قریب جا کر بولی۔

''خدا کے لیے ارمغان! کوئی خوشی کا نغمہ سناؤ۔ یہ خوشی کا موقع ہے۔''

''ارمغان اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''مگر یہ بھی تو دیکھو موسم کس قدر اداس ہے۔''

''موسم تو ہے ہی اداس اب تم اس اداسی میں مزید اضافہ تو مت کرو۔''

''پھر تم ہی کوئی خوشی کا نغمہ سنا دو۔''

''میری آواز اگر اتنی بھونڈی نہ ہوتی تو کسی کو مجھ سے گانے کی فرمائش کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی میں خود ہی شروع ہو جاتی۔''

ارمغان کی صاف گوئی پر ہنس پڑا پھر شرینہ کی فرمائش پر اس نے ایک بڑا چہکتا ہوا گیت سنایا۔ شرینہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

خزا کا موسم، درد بھرے گیت، سناٹے اور ویرانیاں، خاموشی، اداسی، آنسو اور سسکیاں..... یہ سب کچھ شرینہ کو بچپن سے ناپسند تھے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی تمنائی تھی۔

بہار کا موسم، خوشی، مسرت سے بھرپور قہقہے اور قہقہے کی مسکراہٹیں..... یہی اس کی زندگی تھی۔ وہ حسن کی شیدائی تھی اور اپنی عمر کے ایک ایک لمحے کی قیمت وصول کرنے کو زندگی کا فلسفہ سمجھتی تھی۔

جو لمحہ بیت گیا وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس ایک لمحے سے انسان اتنا فائدہ اٹھائے کہ اس کے گزر جانے پر کوئی ملال، کوئی رنج اور کوئی حسرت دل میں نہ رہ جائے۔

اسی اساس پر وہ اپنی زندگی گزارنا چاہتی تھی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کرتی تھی۔

ارمغان کا نغمہ ختم ہوا تو اس نے اپنا من پسند ریکارڈ لگایا اور جب وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو سامنے کرسی پر کوئی اجنبی صورت نظر آئی۔

اس نے تکلف کو بالائے طارق رکھ کر پوچھا۔

''آپ کی تعریف؟''

''مجھے ظفر محمود کہتے ہیں۔''

''آج سے پہلے تو کبھی ہماری محفلوں میں آپ نظر نہیں آئے۔''

''اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا بدقسمتی؟'' ظفر مسکرایا۔

''یہ سراسر آپ کی بدقسمتی تھی جو آپ ان محفلوں سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔'' شرینہ نے جلدی سے کہا۔

''بہت خوب!'' ظفر کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''خیر! شکر کیجیے کہ آپ کی بدقسمتی کے دن تھوڑے تھے۔'' ظفر کو ہنسی آ گئی۔

''ویسے آپ بیچتے کیا ہیں؟''

ظفر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی! کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کیا کرتے ہیں؟''

''اوہ!..... یہ مطلب تھا تو حضور! میں دوائیں بیچتا ہوں۔''

''دوائیں بیچتے ہیں یعنی کیمسٹ ہیں۔''

''جی نہیں کیمسٹ کا بڑا بھائی ہوں۔''

''یعنی؟''

''ڈاکٹر ہوں۔''

''اچھا آآآ!.....تو آپ ڈاکٹر ہیں۔'' شرینہ نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ کیا شکل سے بھنگی نظر آتا ہوں۔''

''نہیں تو.....لیکن.....''

''لیکن؟''

''ولایت پلٹ ڈاکٹر ہیں؟''

''آپ کی دعا سے۔''

''ویسے بائی داوے! روزانہ کتنی قبروں میں اضافہ کرتے ہیں؟''

''کبھی حساب نہیں رکھا۔ اب آئندہ سے حساب کتاب رکھوں گا تاکہ آپ کا سوال سن کر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

''بہت دلچسپ آدمی ہیں آپ! بالکل میری طرح۔''

''نوازش ہے محترمہ! آپ کی۔''

''شرینہ کا من پسند ریکارڈ ختم ہونے کو تھا اور اسے ہوش ہی نہیں تھا پھر امجد نے آکر ان دونوں کا تعارف کروایا۔ وہ امجد کے قریبی دوستوں میں تھا۔ وطن واپس آئے بمشکل تمام ایک سال ہوا تھا اور اس کی مصروف زندگی ایسے کسی فنکشن میں شریک ہونے کی اجازت بمشکل تمام ہی دیتی تھی۔ وہ اپنے مریضوں اور اپنے پیشے میں مگن رہتا تھا۔

اس روز تقریب کے اختتام تک شرینہ ظفر کے ساتھ ہی رہی۔ باقی لوگوں کو یہ شکایت ہی رہی کہ شرینہ نے آج انہیں بالکل لفٹ نہیں دی لیکن شرینہ بھی کیا کرتی؟ پوری محفل میں اس روز ظفر سے اچھا کوئی بھی نہیں لگا وہ اس کا ہم مزاج بھی تھا اور ہم ذوق بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے متعلق بڑی تفصیلی سے باتیں کرڈالیں۔

گھر واپس آتے ہوئے ظفر کی نگاہوں میں وہی ایک سراپا تھا۔ آتشی گلابی جھلملاتی ہوئی ساری میں لپٹا ہوا نازک جسم، مسکراتا ہوا تابناک چہرہ اور زندگی سے بھرپور ہنسی۔ ظفر نے سوچا۔

''اور شاید اس کی ہم نشینی کا اثر تھا جو میں بھی اس قدر شوخ اور حاضر جواب ہوگیا تھا ورنہ میرے دوست تو میری سنجیدگی سے عاجز ہیں۔''

وقت رخصت شرینہ نے کہا۔

''مجھے یقین ہے آپ دوبارہ مجھ سے ملنا چاہیں گے۔'' ظفر نے بلاوجہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''جی! کیا فرمایا آپ نے؟''

شرینہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''اور اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہر اگلی ملاقات کے بعد آپ کی خواہش شدید تر ہوتی جائے گی۔''

''کس بات کی خواہش؟''

''یہی مجھ سے ملنے کی۔'' شرینہ نے بے پروائی سے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

''آپ کی ہماری فرینڈ شپ جو ہوئی ہے آج۔''

''کیا واقعی؟''

''جی یقیناً۔''

اور ظفر حیران رہ گیا۔

کس قدر اعتماد تھا اس کے لہجے میں.....کس قدر یقین تھا اسے اپنے آپ پر اور کتنا مان تھا اسے اپنی شخصیت پر.....اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ اس پر اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ وہ پوری محفل میں چھا جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ظفر نے بہت چاہا، اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس لڑکی کو بالکل یاد نہ کرے۔ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ظفر کو یقین تھا کہ چاہت یا محبت کی قسم کے کسی بھی جذبے نے اس کے دل میں ہرگز جنم لیا ہے مگر اس نے دل ہی دل میں اس بات کا اعتراف بڑی

فراخ دلی سے کرلیا تھا کہ شرینہ وہ پہلی لڑکی ہے جس نے اسے متاثر کیا ہے۔

اس کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں، اس کا انداز گفتگو دل نشین ہے۔ وہ اپنوں کی سی بے تکلفی سے باتیں کرتی ہے۔ اس کے قریب بیٹھ کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ظفر نے سوچا وہ شرینہ سے خود ملنے ہرگز نہیں جائے گا۔ وہ اسے ٹیلی فون بھی نہیں کرے گا۔

گزشتہ دو ہفتوں میں اس نے ان دو باتوں کا فیصلہ کتنی ہی بار کیا تھا لیکن جب بھی شرینہ کی شبیہہ صبح کے تارے کی مانند اس کی نگاہوں کے سامنے جھلملائی اس کا فیصلہ متزلزل ہوگیا اور وہ خود کو لعنت ملامت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے سوچا۔ ''وہ آخر کیوں اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا چاہتا ہے؟..... وہ اس کے یقین کو کیوں پاش پاش کرنا چاہتا ہے؟..... وہ اس کے مان کو کیوں توڑنا چاہتا ہے؟..... وہ جس کی فطرت میں بچوں کی سی معصومیت ہے..... وہ جس کی باتوں میں تصنع اور بناوٹ کی جھلک تک نہیں نظر آتی..... اسے تکلیف پہنچا کر میرے دل کے کون سے جذبے کو تسکین ملے گی؟

اور ایک شام اپنے کلینک میں بیٹھے ہوئے شرینہ کا خیال ہوا کے نرم جھونکے کی مانند اس کے دماغ سے ٹکرایا۔ اس نے شرینہ کا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کوئی مردانہ آواز تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ شرینہ کے بارے میں پوچھتے ہوئے ہچکچایا لیکن پھر اس نے سوچا..... شرینہ نے بغیر سوچے سمجھے تو مجھے اپنا نمبر نہیں دیا ہوگا یہ خیال آتے ہی اس نے کہا۔

''مجھے شرینہ عارف سے بات کرنا ہے۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہولڈ آن پلیز۔''

چند سیکنڈ بعد شرینہ کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو''

''میں ظفر محمود بات کر رہا ہوں۔''

''آداب! ظفر صاحب۔''

''آداب کے جواب میں کیا کہوں؟''

''جو دل چاہے کہہ دیجیے۔''

ظفر زیر لب مسکرا دیا۔

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''کلینک سے۔''

''ابھی تک بیٹھے ہیں۔''

''بس اب گھر ہی جانے والا ہوں۔''

''اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے گھ آجایے۔''

''کہیں آپ کے ڈیڈی نکال باہر نہ کریں۔''

''ارے نہیں..... وہ بہت اچھے آدمی ہیں او آپ سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔''

''پھر آپ کی ممی ضرور خبر لیں گی میری۔''

''وہ تو بہت سویٹ ہیں۔''

''آپ کے لیے سویٹ ہوں گی۔ ضروری نہیں کہ میرے لیے بھی.....''

''آپ آکر تو دیکھیے۔''

''اچھا! پھر کسی دن سہی۔''

''نہیں!..... آج ابھی اور اسی وقت''

''آپ حکم دے رہے ہیں۔''

''نہیں، درخواست کر رہی ہوں۔''

''اچھا! ذرا اپنا ایڈریس ایک بار پھر سمجھایے۔''

شرینہ نے بڑی تفصیل سے اپنا ایڈریس سمجھایا۔ ظفر کو اس کی کوٹھی تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی تو اس نے شرینہ کو ریلنگ کے قریب اپنا منتظر پایا۔ برآمدے کی تیز روشنیوں میں اس کا سراپا کچھ اور دل کش لگ رہا تھا۔ ہونٹوں پر وہی شگفتہ سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

اور پھر چند ہی منٹ بعد ظفر ڈرائنگ روم میں شرینہ کے بھائیوں، بڑی، بہن اور ممی ڈیڈی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بڑی جلدی اور اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ ان کی فیملی بہت ماڈرن ہے لیکن

ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اسے بوریت کا احساس بالکل نہیں ہوا۔ شرمینہ کا گھر میں جو مقام تھا وہ بھی ظفر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ ممی اپنے پیار کے موتی نچھاور کر رہی تھیں۔ ڈیڈی کی نگاہوں سے شفقت چھلکی پڑی تھی۔ تہمینہ آپا نثار ہوئی جا رہی تھیں اور دونوں بھائیوں کا حال بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔

کتنی خوش قسمت ہے شرمینہ! ظفر نے سوچا۔

''وقت گزر گیا اور دونوں کی ملاقاتوں کے لیے راہ کچھ اور ہموار کر گیا۔ ظفر کراچی میں تنہا رہتا تھا۔ اس کی امی زیادہ تر پنجاب میں اپنے بڑے بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ کراچی کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی۔ کوئی نہ کوئی بیماری ان کا پیچھا پکڑ لیتی تھی لیکن ظفر کی بہنوں میں سے بھی صرف ایک بہن کراچی میں تھی جو اپنے سسرال کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ ملازموں کے معاملے میں ظفر خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ اسے کبھی کپڑوں اور کھانے پینے کے سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی تھی گھر بھی ہمیشہ شیشے کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ گھر والوں سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا ہے۔

ایک دن ظفر نے شرمینہ اور اس کے گھر والوں کو اپنے ہاں کھانے کے لیے مدعو کیا۔ ممی اور ڈیڈی نے خاصا تکلف کرنے کی کوشش کی لیکن ظفر کے اصرار کے آگے ان کی ایک نہ چلی شرمینہ اس دن گزشتہ دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ نیوی بلو ساڑی میں اس کا سرو قد کچھ اور نمایاں لگ رہا تھا۔ شرمینہ کے گھر والے ظفر کے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور نفاست کو سراہ رہے تھے۔ اور آپس میں ہی تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

ظفر نے شرمینہ کے قریب جھک کر کہا۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں؟''

''ضرور کہیں۔''

''آج آپ بے حد اچھی لگ رہی ہیں۔''

شرمینہ اپنی تعریف سن کر نہ شرمائی نہ لجائی بلکہ اداس ہو جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

''صرف آج؟...... مجھے تو یہ خوش فہمی تھی کہ میں آپ کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں۔''

ظفر نے مسکرا کر کہا۔

''یہ لباس آپ پر بہت اچھا لگتا ہے۔''

''پھر وہی بات جب کہ مجھے یہ خوش فہمی بھی ہے کہ میں جامہ زیب ہوں۔ جو لباس بھی پہن لوں......''

''ممکن ہے آپ کی خوش فہمی درست ہو۔ میں نے آپ کو ساری ٹراؤزر اور میکسی کے علاوہ اور کسی لباس میں دیکھا ہی نہیں۔''

''اچھا! ایک بات اور سن لیجیے۔''

''جی! سنایئے۔''

''میں اپنی تعریف سن کر مائنڈ وائنڈ بالکل نہیں کرتی بلکہ بے حد خوش ہوتی ہوں۔''

ظفر بے ساختہ ہنس دیا۔

'' پھر تقریباً آٹھ دس دن تک ظفر بے حد مصروف رہا نہ وہ شرمینہ کے گھر جا سکا اور نہ ہی شرمینہ نے اسے فون کیا۔ اس نے ارادتاً ایسا نہیں کیا تھا لیکن اس روز جب وہ کلینک سے گھر واپس آ رہا تو اس نے برآمدے کی ریلنگ کے قریب شرمینہ کو اپنا منتظر پایا وہ حیران رہ گیا۔

''آپ کب آئیں؟''

''بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔'' شرمینہ کا موڈ کچھ بہت زیادہ خوش گوار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ ظفر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''خیریت تو ہے؟''

''کیوں؟ آپ کو خیریت نظر نہیں آتی؟''

''آج مطلع ابر آلود ہے۔''

شرمینہ نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

''گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔'' ظفر مسکرایا۔
''تو پھر ان گھٹاؤں کے برس جانے کا انتظار کیجیے۔''
''کب تک؟''
''جب تک انتظار کرنے کی ہمت ہے۔''
''سچ پوچھیں تو مجھ میں انتظار کرنے کی بالکل بھی ہمت نہیں۔''
شرمینہ چپ چاپ ظفر کی طرف دیکھتی رہی۔ ظفر جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ہلکے چمکدار بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ سرک کر اس کی پیشانی پر آ گئی پھر ایک دم اس نے نگاہیں اٹھا کر شرمینہ کی طرف دیکھا اور بولا۔
''آپ اندر نہیں آئیں گے؟''
''نہیں۔''
''کیوں؟''
''میں گھر واپس جاؤں گی۔''
''تو پھر آئیں کیوں تھیں؟''
''آپ کو دیکھنے۔''
''کیوں..... مجھے کیا ہو گیا تھا؟''
''یہی دیکھنے آئی تھی کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''
''میں سمجھا نہیں؟''
''اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی مزید سمجھانے کی ضرورت ہے؟''
''شرمین!''
''ظفر ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ شرمینہ کی جھلکی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔
''موڈ اتنا خراب کیوں ہے؟''
''آپ نے خراب کر دیا ہے۔''
''میں نے؟'' ظفر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔
''اور پھر کس نے کیا ہے؟''
''میں نے کوئی بات نہیں کی۔ دس دن بعد تو آج میری ملاقات ہوئی ہے آپ سے۔''
''شکر ہے آپ کو اس بات کا احساس تو ہے۔''
''اوہ! اس بات کا غصہ ہے۔'' ظفر مسکرایا۔
''میں اتنی بیمار ہو گئی تھی۔ آپ نے خبر تک نہیں لی۔''
''واقعی کچھ کمزور نظر آ رہی ہیں۔''
شرمینہ پلٹ کر لان میں بکھرے ہوئے پتوں کو دیکھنے لگی۔
''کیا طبیعت خراب ہو گئی تھی آپ کی۔''
شرمینہ خاموش رہی۔
''آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔''
شرمینہ پھر کچھ نہ بولی۔
ظفر بھی ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شرمینہ نے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک دم مسکرا دی۔
ظفر نے پوچھا۔ ''غصہ ختم ہو گیا؟''
''ہاں۔''
''اتنی جلدی؟''
''بس! آپ سے ناراض ہونے کو دل نہیں چاہتا۔''
''پھر ابھی کیسے ناراض ہوئی تھیں؟''
''بہت جبر کرنا پڑا تھا اپنے اوپر۔''
شرمینہ نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔
پھر دونوں لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''کیوں نہیں آئے تھے آپ؟'' شرمینہ نے پوچھا۔
''بہت مصروف تھا۔''
''ٹیلی فون کرنے کا وقت بھی نہیں تھا؟''
''آپ نے کیوں نہیں کیا؟''
''میں تو بیمار تھی۔''
''بیماری ٹیلی فون کرنے کو تو منع نہیں کرتی؟''
شرمینہ خاموش رہی وہ ظفر سے یہ کیسے کہہ دیتی کہ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ظفر کو اس کا کتنا خیال ہے؟

شرمینہ بہت تھوڑی دیر ظفر کے پاس ٹھہری۔ ظفر سے گلے شکوے کرنے کے بعد اس کا موڈ ٹھیک ہوگیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح شگفتہ وشاداب ہوگئی۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے شرمینہ نے پوچھا۔

''اب آپ کب آئیں گے؟''

''میں نہیں آؤں گا۔''

''کیوں؟''

''آپ آیئے گا۔''

''اچھا۔''

شرمینہ نے الوداعی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ظفر کافی دیر تک لان میں بیٹھا رہا اور شرمینہ کا خیال ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ذہن سے جدا نہ ہوسکا اسے پورے طرح احساس تھا کہ ادھر کچھ دنوں سے اس کی سوچوں کے انداز بدل گئے ہیں۔

ایک سایہ تھا جو ہر لمحے اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ شرمینہ کے جذبات بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ دل کے جذبوں کو الفاظ کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یوں ملتے رہنا ظفر کو پسند نہیں تھا۔

وہ ان مردوں میں سے نہیں تھا جو محض فلرٹ کیا کرتے ہیں۔ سمٹے اجالوں اور پھیلتے اندھیروں کے ان خاموش لمحات میں اس نے فیصلہ کیا کہ.....

اگر ان کی منزل ایک ہے تو پھر وہ اپنے لیے کسی راہ کا تعین کیوں نہیں کر لیتے؟

زندگی صرف مختصر سی ملاقاتوں کے سہارے تو بسر نہیں کی جاسکتی۔ میں اب کس بات کا منتظر ہوں؟

کیا اس بات کا کہ شرمینہ اپنی زبان سے اپنی چاہت کا اعتراف کرے؟

وہ لاکھ ماڈرن سہی مگر ہے تو ایک لڑکی۔ مجھے اس سے ایسی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔

اگلے روز کلینک سے اٹھتے ہوئے اسے نو بج گئے۔ وہ الجھ رہ گیا۔ شرمینہ کے پاس جائے یا نہ جائے؟

آخر کار اس نے شرمینہ کو فون کیا۔ شرمینہ بھی اس کی منتظر ہی تھی اس کی آواز سن کر اپنی دل مسرت کو چھپا نہ سکی۔

''مجھے یقین تھا آج آپ ضرور فون کریں گے۔''

''اچھا کیوں؟''

''یہ بھی اظہار ندامت کا ایک طریقہ ہے نا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''پچھلے پورے ہفتے آپ نے فون جو نہیں کیا۔''

''آپ کے خیال میں آج فون کر کے میں نے اس کی تلافی کی ہے۔''

''جی ہاں۔''

''میں آپ کی طرف آجاؤں؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا! اس وقت آپ مصروف تو نہیں ہیں؟''

''جی نہیں''

''اچھا بس پھر دس پندرہ منٹ انتظار کیجیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شرمینہ نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

ظفر جب شرمینہ کے گھر پہنچا تو تہمینہ آپا اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تہمینہ آپا چند منٹ ان کے پاس بیٹھ کر چلی گئیں۔ ڈرائنگ روم میں کچھ دیر بالکل سکوت طاری رہا پھر ظفر نے کہا۔

''آج میں آپ سے چند خاص باتیں کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''لیکن میں تو عام باتیں سننے کے موڈ میں ہوں۔''

''شرمین! پلیز بی سیریس۔''

شرمینہ کو ہنسی آگئی۔

''اچھا! پھر میں چلتا ہوں۔'' ظفر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں، میں بالکل سیریس ہوجاتی ہوں۔ آپ کہیں۔'' شرمینہ کے ہونٹوں پر بھی

مسکراہٹ تھی۔
ظفر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور قریب آگیا۔
''ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے شرمین؟''
''جب تک آپ ملنا چاہیں۔''
''لیکن میں۔ یہ سلسلہ اب ختم کرنا چاہتا ہوں۔''
''کیوں؟'' شرمینہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ظفر منہ پھیر کر مسکرایا۔
''آخر ہم کیوں ملیں؟ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے؟''
''ہماری آپ کی فرینڈ شپ نہیں ہے۔''
''ہاں آں!...... لیکن اس طرح ملنا مجھے پسند نہیں ہے۔'' شرمینہ خاموش کھڑی کھلے ہوئے دریچے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ظفر کی نگاہیں اس کے صبیح و ملیح چہرے پر تھیں۔ جس کی آب و تاب شاید انجانے وسوسوں سے اس وقت ماند سی پڑ گئی تھی۔ ظفر نے آہستہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھوں ہلایا۔
''کہاں پہنچ گئی ہیں آپ واپس آیے۔''
''شرمینہ چونک پڑی۔
''کل رات میں نے اپنی زندگی کا بڑا اہم فیصلہ کیا ہے۔''
''اچھا!'' شرمینہ کی آواز مدھم تھی۔
''آپ پوچھیں گی نہیں؟...... میں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''
''معلوم نہیں۔ آپ بتانا چاہیں گے یا نہیں؟''
''آپ پوچھ کر تو دیکھیں۔''
''اچھا پھر بتا دیجیے۔''
''پہلے ایک بات مجھے پوچھنے دیجیے۔''
''پوچھیے۔''
''ہم اتنے دنوں سے مل رہے ہیں۔ آپ کے دل میں، میں نے کوئی مقام حاصل نہیں کیا؟''
''تعجب ہے آپ کو اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟''
''اب بھی سے کیا مراد ہے آپ کی؟''
''آپ خود کیا محسوس کرتے ہیں؟''
''میرے محسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے؟...... میرا اندازہ تو غلط بھی ہو سکتا ہے۔''
''آپ کا اندازہ غلط سہی لیکن میں آپ سے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتی کہ روز اول بھی آپ کے لیے میرے جذبات پسندیدگی کے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ان جذبات میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی۔''
''اس صاف گوئی اور اعتراف چاہت کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔''
''آپ کے ممنون ہونے یا نہ ہونے سے ان جذبات میں کمی نہیں آسکتی۔''
''اچھا تو یہ بات ہے شرمین بیگم کہ......''
شرمینہ نے اس کی بات کاٹی۔
''اوہ آئی ڈونٹ لائیک ورڈ بیگم''
''لیکن مجھے پسند ہے۔''
''فرینڈ شپ یا دوستی ایک بالکل مختلف چیز ہے شرمین عارف! اور زندگی کا ہم سفر بننا قطعی دوسری بات ہے۔''
شرمینہ خاموش ہوگئی۔
''آپ سے مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ ان ملاقات کی حدود کو صرف دوستی تک رکھنا چاہتی ہیں یا پھر اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں ہم دونوں کوئی سمجھوتا کرلیں۔''
''اس کا انحصار آپ کے اوپر ہے۔'' شرمینہ سیریس ہوگئی۔
''یعنی؟''
''آپ جو بھی فیصلہ کریں میرے قابل قبول ہوگا۔''
''اوہ! بولڈ گرل......!''
ظفر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس لمحے اسے شرمینہ پر بے پناہ پیار آیا۔

شرینہ اس کی نگاہوں کے والہانہ پن کو نظر انداز کر کے دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔

''میں نے اپنی امی کو خط لکھا ہے وہ عنقریب کراچی آئیں گی۔''

''اچھا۔''

''مجھے یقین ہے وہ میرے ماڈرن ہونے پر اعتراض نہیں کریں گی۔''

''شاید لیکن میں انہیں سمجھالوں گا۔''

''وہ کس طرح؟''

''تم ابھی بچی ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ تم میں یقیناً تبدیلی آئے گی۔''

شرینہ خاموش رہی۔

''کیا ایسا نہیں ہوگا؟ ..... مجھے بہت بھروسا ہے۔''

''شرینہ آہستہ سے سر ہلا کر رہ گئی۔ چند سیکنڈ وہ سر جھائے بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی رہی اور جب اس نے ظفر کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں کے انداز محسوس کر کے بولی۔

''آپ اس طرح تو نہ دیکھیے مجھے کہ میں خواہ مخواہ شرمانے لگوں۔''

ظفر نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر آہستہ سے تھپکی دی اور خدا حافظ کہہ کر جانے لگا۔

''کھانا کھا کر جایئے گا۔''

''نہیں میرا خانساماں بہت ناراض ہوتا ہے۔ اگر میں گھر جا کر کھانا نہ کھاؤں۔''

''تھوڑا سا کھا لیجیے۔''

''نہیں پھر کبھی سہی۔''

''اچھا۔ خدا حافظ۔''

وہ ظفر کو رخصت کرنے کے لیے باہر آ گئی۔

پھر تہمینہ آپا کی شادی کے ایک ماہ بعد ہی شرینہ، شرینہ ظفر بن گئی اور وہ سارے لوگ..... جو شرینہ کو دل میں بسائے بیٹھے تھے ظفر ان کے لیے قابل رشک بن گیا۔

انہوں نے اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ نہ کر سکے۔ کچھ نہ کہہ سکے۔

شرینہ نے ان میں سے کسی سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی کسی کے لیے اس انداز سے نہیں سوچا۔

اس نے پہلی دفعہ ظفر کو ہی اپنی شریک زندگی کی حیثیت سے دل میں جگہ دی تھی۔

وہ تمام لڑکے صرف اس کے دوست تھے اور کچھ نہیں۔

شادی کے موقع پر ظفر کے تمام بھائی بہنیں جمع ہوئے تھے۔ ظفر کی امی شادی کے بعد تقریباً تین چار ماہ تک کراچی میں رہیں۔ شرینہ کے چاؤ چونچلے اٹھانے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر وقت سر آنکھوں پہ ہی بٹھانے کی کوشش کرتی رہیں۔ شرینہ نے بھی ان کے سامنے اتنی تابعداری اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا ظفر کو حیرت ہونے لگی۔ اس کے دل میں شرینہ کے لیے محبت کچھ اور بڑھ گئی۔

زندگی بہت پرسکون اور خوش گوار گزر رہی تھی۔

چار ماہ کا عرصہ بڑی جلد ہی گزر گیا۔ ظفر کی امی کے لاہور چلے جانے کے بعد شرینہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ ظفر زیادہ تر وقت کلینک میں گزرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ شرینہ کی طرف سے بے پروائی یا غفلت برتنے لگا تھا۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کے دل میں شرینہ کی محبت کم ہو گئی تھی مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے مریضوں کو چھوڑ کر ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہے یا سیر و تفریح کرتا رہے۔

شرینہ نے اپنی زندگی کسی اور انداز سے گزاری تھی۔ کلب، پارٹیز، ہوٹل، پکچر، پکنک..... ان چیزوں کو اس کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ کلب کی وہ باقاعدہ ممبر تھی۔ اس کے دوستوں کی تعداد بھی کوئی کم نہ تھی۔ ظفر اسے ہوٹل میں لنچ یا ڈنر کے لیے جا سکتا تھا اور لے بھی جاتا تھا۔ ہفتے میں دو دفعہ فلم دکھانے بھی لے جاتا تھا لیکن روزانہ کلب جانا، پارٹیز اٹینڈ کرنا، پکنک پر جانا..... یہ

سب کچھ اس کے بس سے باہر تھا۔ زندگی کو اتنے ہنگامہ خیز طریقے سے گزارنا اسے ناپسند تھا۔ شرینہ کے دو تین اچھے دوستوں سے ملنے پر ظفر کو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن پورے کھیپ کی کھیپ آ کر ہلڑ بازی کرے اس وقت کو وہ گوارہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شرینہ اس سلسلے میں بہت زیادہ قصوروار نہیں ہے کیوں کہ اس کے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ شرینہ ایک دم اپنی عادتوں کو بدل دے اور یہ ناممکن بھی تھا۔

لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ شرینہ آہستہ آہستہ اپنے تمام نامعقول قسم کے دوستوں سے کنارہ کرلے۔ وہ کسی لیڈیز کلب کی ممبر ہوتی تو ظفر کو کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر وہ جس کلب کی ممبر تھی وہاں پر ہر کردار کے ممبر آتے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو کسی لڑکی یا عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یا اس کی عزت کرتے تھے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں بے پناہ تضاد تھا۔ سامنے تو اس طرح ملتے تھے جیسے وہ اس لڑکی کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن پیٹھ پیچھے اس لڑکی کے لیے فحش فحش باتیں کہنے میں انہیں کوئی عار نہیں تھی۔ کسی بھی لڑکی کے بارے میں بڑے سے بڑا اسکینڈل کھڑا کردیا جاتا۔ لڑکیوں کے کپڑوں اور جسموں پر وہ اس انداز سے تبصرہ کرتے تھے جیسے منڈی کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں گفتگو کررہے ہوں۔ اس میں لڑکی یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی چاہے کوئی عورت ان کی ماں کے برابر ہی ہو یا کوئی ان کی بیٹی کے برابر ہو۔ وہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے تھے۔ وہاں آنے والے بیشتر مردوں اور عورتوں کی حمیت سو چکی تھی۔ ان کے نزدیک فیشن ایبل طبقے میں یہ سب کچھ جائز تھا لیکن ظفر کی غیرت اور حمیت ابھی زندہ تھی۔

اسے معلوم تھا کہ شرینہ کی فطرت میں بے پناہ بچپنا ہے اسے راہ راست پر لانے کے لیے سختی سے نہیں نرمی سے، جبر سے نہیں پیار و محبت سے کام لینا پڑے گا یوں بھی اس کی فطرت میں جبر اور سختی بالکل نہیں تھی۔ اس نے شرینہ کو سمجھانے کے لیے فطرتاً نرمی اور پیار سے کام لیا۔

ایک روز ظفر کلینک سے واپس آیا تو شرینہ کا موڈ اسے خاصا خراب محسوس ہوا وہ بے حد جھنجلائی ہوئی سلیولیس میکسی پہنے، بالوں کو خوب صورت انداز سے سنوارے، ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی پسندیدہ ریکارڈ سن رہی تھی۔ ظفر کی گاڑی کا ہارن سن کر بھی وہ معمول کے مطابق اس کا استقبال کرنے کو باہر نہیں آئی۔ ظفر اس تبدیلی پر حیرت زدہ سا ہوا اور وہ سوچ میں ڈوبا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ دریچے کے پردے سرکے ہوئے تھے۔ سامنے ہی صوفے پر شرینہ بیٹھی ہوئی تھی۔

کس قدر روپ تھا اس کے چہرے پر۔ ظفر کی نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔

مگر..... وہ کتنی بے نیازی سے بیٹھی تھی۔

اس نے صرف ایک دفعہ سرسری نگاہ سے ظفر کی طرف دیکھا۔ ظفر کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ تھی۔

شرینہ لاتعلق ہوکر ریکارڈ کیس میں سے ریکارڈ سلیکٹ کرنے لگی۔

اس انداز بے رخی پر ظفر کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح بیٹھی تھی۔

ظفر آہستہ قدموں سے اس کے قریب آ گیا اور بڑی نرمی سے اس کے شانوں کو چھوڑا۔

''شرینہ پھر بھی بے حس بنی بیٹھی رہی۔

''شرمین! ظفر نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا۔

شرمین خاموش رہی۔

''موڈ کیوں خراب ہے؟''

وہ پھر بھی چپ رہی۔

''کیا غلطی ہوگئی مجھ سے؟''

''یہ بھی میں ہی بتاؤں؟'' شرمین کی چمکتی ہوئی پیشانی پر شکنیں تھیں اور اگلے ہی لمحے ظفر کو یاد آ گیا کہ شام کو کلینک جاتے ہوئے شرینہ نے اس سے جلدی

گھر آنے کو کہا تھا۔ کلب میں کوئی خاص فنکشن تھا۔ شرمین اس میں شرکت کرنے کے لیے بے تاب تھی۔ ظفر نے وعدہ تو نہیں کیا تھا یہ ضرور کہا تھا کہ وہ جلد آنے کی کوشش کرے گا لیکن کلینک جا کر اسے کچھ یاد نہیں رہا اور شرمین ٹیلی فون خراب ہونے کی وجہ سے اسے یاد دہانی نہ کرا سکی۔ اس کا انتظار ہی کرتی رہی گئی۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ظفر نے کہا۔

''ویری سوری شرمین! میں بالکل بھول گیا تھا۔''

''ہاں سوری کہہ دینا بہت آسان ہے۔''

''اب چلتے ہیں، ہم بہت زیادہ لیٹ تو نہیں ہوئے۔''

''نہیں اب میں جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''بس موڈ خراب کر کے کہیں جانا مجھے سخت ناپسند ہے۔''

''کیوں؟''

''میں اپنے خراب موڈ کی وجہ سے اپنے دوستوں کو بور نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم پروگرام دیکھنے جا رہی ہو، اپنے دوستوں سے ملنے تو نہیں۔''

''کوئی سامنے آ گیا تو دامن تو نہیں بچاؤں گی۔''

''چلو پھر کبھی سہی! کلب میں تو آئے دن فنکشن ہوتے رہتے ہیں۔''

''مجھے یقین ہے میرے ساتھ ہر فعہ ٹریجڈی ہوگی۔''

''ظفر بے ساختہ ہنس پڑا اور بات ٹالنے کے لیے بولا۔

''کبھی کبھی گھر میں بیٹھنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ کتنا سکون ہوتا ہے گھر میں۔''

''تمہیں اچھا لگتا ہوگا۔ میرا تو دم گھٹتا ہے شام کے وقت گھر میں۔''

''بس! اب غصہ تھوک دو۔ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔''

''نہیں،'' شرمین نے صاف انکار کر دیا۔

ظفر نے اسے بمشکل تمام منایا۔

''کس قدر بچپنا ہے تمہاری فطرت میں۔'' ظفر نے کہا۔ شرمینہ منہ پھیر کر مسکرا دی۔

''اتنا تنگ کرتی ہو تم مجھے پھر بھی جانے کیوں غصہ نہیں آتا۔ تمہارے اوپر۔'' ظفر نے والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس طرح مت دیکھا کرو میری طرف۔'' شرمینہ نے ٹوکا۔

''کیوں؟'' ظفر کی نگاہوں کا انداز اب بھی وہی تھا۔

''بہت اچھے لگنے لگتے ہو مجھے اور مجھے خواہ مخواہ ہی اپنے غصے کو رخصت کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اچھا! بس اب زیادہ شو میں مت آؤ۔'' شرمینہ نے اس کی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

ظفر کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

اس دن ظفر نے وقت کی نزاکت سے کام لے کر معاملے کو رفع دفع کر دیا لیکن اس کے بعد آئے دن اسی قسم کی جھڑپیں ان دونوں میں ہونے لگیں۔ شرمینہ کی سالگرہ کا دن قریب آ رہا تھا۔ ظفر کو معلوم تھا کہ وہ اپنی سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتی ہے۔ خود اسے اگرچہ یہ دھوم دھام پسند نہیں تھی لیکن شرمینہ کی خوشی کی خاطر ظفر نے وہ سارا اہتمام کیا جو اس کے گھر والے کرتے تھے۔ اپنی مرضی کے خلاف اس کے ان دوستوں کو بھی مدعو کیا جو اسے ناپسند تھے۔ بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور بہت اخلاق سے ان سے ملا لیکن بعد میں ان لوگوں نے جو طوفان بدتمیزی مچایا اس سے ظفر کے دل پہ ایک بوجھ سا آ گرا۔ رات تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ سب کے جانے کے بعد جب وہ دونوں بیٹھے تحفے دیکھ رہے تھے تو ظفر نے کہا۔

''شرمین! ایک بات پوچھوں؟''

''شرمین نے بڑے لاڈ سے کہا۔

''ہاں پوچھو۔''

''تمہیں ان ہنگاموں سے وحشت نہیں ہوتی؟''

''نہیں قطعی نہیں۔''

''میرا تو دل گھبراتا ہے۔''

''تمہیں عادت جو نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے یہی وجہ ہو۔''

''فکر نہ کرو۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی راہ پر لے آؤں گی۔''

''راہ اگر صحیح ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔''

شرمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تمہارا خیال ہے میں غلط راہ پر چل رہی ہوں؟''

''بہت سی باتوں کا احساس ہمیں وقت گزر جانے کے بعد ہوتا ہے۔''

شرمین نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں شرمین! تو میں تمہیں ایک مشورہ دوں..... تمہارے دوستوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے انداز واطوار میرے نزدیک کچھ مناسب نہیں ہیں۔''

''کون سے دوست؟''

''ظفر نے چند نام گنوائے۔

''کیا برائی ہے ان میں؟''

''تمہیں کوئی برائی نظر نہیں آتی؟''

''نہیں۔''

''پھر تو اس موضوع پر بات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔'' ظفر مسکرایا۔ شرمین نے سنی ان سنی کردی اور تحائف دیکھنے میں مشغول رہی۔

''سب سے اچھا تحفہ تمہارا ہے ظفر!''

''اچھا! تھینک یو۔'' ظفر اس کی طرف جھک کر بولا۔

شروع میں شرمین نے پوری کوشش کی کہ وہ کلب، پارٹیز اور پکچر میں ظفر کے بغیر نہ جائے لیکن ظفر اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب ان پروگرام میں شریک نہیں ہوسکتا تھا اور اس کی مصروفیات کی وجہ سے شرمین کو آئے دن اپنے پروگرام کینسل کرنا پڑتے تھے۔ اس کا موڈ سخت خراب ہوجاتا۔

وہ جھنجلا جاتی، ظفر سے ناراض، کھانا پینا چھوڑتی۔ ظفر کے پاس سوائے معذرت کرنے کے اور کوئی راہ نہ رہتی۔ جانے کتنے جتن سے وہ شرمین کو مناتا۔

ایک روز شرمین کو اپنے کسی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ فنکشن کا انتظام اس نے ایک بڑے ہوٹل میں کیا تھا۔ ظفر جانا نہیں چاہتا تھا اور شرمین اس کے بغیر جانے پر آمادہ نہیں تھی۔ دونوں میں طویل طویل بحث ہوئی۔ ظفر نے اسے سمجھانے کے تمام حربے استعمال کرلیے لیکن شرمین بھی کہ ظفر بھی ساتھ چلے۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟..... میں بالکل وقت نہیں نکال سکتا۔''

''کیوں نہیں نکال سکتے؟''

''اپنی مجبوری میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

''تمہیں تو اپنے کلینک کے علاوہ دنیا کی کسی بات سے کوئی مطلب نہیں ہے۔''

''اور کسی بات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن تم سے تو مطلب ہے۔''

''ہاں تمہیں میرا جتنا خیال ہے اس کا اندازہ مجھے اچھی طرح سے ہے۔''

''دیکھو! ایسی بات کہہ کر تم میری انسلٹ مت کرو۔''

''سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔''

''شرمین نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔''

ظفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیسے خواب؟''

''تمہیں ذرا سا بھی میرا خیال نہیں رہا۔ ذرا سی

محبت بھی نہیں رہی۔''

ظفر نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر وہی الزام تراشی؟''

''الزام تراشی کی کیا بات ہے؟''

''ہے کیوں نہیں؟''

''تمہارے اعصاب پر کلینک ایک بھوت کی طرح صبح وشام سوار رہتا ہے۔''

ظفر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اور اس کی پیشانی کو چومتی ہوئی لٹ پیچھے سرکاتے ہوئے بولا۔

''چھوڑو اس ذکر کو، کوئی اور بات کرو۔''

''اس وقت میری لٹ سنوارنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ظفر ہنس پڑا۔ ''کیوں نہیں ہے؟''

''اس وقت میری تمہاری لڑائی ہو رہی ہے۔''

''لڑائی ایک طرفہ طور پر تھوڑی ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب.....''

''مطلب یہ کہ میں نے تو جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں کی۔''

شرینہ نے ایک دم اپنا موڈ بدل کر کہا۔ ''ظفر پلیز! مان جاؤ نا! آج جلدی آجانا۔''

ظفر خاموش رہا۔

''تم نے اپنے کلینک میں اتنے سارے ڈاکٹر رکھ چھوڑے ہیں تم ان پر اتنا سا بھی ٹرسٹ نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے نہ ہونے پر.....''

ظفر اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ٹرسٹ کی بات نہیں ہے ڈیئر!''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ میری ذمے داری ان سب سے زیادہ ہے۔''

''شرینہ چند لمحے تک پلکیں جھپکائے بغیر ظفر کی طرف دیکھتی رہی پھر گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

''جاؤ میں نہیں بولتی تم سے۔''

''یہ حرکت تو میں تمہیں ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔''

ظفر نے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کی۔

''تم بھی مجھ سے بات نہ کرو۔''

ظفر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے روٹھنے کا انداز بالکل بچوں کا سا تھا۔

''اچھا، ایک بات سنو۔'' ظفر نے کہا۔

''سناؤ۔''

''میں وعدہ نہیں کرتا لیکن جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔''

''مگر بھول مت جانا۔''

''تم مجھے یاد دلا دینا۔''

''اچھا۔''

شرینہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

لیکن شام کو جب شرینہ نے اسے فون کیا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''سوری شرمین! میں نہیں آسکتا۔''

''کیوں؟'' شرینہ چیخ پڑی۔

''ایک بے حد سیریس کیس ہے۔ مریض کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔''

شرینہ مارے غصے کے کچھ بول ہی نہ سکی۔

''تم اکیلی چلی جاؤ۔ میری طرف سے معذرت کر دینا۔''

شرینہ نے طیش میں آکر ریسیور پٹخ دیا۔

ظفر جب واپس آیا تو شرینہ کا موڈ بے حد خراب تھا وہ اپنے بیڈروم میں تکیوں میں منہ چھپائے لیٹی تھی۔ ظفر کے قدموں کی آواز سن کر بھی وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

''شرمین!''

ظفر نے اسے اٹھایا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ظفر کا دل دکھ کر رہ گیا۔ وہ جانے کتنا روئی تھی؟..... آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اس نے سوچا۔'' میں اسے کیسے یقین

دلاؤں...... میں سچ مچ بے حد مجبور تھا۔"

ظفر نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ اس سے معذرت کی لیکن وہ اس سے بولنے پر بالکل آمادہ نہیں تھی۔

اس کے پاس ظفر کی ہر بات کا جواب خاموشی تھی۔ وہ اس کی طرف منہ پھیرے بیٹھی رہی پھر تنگ آ کر بولی۔

"تم اس وقت میرے پاس سے چلے جاؤ ظفر!"

"کیوں؟"

"مجھے بے حد غصہ آ رہا ہے۔"

"آنے دو۔"

"میں نہیں چاہتی کہ کہ غصے میں تم سے کوئی ایسی بات کہہ جاؤں جس پر بعد میں مجھے افسوس ہو۔"

"تو غصہ تھوک دو نا۔"

"ہاں! تم میرے دل کو تکلیف پہنچائے جاؤ اور میں برداشت کیے جاؤں، بس یہی زندگی رہ گئی ہماری؟"

"ظفر اس کے شانے پر ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"مجھے آنسو بہانے، لڑائی، جھگڑے اور غصہ کرنے سے نفرت ہے مگر تم مجھے مجبور کرتے ہوئے ان تمام باتوں کے لیے۔"

"ہاں شرمین! زندگی کا سارا سکون ختم ہو جاتا ہے ایسی باتوں سے۔" ظفر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"اس بات کا احساس ہوتے ہوئے بھی تم اپنی روش نہیں بدلتے۔"

"پھر تم ہی اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں سب سے ملنا چھوڑ دوں، گھر میں قید ہو کر بیٹھ جاؤں؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم کم سے کم لوگوں سے ملیں پھر ان بے کار قسم کی تقریبات سے ہمیں خود بخود نجات مل جائے گی۔"

"اوہ! مائی گاڈ...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارے سوچنے کا انداز اس قدر......!"

ظفر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو شرمین! شادی سے پہلے کی زندگی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس وقت تم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں لیکن اب تمہیں اپنا وے آف لائف بدلنا چاہیے۔"

"شرمینہ نے اس کے منہ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اس بس رہنے دو تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" ظفر نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے یہ دوست، یہ کلب، پارٹیز وغیرہ زندگی میں تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔"

"تمہیں کیا معلوم یہ تمام تفریحات مجھے کتنی خوشیاں دیتی ہیں۔ خوشی اور مسرت سے بڑی کیا چیز ہے دنیا میں؟"

"مجھے تو ڈر ہے یہ سب مل کر ہماری زندگی کا سکون نہ ختم کر دیں۔"

"ظفر ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گیا اور اٹھ کر دریچے کے قریب چلا گیا۔ شرمینہ خاموشی سے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ گرے پینٹ اور چیک دار شرٹ اس کے جسم پر بہت سج رہی تھی اور سائیڈ سے اس کی ناک کچھ تیکھی لگ رہی تھی، یوں خاموش خاموش کھڑا وہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ شرمینہ کو اس پر بے حد پیار آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور اس کی پشت پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

"ظفر اتنی تکلیف مت پہنچایا کرو مجھے کہ میں تم سے جھگڑا کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

ظفر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

شرمینہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تمہیں احساس ہے کہ اس وقت تم مجھے کتنے اچھے لگ رہے ہو؟" شرمینہ نے پوچھا۔

ظفر نے بڑی معصومیت سے کہا۔
''جو اچھا لگتا ہے اس سے لڑتے تھوڑی ہیں۔''
''شرمینہ ایک دم ہنس پڑی اور بولی۔
''دیکھو! تم میری تفریحات کی راہ میں حائل مت ہوا کرو۔ باقی سب ٹھیک ہے۔''
ظفر نے ناراض ہو جانے کی ایکٹنگ کی۔
شرمینہ نے کہا۔
''میں نے ایک بات کا فیصلہ کیا ہے ظفر!''
''کس بات کا؟''
''میں نے سوچا ہے اب تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے لیے مجبور نہیں کیا کروں گی۔ ہر جگہ اکیلی چلی جایا کروں گی۔''
''یعنی کس کس جگہ؟''
''کلب، ہوٹل، پکچر وغیرہ وغیرہ۔''
''نہیں! یہ مناسب نہیں ہے شرمین!''
''کیوں؟ اس میں اتنی کون سی نامناسب بات ہے؟''
''تم بچی ہو۔ ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔''
''تم کون سے بڈھے ہو؟ مجھ سے چار پانچ سال ہی تو بڑے ہو گئے۔''
''میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔''
''اچھا! چھوڑو اس ٹاپک کو۔''
''چلو چھوڑ دیا۔''
''منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔''
''اچھا کیوں؟''
''برتھ ڈے میں نہیں گئے تو کسی چائنیز ریسٹورنٹ ہی لے چلو۔''
''چلو مگر تم بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر لو ورنہ دیکھنے والے سمجھیں گے کہ معلوم نہیں میں نے تمہیں کتنا مار اہے جو رو رو کر تمہارا یہ حال ہو گیا۔''
شرمینہ نے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور بولی۔
''ہاں سچ! یہ شکل تو باہر جانے والی نہیں ہے۔''
ظفر مسکرایا۔
''پھر ایسا کرتے ہیں کہ گھر میں ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔''
''ہاں! مگر ذہن میں یہی بات رکھنا کہ ہم چائنیز ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں۔''
شرمینہ بے اختیار ہنس پڑی۔
یونہی چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں ایک سال گزر گیا اور ان کی شادی کی سالگرہ آ گئی۔ شرمین نے اس موقع پر بہت اہتمام کیا۔ شاندار ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اپنے سارے دوستوں کو اکٹھا کیا، میوزک پروگرام بھی ہوا اور رات کا ایک حصہ ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ یہ ہنگامی اور یہ اہتمام ظفر کو بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ بہت سادگی سے یہ سالگرہ منانا چاہتا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں شرمینہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن شرمینہ کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر اس نے شکست قبول کر لی۔
مہمانوں کی رخصت ہونے کے بعد شرمینہ نے کہا۔
''ظفر! تم نے انجوائے کیا؟''
''ہاں! لیکن تم اتنے سارے دوستوں کو جمع نہ کرتیں تو ہم اور زیادہ انجوائے کر سکتے تھے۔''
''نہیں ظفر! جتنی زیادہ گیدرنگ ہو آدمی اتنا ہی زیادہ انجوائے کرتا ہے۔''
''ممکن ہے تمہارا یہی خیال ہو لیکن.....''
''لیکن؟''
''ایک بات کہوں۔ بٹ پلیز! ڈونٹ مائنڈ۔''
''کہو۔''
''تمہارے کچھ دوست مجھے پسند نہیں ہیں۔''
''ارے نہیں وہ سب بہت اچھے ہیں۔''
''اب چاہے تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی والی بات کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔''
''اتنے کنزرویٹو مت بنو۔''
ظفر نے بات آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔
شادی کی سالگرہ کے تقریباً دو ماہ بعد کاشف پیدا ہوا۔ ظفر بے پناہ خوش تھا۔ خوش تو شرمینہ بھی تھی

لیکن وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اب اس کی ذمے داریاں کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔ زندگی پابند ہو کر رہ جائے گی۔ ظفر یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اب شرمینہ کا انداز زندگی اور انداز فکر خود بخود بدل جائے گا لیکن ظفر کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ دو تین مہینے بعد شرمینہ نے بچے کو مکمل طور پر آیا کے سپرد کر دیا اور اپنی اسی ڈگر پر واپس آ گئی۔

ظفر کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔ اس نے بچوں کی سائیکالوجی پر بحث کرتے ہوئے شرمینہ کو قائل کرنا چاہا کہ اس کی یہ روش غلط ہے لیکن شرمینہ کو صحیح راہ دکھانے والا صرف ایک شخص تھا اور اس کی زندگی کے لیے غلط سمتوں کا تعین کرنے والے کئی لوگ تھے۔ ظفر اچھی طرح جانتا تھا کہ شرمینہ کے غلط قسم کے دوست اسے بالکل الٹے مشورے دیتے تھے اور اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ شادی کے بعد سے وہ ایک پابند زندگی گزار رہے۔ وہ بالکل بدگئی ہے۔

وہ پہلے کی طرح جولی نہیں رہی۔

اس کے نہ ہونے کی وجہ سے انہیں پروگرام پھیکے اور بے مزا معلوم ہوتے ہیں۔

خود شرمینہ کے والدین کا خیال تھا کہ شرمینہ ابھی بچی ہے اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں اتنی سنجیدگی اسے زیب نہیں دیتی بلکہ وہ تو اتنی جلدی بچے کی پیدائش پر بھی خوش نہیں تھے۔

یہ تمام باتیں سن کر کبھی کبھی شرمینہ کو بھی یہ احساس ہونے لگتا کہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے، اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ان حالات میں ظفر کیا کر سکتا تھا۔

شرمینہ نے اب یہ ضد چھوڑ دی تھی کہ وہ ہر جگہ ظفر کو ساتھ لے کر جائے گی وہ ظفر سے کہتی تھی لیکن اس کے نہ آنے پر وہ ہر جگہ تنہا چلی جاتی تھی۔

"یوں گھٹ گھٹ کر تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔"

یہ سوچ کر وہ ہر بات پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھی اور سب باتیں تو ظفر پھر بھی برداشت کر سکتا تھا لیکن اس کا تنہا کلب جانا اسے سخت ناپسند تھا لیکن جب بھی اس موضوع پر بات ہوتی تو نتیجہ لڑائی جھگڑے کے سوا اور کچھ نہ نکلتا۔ اس لڑائی جھگڑے نے دونوں کو ہی چڑچڑا بنا دیا تھا۔

افشین کی پیدائش کے وقت تک حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ شرمینہ کے دوستوں نے اس کو جانے کس کس انداز سے پٹی پڑھائی کہ ظفر کی باتوں کا اب اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا وہ اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی اور پھر..... کلب میں اشعر کی آمد نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

اشعر جو دولت مند تھا۔ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس کا بزنس نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی پھیلا ہوا تھا۔

اشعر جو بلا شبہ حسین تھا۔ جس کا انداز گفتگو بہت خوب صورت تھا جو دوسروں کو بڑی جلد متاثر کر دیتا تھا۔

شرمینہ جیسی آزاد خیال لڑکیاں اس کے انداز فکر کی بھی بہت مداح تھی کیوں کہ وہ عورتوں کی آزادی کی زبردست حامی تھی۔ اس کے نزدیک لڑکیوں اور عورتوں کا ڈرنک کرنا بھی کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

ان کے عریاں لباس پہننے پر بھی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ بھی فیشن میں شامل تھا۔

کلب ڈانس، ڈنر، کاک ٹیل، پارٹیز..... ان سب کو اس کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

لڑکیاں اس پر دیوانہ وار نثار ہونے لگیں۔

آرائش جمال پر اور زیادہ وقت صرف کرنے لگیں۔

ان کی چال میں کچھ اور لچک پیدا ہو گئی۔

انداز گفتگو کو کچھ اور زیادہ دل نشین بنانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کے خلاف حسد

اور جلن کے جذبات میں کچھ اور اضافہ ہوگیا لیکن..... یہ سارا اہتمام بے کار ہی ثابت ہوا۔ اشعر کی نگاہ انتخاب جس پر پڑنا تھی پڑ گئی۔ اس کے دل کے بند دروازے جس کے لیے کھلنا تھے کھل گئے۔ اس کی آنکھیں جس کے لیے بے خواب ہونا تھیں ہوگئیں۔ اس کے من مندر میں جس کی محبت کی شمع جھلملانا تھی جھلملا اٹھی۔ اس کی راتیں جس کے تصور سے آباد ہونا تھیں ہوگئیں۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ سب سوچتے رہ گئے اور وہ چپ چاپ، بڑی آہستگی سے بڑے متانت سے، اس کے قریب آ گیا جو کسی کی امانت تھی۔ جو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب سے چند سال پہلے ہی کسی کی ہو چکی تھی۔

وقت گزر گیا تھا اور پچھتاوے باقی رہ گئے تھے۔ وہ صرف کسی کی بیوی نہیں تھی کسی کی ماں بھی تھی مگر یہ بات تو اشعر کو روز اول ہی معلوم تھی۔ وہ تو سب کچھ جانتا تھا لیکن اف خدایا! ..... یہ من کے چور دروازے..... کس طرح اجنبی لوگوں کو اندر آنے کا راستہ دے دیا کرتے ہیں۔

"یہ دل کے جذبے..... جو سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں بڑی خاموشی سے چھین لیا کرتے ہیں۔ یہ تمناؤں کا ہجوم..... انسان کو کیسے اکیلے پن کا احساس دلاتا ہے یہ خواہشوں کے میلے..... کس طرح بھٹک کر رہ جاتا ہے انسان ان میلوں کی اڑتی دھول میں اور پھر..... یہ عالم خود فراموشی..... کہ جذبۂ دل کے سوا اور کسی جذبے کی پہچان ہی نہیں رہتی۔

اشعر شرمینہ کے سامنے اس طرح آ کر کھڑا ہو گیا جیسے..... کوئی تھکا ہارا مسافر میلوں کی مسافت طے کر کے اپنی منزل مقصود کے قریب آ پہنچا ہو۔ جیسے کوئی درد کے جلتے صحراؤں کو عبور کر کے بڑی مشکل سے نخلستان تک پہنچا ہو۔ جیسے کوئی بگولوں کی قید سے آزاد ہو کر..... بڑی کٹھن راہوں سے گزر کر اپنی زندگی کے چند لمحے بچا لایا ہو۔

اس کی آنکھوں میں التجا تھی..... مجھے اپنا بنا لو..... ایک تمنا تھی..... میری بن جاؤ..... ایک خواہش تھی..... مجھے پامال نہ کرو۔

شرمینہ نے اسے اپنے اس قدر قریب کھڑا دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرانی کی حد تک کھلی رہ گئیں۔ اس کی پلکیں جنبش کرنا بھول گئیں۔

اشعر کی اس ایک التجا اس کی ایک تمنا اور اس ایک خواہش کے جواب میں اس کی آنکھیں صرف یہی کہہ رہی تھیں۔

لمحے وقت کی قید سے آزاد ہو چکے، آزاد ہو چکے ہیں اشعر! لمحے کھو چکے ہیں۔ اشعر! تم آئے تو مگر..... کیوں آئے ہو؟ تم نے بڑی دیر کر دی۔ اب سے کچھ عرصے پہلے تم کہاں تھے؟ تم جہاں بھی تھے تمہیں آواز تو دی ہوتی..... شاید میں تمہارے انتظار میں تنہا ہوتی۔ رسم و رواج کے بندھن میں اپنے آپ کو قید نہ کرتی، رشتوں کی زنجیروں میں اپنے آپ کو قید نہ کرتی، الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤ اشعر!

واپس لوٹ جاؤ..... لوٹ جاؤ..... چلے جاؤ۔

اس نے اپنے کان بند کر لیے کہ اشعر کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ اشعر کی سحر انگیز شخصیت اس کی نظروں سے چھپ جائے مگر آوازوں کی گونج تھی کہ کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی اور اشعر کا خوب صورت چہرہ بند آنکھوں میں بھی سما گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی وہ ایک التجا..... وہ ایک تمنا..... وہ ایک خواہش..... شرمینہ کے دل کے تاروں کو جھنجوڑے ڈالتی تھی۔

جانے کس طرف سے یہ صدا چپکے چپکے آتی تھی۔

التجا ٹھکرائی نہیں جاتی، تمنا مجروح نہیں کی جاتی اور خواہش پامال نہیں کی جاتی شرمینہ تم اتنی کٹھور نہیں ہو سکتیں..... تم اتنی سخت دل نہیں ہو سکتیں..... مگر یہ احساس فرض..... یہ احساس ذمے داری..... یہ رشتوں کا تقدس..... یہ ممتا کی پکار..... اف خدایا! یہ کیسے ستون کھڑے کر دیے تم نے؟..... یہ کیسی

آزمائش کے لمحے آگئے ہیں میری زندگی میں؟ ..... کتنی تاریکی ہے کہ دم گھٹتا ہے..... کہاں جاؤں؟ ..... کیا کروں؟..... کوئی راستہ دکھادے خداوند!..... کوئی ایک راستہ..... یہاں تو آسمان تا زمین غبار ہی غبار ہے۔ یہ غبار کب چھٹے گا؟..... یہ تاریکی کب دور ہوگی؟..... یہ من کا اندھیارا کیسے ختم ہوگا؟ اور پھر..... غبار چھٹ گیا۔ تاریکی دور ہوگئی۔ من کا اندھیارا ختم ہوگیا..... راستہ نظر آگیا لیکن یہ کیسا راستہ تھا؟..... وہاں سوائے اس کے اور اشعر کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہاں ظفر نہیں تھا۔ کاشف نہیں تھا۔ آشین نہیں تھی۔ سب پیچھے رہ گئے تھے۔

رشتوں کا تقدس پامال ہو چکا تھا۔

گزشتہ ایک برس سے اس کی اور ظفر کی زندگی جس انداز سے گزر رہی تھی اس میں جذبہ محبت کا کہیں گزر نہیں تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی تھے مگر اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ دونوں نہ صرف ایک دوسرے سے بلکہ اپنے اپنے وجود سے بھی بیزار تھے۔ ظفر اسے سمجھا سمجھا کے تھک چکا تھا اور اب اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

شرمین کے پاس اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے بہت سی راہیں تھیں اور ظفر کے پاس کلینک مصروفیات تھی یا پھر بچوں کی معصوم محبت۔

شرمینہ کو اس بات کی قطعی پروا نہیں رہی تھی کہ ظفر کب آتا ہے کب جاتا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ اس کی صحت کیسی ہے؟ وہ صرف اپنے آپ میں مگن تھی یا پھر تھوڑا بہت تعلق اسے بچوں سے تھا۔

ایسے میں اشعر کی محبت نے دوسرے تمام جذبوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ احساس فرض فنا ہوگیا، احساس ذمے داری ختم ہوگیا، رشتوں کے تقدس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی، ممتا کی پکار اشعر کی خوب صورت آواز کی گونج میں دب کر رہ گئی۔ اس نے سوچا وہ اپنی زندگی کو زیادہ عرصے تک جہنم کے شعلوں میں نہیں جھونک سکتی اور جب..... اس نے بڑی سفاکی اور سنگ دلی سے ظفر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ چیخ پڑا۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ شرمین! تم ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''کیوں نہیں کرسکتی؟'' شرمین کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔

''میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔''

''میں ہر صورت میں اشعر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔''

''ظفر شدت سے رنج سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اپنی زبان سے لفظ۔ ''طلاق'' نکالنے کی ہمت اس میں بالکل نہیں تھی۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں اس معاملے کو کورٹ تک لے جانا نہیں چاہتی ظفر! تم بے کار ضد مت کرو۔''

ظفر نے نرمی سے کہا۔ ''شرمین! زندگی کا مذاق اس طرح نہیں اڑایا کرتے۔''

''معلوم نہیں زندگی کا مذاق میں نے اڑایا ہے یا تم اب تک اڑاتے رہے ہو؟''

''تمہیں اپنے بچوں کو واسطہ شرمین! یہ انتہائی قدم مت اٹھاؤ۔''

شرمین کے دل و دماغ کے آگے اشعر کی محبت کے پہرے تھے۔ بچوں کی محبت اس پر کیا اثر کرتی؟

''آج سے انہیں صرف اپنے سمجھو۔ میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔''

''دنیا کیا کہیں گی؟''

''مجھے دنیا کی پروا نہیں۔''

''زندگی کے فیصلے جذبات میں آکر نہیں کیے جاتے شرمین!''

''میں نے بہت غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''وہ کس قدر بے حس ہوگئی تھی۔

ظفر کا دل دکھ کر رہ گیا۔

''تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو، مجھے یقین ہے کہ.....''

شرمینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔''

''مجھے مشورہ دینے کا حق بھی نہیں رہا؟''

''نہیں۔''

''ہم نے ایک دوسرے کو صرف اس دن کے لیے نہیں چاہا تھا؟''

''شرمینہ خاموش رہی۔

''محبت کے جذبوں کو خود اپنے ہاتھوں سے نہیں دفنایا جاتا شرمین!''

''کون سی محبت کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی جو ہم میں تم میں ہے۔''

''کبھی ہوگی، اب تو اس کا ذکر بھی حماقت ہے۔''

''کیوں؟''

''کبھی سوچا تم نے گزشتہ ایک برس سے ہم کس اندازے سے جی رہے ہیں؟..... زندگی اسے کہتے ہیں؟''

ظفر نے پوچھا۔

''قصوروار صرف میں ہوں؟''

''تمہارے نزدیک تو قصوروار صرف میں ہوں۔''

''چھوڑو اس جھگڑے کو آؤ ہم سمجھوتا کر لیں۔''

''اب یہ تمام باتیں فضول ہیں ظفر!''

''میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اتنی زیادہ شکایتیں ہوں گی کہ تم یہ انتہائی قدم اٹھاؤ گی۔''

''ہاں! آخر ایک نہ ایک دن تو آتش فشاں کو پھٹنا ہی تھا۔''

''ایسی کون سی شکایتیں تھیں کم از کم یہی بتا دو۔''

''سننا ہی چاہتے ہو تو سنو..... تم نے ہمیشہ مجھ پر بے جا پابندیاں لگانے کی کوشش کی۔ تم نے میرے دوستوں پر نکتہ چینی کی، تم نے میرے لباس پر اعتراض کیا تم نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی، اپنا کلینک ایک دو ماہ کے لیے دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے مجھے اس شہر سے باہر بھی کہیں لے جاؤ۔''

''شرمینہ خاموش ہوئی تو ظفر نے کہا۔

''بس! یا کچھ اور بھی؟''

''شرمینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اپنی شکایتوں کے جواب میں اگر کچھ سننا چاہو تو سنو..... جنہیں تم بے جا پابندیاں کہتی ہوں وہ میری غیرت حمیت کا تقاضا تھا جنہیں تم اپنے دوست کہتی ہو وہ دراصل تمہارے دشمن ہیں۔ تم کہیں جانتیں وہ تمہارے پیچھے تمہارے لیے کس کس انداز سے باتیں کرتے ہیں۔ تمہارا لباس عریانی کی حد کو چھونے لگا تو مجبوراً مجھے روکنا پڑا۔ رہ گئی سیر تفریح کی بات تو شرمینہ بیگم! میں بہر حال ایک ڈاکٹر ہوں۔ میری زندگی صرف اپنے لیے نہیں ہے۔''

شرمینہ نے اس کی تمام باتیں سن کر ایک انداز سے سر جھٹکا اور بولی۔

''جب خیالات میں اس قدر تضاد ہو تو زندگی اسی طرح عذاب جان بن جاتی ہے۔''

''زندگی کو عذاب جان بنانا نہ بنانا ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔''

''خیر! اب یہ ساری بحث فضول ہے تم میرے اوپر اتنا کرم کرو کہ مجھے.....''

ظفر نے شرمینہ کی بات پوری نہ ہونے دی۔ وہ بے تاب ہو کر آگے بڑھا اور کسی ننھی سی بچی کی طرح شرمینہ کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

''میں تم سے الگ ہو کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا شرمین!''

شرمینہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور بولی۔

''اور میں اب تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

ظفر کے لیے اس کا یہ انداز بے حد تکلیف دہ تھا لیکن اس کی نگاہوں سے پھر بھی شرمینہ کے لیے پیار

اڈر رہا تھا۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''تم اتنی چھوٹی سی لڑکی! میری اور اپنی زندگی کے بارے میں اس قدر خوف ناک فیصلہ تم نے کیسے کرلیا؟''

''شرینہ نے پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولی۔

''ظفر! میں تم سے مزید باتیں کرنے کے موڈ میں ہوں، جو کچھ میں تم سے کہا ہے وہ تم وہ کرو۔''

''تم جذباتی ہو رہی ہو۔ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو شاید تم کوئی بہتر فیصلہ کرسکو۔''

شرینہ عصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''اس بات کو ایک لمحے کے لیے بھی مت بھلانا کہ تم دو معصوم بچوں کی ماں ہو۔''

''میں کہہ چکی ہوں آج سے وہ پے تمہارے ہیں۔''

''حقیقت بہرحال اٹل ہوتی ہے۔ تمہارا جذباتی فیصلہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔''

شرینہ لاپروائی سے دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔

''ان بچوں کو تمہاری ضرورت ہے شرین! انہیں ان کے حق سے محروم مت کرو۔''

''ظفر سر جھکائے بوجھل قدموں سے باہر چلا گیا۔

قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا۔ شرینہ سمجھنے اور سمجھانے کی منزلوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

ظفر کی منت سماجت، بچوں کے معصوم چہرے، کچھ بھی تو اس پر اثر انداز نہ ہوسکا۔

ظفر نے دکھے دل کے ساتھ اپنی شکست قبول کرلی اور شرینہ سب کو ٹھکرا کر چلی گئی۔

اس کے گھر والے اسے مظلوم سمجھتے تھے اور اس کے دل کے لیے اسے حق بجانب بھی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی لاڈلی اور معصوم سی کلی، ظفر کی زیادتیوں کے باعث کملا کر رہ گئی ہے۔ اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔ ظفر سے علیحدگی کے تقریباً چھ ماہ بعد شرینہ نے اشعر سے شادی کرلی۔

اشعر کی سنگت میں زندگی کس قدر خوش گوار گزر رہی تھی۔ ایسی ہی حسین زندگی کے اس نے سپنے دیکھے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ شہروں شہروں ملکوں ملکوں گھومتی پھر رہی تھی۔

اشعر زندگی کا کتنا اچھا ہم سفر ثابت ہوا۔

نہ شرینہ کے بے شمار دوستوں پر اسے کوئی اعتراض نہ اس کے لباس پر اس نے کبھی ٹوکا چینی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اور نہ اس کے اوپر کوئی اور پابندی لگائی تھی۔

زندگی کے یہ خوب صورت برس بڑی جلدی گزر گئے، اتنی خوشیاں شرینہ سے سمیٹی نہ جاتی تھیں۔ اتنی مسرتوں کے لیے اسے اپنا دامن بہت چھوٹا نظر آتا تھا مگر پھر..... جانے کیا ہوا؟

خوشیاں بادل بن کر اڑ گئیں..... مسرتیں سوکھے پتوں کی مانند انجانی سمتوں میں اڑ گئیں..... محبتیں فنا ہوگئیں..... چاہتیں سو گئیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ اشعر کا دل اس سے اتنی جلدی بھر جائے گا۔

شرینہ سرتاپا اپنے آپ کو دیکھا بار بار اپنا جائزہ لیا۔ کیا وہ بہت بدل گئی ہے؟ اس کا حسن ماند پڑ گیا ہے؟ اس کی مسکراہٹوں میں اب دل کشی باقی نہیں رہی ہے؟ اس کی شخصیت کا سحر ختم ہوگیا ہے؟ آئینہ اس کے سامنے تھا۔

اس نے کہا۔ ''نہیں تم نہیں بدلیں، تمہارا حسن بھی ماند نہیں پڑا۔ تمہاری مسکراہٹوں میں دل کشی بھی قائم ہے اور تمہاری شخصیت کا سحر بھی ختم نہیں ہوا۔ اپنی شخصیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اشعر بدل گیا ہے۔ تمہاری خوشیوں کے دن بس اتنے ہی تھے۔ اشعر کے من مندر میں تمہاری محبت کی جھلملاتی ہوئی شمع بجھ چکی ہے۔ اب اس کے دل کے ایوانوں میں تمہارے قدموں کی نہیں انیلا کے قدموں کی چاپ گونجتی ہے۔''

اور پھر..... یوں ہوا کہ جس گھر میں وہ بڑے ارمانوں سے آئی تھی وہاں سے نکل کر جانے پر مجبور ہوگئی۔

اس نے منت سماجت کی، اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ اشعر کی چاہت کا حوالہ دیا۔ اس کی خاطر کا شف اور افیشن کو ٹھکرا دینے کی داستان دہرائی۔ ان سب کے جواب میں اشعر کے پاس سوائے نفرت، حقارت اور نخوت کے اور کچھ بھی تو نہ تھا بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ ایسی عورت سے کیسی محبت جو شوہر کو چھوڑ دے بچوں کی پروانہ کرے۔

اف خدایا! یہ محبتیں اور چاہتیں نفرتوں میں اس طرح بدل جایا کرتی ہیں۔

پورا ایک سال وہ اشعر کے گھر میں ایک بے کار سی شے کی طرح پڑی رہی۔ اس کی بے اعتنائیوں کو برداشت کرتی رہی، اس کے انداز بے رخی کے تیر دل پر سہتی رہی، اس کے تحقیر آمیز سلوک کے زخم کھائی رہی۔ ایک امید پر، ایک آس پر کہ شاید بیتی ہوئی گھڑیاں لوٹ آئیں کہ شاید سرد پڑ جانے والے جذبات میں ذرا سی حرارت پیدا ہو جائے لیکن..... وقت گزر چکا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ اشعر کو اگر اس سے کوئی شکایت ہوتی تو وہ اسے دور کرتی۔ وہ اپنے آپ کو سرتاپا بدل دینے پر آمادہ تھی مگر اشعر کو اس سے کوئی شکایت بھی تو نہیں تھی۔

اس نے تو صاف صاف بس یہ کہہ دیا تھا کہ اب وہ اسے پسند نہیں کرتا وہ انیلا سلیمان کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

شرمینہ نے کتنا چاہا وہ کوئی سمجھوتا کر لے لیکن اشعر کے نزدیک یہ سراسر حماقت تھی۔ اس نے بڑی نخوت اور تکبر کے ساتھ طلاق نامہ اسے تھما دیا اور اس کی مہر کی رقم بھی۔ شرمینہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

روئی کے گالوں کی مانند نرم اور سبک رفتار بادل کس طرح اچانک اڑ گئے تھے اور کیسی مہیب آندھی آ گئی تھی، کیا پر زور طوفان آ گیا تھا اس کی زندگی میں؟..... زمین سے آسمان تک غبار ہی غبار تھا۔ اڑے ہوئے بگولوں کی دھند میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی راستہ نہیں، کوئی راہ گزر نہیں، منزل کا تو ذکر ہی کیا، اتنا درد اتنی اذیت۔ وہ درد اور اذیت کے انبار تلے دب کر رہ گئی۔ دل سے اتنی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس قدر شور تھا کہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی بند پلکوں تلے گرم گرم مینہ اس قدر برسا، اتنا برسا کہ سارا غبار دب کر رہ گیا۔

ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ ستاروں کی رہ گزر کتنی پیچھے رہ گئی ہے۔

روشنی نے اسے کتنے زخم بخشے تھے۔ یادوں کا زہر بڑی خاموشی سے اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ جب اپنا دل ٹوٹا تو اسے دوسروں کے دل ٹوٹنے کی صدا پہلی بار آئی۔

تب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جس کے لیے وہ اپنی محبت کے جلتے ہوئے چراغ تھامے ہوئے تھی وہ اس کی محبتوں کا امین نہیں تھا۔

زندگی کیا ہو کر رہ گئی تھی، بس ایک سلسلہ یادوں کا، خوابوں کا جیسے پتھروں کا ایک ڈھیر ہو، جیسے ایک ویران کھنڈر ہو۔ پتھروں کے اس ڈھیر پر چلتے چلتے وہ تھک گئی، اس کے پیروں پر آبلے پڑ گئے۔ اب جب کہ وقت گزر گیا تھا اور پچھتاوے رہ گئے تو احساس ہو رہا تھا کہ اپنی خوشیوں کے رنگ محل کو اس نے خود اپنے ہی ہاتھوں چکنا چور کیا تھا۔

یہ تکلیف دہ زندگی ایک عذاب ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ شاید میرے بچوں کی معصوم آہوں نے آسمان کو ہلا کر رکھ دیا ہے، شاید ظفر کی فریاد بے نوا سے زمین کانپ اٹھی ہے۔ جب عرش لرز جائے۔ جب زمین کانپ اٹھے، اس کی بانہیں اپنے بچوں کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہو گئیں، اس کی جبین ظفر کے قدموں میں سجدہ ریز ہونے کے لیے بے تاب ہو گئی مگر یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ اس کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں کس قدر پست ہو گئی۔ ذلیل ہو گئی تھی۔

قدم اس کوئے ندامت کی طرف جانے کو بے تاب تھے مگر اٹھ نہیں پاتے تھے۔ اس نے کتنی دفعہ وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر اف وہ احساس ندامت کہ ہر ہر ارادہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ اس نے کتنی دفعہ ظفر سے ملنے کی ہمت کی لیکن اس کا گزشتہ کردار..... جو خود اس کی نظروں میں گر گیا تھا، اس کی ہمت کو پست کر گیا۔

اسے اندازہ تھا کہ اب وہ اپنے بچوں کے بغیر جی نہ سکے گی اور ایک شام..... جب دل کے بے چینیاں حد سے گزر گئیں، جب درد کے انبار تلے دبے دبے اس کی روح تک سسک اٹھی۔ وہ احساس ندامت اور احساس رسوائی سے اپنا دامن چھڑا کر گرین ولا پہنچ گئی۔

تمام راستے وہ کس قدر تکلیف دہ جذبات کا بوجھ اپنے جی پر لیے رہی۔ دل سے آنکھوں تک طوفان ہی طوفان تھا۔ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب ڈوب جاتی تھیں۔ پلکیں جھپکتی تھیں تو موتی ٹوٹ کر چپ چاپ بکھر جاتے تھے گاڑی چلانا کس قدر دشوار ہو گیا تھا۔

کتنی امیدوں کے جلتے دیے تھامے وہ وہاں پہنچی تھی اور کتنی حسرتوں کا غبار دل میں لیے وہ واپس آئی۔

نہ ظفر کی صورت دیکھنے کو ملی نہ بچوں کی۔

اور..... اگلی شام پھر..... دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے وہ گرین ولا کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ کب کال بیل بجی، کب چوکیدار نے آ کر گیٹ کھولا اور کب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی؟..... اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

یہ سب کچھ جیسے ایک خواب کے سے عالم میں ہو گیا تھا۔ ملازم نے کہا۔

''آپ تشریف رکھیے صاحب ابھی آتے ہیں۔''

''اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ظفر کے قدموں کی چاپ سننے کے لیے وہ کتنی بے قرار ہو گئی تھی۔ اس کا رواں رواں گوش بر آواز ہو گیا۔ لمحے کس طرح گزرے چلے جا رہے تھے۔

اور پھر..... ڈرائنگ روم کے باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز اور قریب آ گئی..... اور قریب بالکل قریب۔

اس مانوس چاپ سے کان آج تک آشنا تھے۔ لمحے دھند بن کر اڑتے جا رہے تھے اور پھر ظفر اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔

شرمینہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ خود اسی کے ہاتھوں کے بخشے ہوئے زخموں نے ظفر کے چہرے کو کیسا پروقار لیکن پرسوز بنا دیا تھا اور شخصیت کو متاثر کن انداز بخش دیا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ اس سے کہے، اسے پوچھے۔

''ظفر! میرے ہاتھوں نے تمہاری زندگی میں جو کانٹے بکھیرے ہیں تم ان پر کس طرح چلتے رہے؟ میرے اندھے فیصلے نے تمہاری زندگی میں جو زہر گھولا تھا تم اسے ایک سانس میں پی گئے یا اب تک گھونٹ گھونٹ پیتے رہے ہو؟ میں ظالم ہوں، میں قابل نفرت ہوں، میں ٹھوکروں میں اچھالے جانے کے قابل ہوں۔ تم بھی مجھے ایسی اذیتیں دو کہ میں مر سکوں نہ جی سکوں۔'' لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے اپنی آنکھوں پر کانپتی لرزتی پلکوں کا سایہ کیے سر جھکائے کھڑی رہی۔ بالکل مجرموں کے انداز میں۔

کتنی خاموشی تھی کمرے میں کہ دم گھٹتا تھا پھر ظفر کا گمبھیر آواز اس منجمد سکوت کو توڑا۔

''تشریف رکھیے۔''

اف! وہ اجنبی انداز، سرد مہری کا انداز، شرمینہ کے دل پر قیامتیں گزر گئیں۔

''جی فرمایئے! کیسے زحمت کی آپ نے؟''

شرمینہ کی آنکھیں چھلک پڑنے کو بے تاب تھیں مگر وہ انتہائی ضبط و تحمل کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

ظفر نے دوبارہ پوچھا ''فرمایئے! میں کیا

خدمت کر سکتا ہوں، کیسے تکلیف کی آپ نے؟''
شرمینہ نے بڑی ہمت کر کے کہا۔''میں اپنے بچوں سے ملنے چاہتی ہوں۔''
''کون سے بچوں کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟''
شرمینہ پہلو بدل کر رہ گئی۔
''میں کاشف اور افشین کی بات کر رہی ہوں۔''
ظفر انتہائی طنز سے بولا۔''بہت خوب!''
شرمینہ نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ نہ سکی۔
''خاتون! اس گھر میں کاشف اور افشین نام کے دو بچے رہتے ضرور ہیں لیکن......''
شرمینہ نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''وہ بچے صرف اور صرف میرے ہیں۔''
شرمینہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔
''شاید آپ کو اپنے الفاظ یاد ہوں؟......آپ نے خود ہی فرمایا تھا کہ ان بچوں کو میں صرف اپنے بچے سمجھوں۔ آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔''
شرمینہ ایک دبی ہوئی سانس لے کر رہ گئی۔
''اگر آپ کہیں تو میں دن اور تاریخ کا بھی حوالہ دے دوں۔''
''میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔''
''وہ الفاظ آپ کی امانت نہیں تھے جو لوٹائے جا سکیں۔''
''میں انہیں ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''گزشتہ تین برس میں آپ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لیں؟''
''مجھے اپنی کوتاہی اور غفلت کا احساس ہے۔''
''شکر ہے آپ کے لیے یہ بھی بڑی بات ہے۔''
شرمینہ کچھ کہنے والی تھی کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ اس نے چائے بنا کر دونوں کے سامنے رکھی اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔
ظفر نے پوچھا۔

''آپ اس ارادے سے آئی ہیں کہ بچوں کو اپنے ساتھ لے جائیں؟''
''اتنی بڑی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''
''ہاں! ظاہر ہے بچے آپ کے پروگرام خراب کریں گے، سیر و تفریح کی راہ میں حائل ہوں گے۔''
شرمینہ ظفر کے لہجے کی چبھن برداشت نہ کر سکی ایک دم چیخ اٹھی۔
''ظفر اس قدر طنز مت کرو۔''
ظفر نے برا مان کر کہا۔
''آپ کو اتنی بے تکلفی سے میرا نام لینے کی جرأت کیسے ہوئی؟''
شرمینہ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ سر جھکا کر رہ گئی مگر اب اس میں ضبط کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔
اس نے سوچا
''ظفر میری موجودہ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''
لیکن ظفر سب کچھ جانتا تھا چند دوست...... جو اس کے اور شرمینہ کے مشترکہ دوست تھے اور جن سے کبھی کبھار ظفر کی بھی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ انہوں نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔
''چائے تو پی لیں آپ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' ظفر نے کہا۔
''شکریہ! میں چائے پینے نہیں آئی ہوں۔''
''پھر؟''
''میں بچوں سے ملنا چاہتی ہوں۔''
''کیا اندازہ لگانا چاہتی ہیں ان سے مل کر؟''
شرمینہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔
''آپ مطمئن رہیے آپ کے بغیر بھی وہ زندہ ہیں اور خدا کا شکر ہے بڑی اچھی تربیت ہوئی ہے ان کی۔''
شرمینہ نے اپنی پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا۔
''بلکہ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ

آپ شاید اتنی اچھی تربیت نہ کرسکتیں ان کی، آپ نے اصل میں مختلف ماحول مین زندگی بسر کی ہے!!''

شرینہ نے بڑے درد سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''طنز کا کوئی تیر باقی نہ چھوڑنا ظفر!''

''آپ پھر بے تکلف ہونے کی کوشش کررہی ہوں۔''

شرینہ نے متانت سے کہا۔''میں مجبور ہوں اور کسی طرح تمہیں مخاطب کرسکتی ہوں۔''

ظفر صوفے کی پشت سے سر ٹکائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''بچوں کو بلوادو۔ میں ان سے ملے بغیر واپس نہیں جانا چاہتی۔''

''کیا کہہ کر ملواؤں ..... آپ کو ان سے؟ وہ آپ کو نہیں جانتے۔''

ظفر نے بڑی سنگ دلی سے کہا۔

''معاف کیجیے میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتا۔''

''یہ میری التجا ہے ظفر!''

''سوری! آپ جاسکتی ہے۔''

''اتنے سنگ دل مت بنو ظفر!''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ نے کتنی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔''

''مجھے احساس ہے میں اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگتی ہوں۔''

''آپ کی معافی ان زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتی جو آپ نے میرے اور میرے بچوں کو دلوں پر لگائے تھے۔''

''مجھے کڑی سے کڑی سزا دے لو ظفر! مگر میرے بچوں کو.....''

''اتنے سال تک جب آپ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتی رہیں آپ کو کبھی بچوں کا خیال نہیں آیا اب..... جب اپنے دل پر چوٹ پڑی تو بچوں کی محبت میں پناہ ڈھونڈنے کا خیال آیا۔'' ظفر بے حد غصے سے بولا۔

''بس کرو ظفر! چپ ہوجاؤ اتنے چرکے مت لگاؤ۔''

شرینہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ آنسو ایک کے بعد ایک اس کے رخساروں پر پھیلنے لگے مگر آج ظفر کا دل پتھر ہوگیا تھا۔

''کہاں گیا آپ کی خوشیوں کا وہ رنگ محل جس کی خاطر آپ نے مجھے اور میرے بچوں کو ٹھکرادیا؟''

شرینہ آنسو بہا رہی تھی۔

''کہاں گئے وہ آپ کی محبت اور چاہت کے امین جن کی خاطر آپ نے محض ایک جملے میں زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرلیا؟''

''شرینہ کی سسکیاں بلند ہوگئیں۔

''میں نے آپ کو اپنی جان کا واسطہ دیا، اپنے بچوں کا واسطہ دیا۔ آپ منتیں کی..... مگر میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بھی اس قدر بے اثر ثابت ہوسکتے ہیں۔''

''مجھے معاف کردو ظفر! میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں اپنے بچوں کی مجرم ہوں۔ جتنی شکایتیں تمہارے دل میں ہیں سب زبان پر لے آؤ۔ جس قدر لعنت ملامت کرسکتے ہو کرو۔ تم اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ دینا لیکن ایک بار مجھے بچوں سے ملادو۔''

سسکیوں سے شرینہ کا سارا وجود ہل رہا تھا۔ ظفر کی آنکھوں کے سائے کانپ رہے تھے۔ اس نے بمشکل تمام شرینہ کو اپنے قدموں سے جدا کیا۔

''میں نے بڑی مشکل سے خود کو اور بچوں کو سنبھالا تھا شرینہ بیگم! زخموں پر مرہم رکھنا آسان نہیں ہوتا۔''

''میں بہت پرسکون تو پہلے بھی نہیں تھا۔ آپ نے آکر اور بے سکون کیوں کردیا؟''

''میں نے تو اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ آپ کو چاہا تھا۔ آپ نے اس چاہت کی قدر نہ

کی۔ میرے دل کے جذبوں کو بے وقعت کرنے کی کوشش کس نے کی؟ وہ آپ ہی تو تھیں۔ دل پر چوٹ پڑی تو ہر جذبے کا احساس خود بخود ہو گیا۔''

''ظفر! تم نہ کہو تب بھی.....''

''لیکن وقت گزر جانے کے بعد یہ سب کچھ کس قدر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔''

ظفر کی آنکھوں میں سوچیں بڑی گہری تھیں۔

'' آخری بار التجا کر رہی ہوں ظفر! بچوں کو بلوا دو۔''

''بچے اپنی پھوپھی کے پاس ہیں۔ میں کل انہیں چھوڑ آیا تھا۔''

''شرمینہ کا دل کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

''جب واپس آئیں گے میں ٹیلی فون کر دوں گا۔''

''اچھا! شکریہ!'' شرمینہ نے دکھے دل سے کہا اور اپنا پرس اٹھا لیا۔

''خدا حافظ ظفر!''

''خدا حافظ۔''

شرمینہ چلی گئی اور ظفر کمرے میں تنہا رہ گیا۔

کیسی منجمد سی خاموشی چھائی ہوئی تھی کمرے میں؟ پیالیوں میں پڑی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پردے لرز رہے تھے۔

وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ اس نے سوئچ آن کر دی اور دریچے کے پردے سرکا کر باہر جھک گیا۔

رات کے سیاہ ریشمی سائے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ ستارے بڑی خاموشی سے ایک کے بعد ایک جھلملاتے جا رہے تھے۔

آج تنہائیوں کا زہر اس کے لیے بے حد تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ شرمین سے جدائی کا احساس اس کی شہ رگ کو چھوتا ہوا اس کے رگ و پے میں ہلچل مچا رہا تھا۔

روح جیسے آنکھوں میں کھنچ آئی تھی۔

ہوائیں، درد دل کا راگ سناتے ہوئے بڑی خاموشی سے درختوں کے درمیان سرسرا رہی تھیں۔

فضا شبنمی خنکی سے بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔

درد کے بیکر اں سائے سناٹوں میں گہرے سوز میں ڈوبے چلے جاتے تھے۔ یادوں کی راہ گزر پہ دھول سی اڑ رہی تھی۔ اس کے زخموں سے قطرہ قطرہ لہو رسنے لگا تھا۔

اف خداوند! یہ کیسی صدائیں آتی ہیں ان پرانی راہوں سے؟ ظفر کو شرمینہ پہ بے پناہ غصہ تھا۔ اس کی سنگ دلی سے بے حد شکایت تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اس سے کس قدر چڑ کے لگائے کس قدر اذیت پہنچائے مگر جب وہ اس کے پیروں سے لپٹ کر روئی تو اس کی ساری سنگ دلی پانی ہو کر بہہ گئی۔ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کا فعل تھا۔ میں کیوں اس قدر پست ہو گیا تھا؟ اس نے سوچا۔

اشعر نے جانے اسے کتنے دکھ پہنچائے ہیں؟ وہ کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہے؟ اس کے چہرے کی آب و تاب کہاں چلی گئی ہے؟ اس کی باتوں میں وہ شوخی نہیں، اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ جانے کدھر کھو گئی۔ اس کے وہ کھنکتے ہوئے قہقہے کس جگہ دفن ہو گئے ہیں؟ وقت اس کے دامن میں کیسے کانٹے بھر دیے ہیں۔

کافی رات تک ظفر سو نہ سکا۔ اتنی سوچیں تھیں۔ اتنے خیالات تھے کہ دماغ کی رگ پھٹ جانا چاہتی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی بے خواب آنکھیں نیند کے بوجھ تلے جھک گئی۔

اگلے دن اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے کے لیے بھیج دیا اور شرمینہ کو فون کر دیا۔

شرمینہ آئی تو ظفر پہلے سے ڈرائنگ روم میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے شرمینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''میں نے ڈرائیور کو بھیج دیا ہے بچے آتے ہی ہوں گے۔''

''انہیں لے آنے میں کتنی دیر لگے گی؟''

''دیر بھی لگ سکتی ہے شاید تم انہیں کھانے پر

روک لے۔"

شرمینہ بے چین ہوگئی۔ گاہے گاہے وہ بڑی حیرت سے ظفر کی بے خواب آنکھوں کی طرف دیکھتی تھی۔ ظفر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا پھر ایک دم وہ شرمینہ کے قریب آکر رک گیا اور بولا۔

"تم نے ایک بار پھر میرا سکون چھین لیا ہے شرمینہ!"

"مجھے افسوس ہے۔" شرمینہ نگاہیں نہ ملا سکی۔

"ہم ایک بار پھر سمجھوتا نہیں کر سکتے شرمینہ؟" ظفر نے پوچھا۔

شرمینہ نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی وقت ہمارے اختیار میں ہے۔ لمحے وقت کی قید میں ہم کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

شرمینہ خاموش بیٹھی رہی۔

"یہ لمحے ہمیشہ وقت کی قید میں نہیں رہیں گے۔ یہ آزاد بھی ہو سکتے ہے۔" ظفر نے رک کر کہا۔

شرمینہ کی آنکھوں میں دکھ کے سائے تھے۔

"لمحے جب کھو جائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ظفر! لمحے سچ مچ کھو چکے ہیں۔"

"میں موجودہ لمحوں کی بات کر رہا ہوں شرمین! آؤ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

"یہ بہت تکلیف دہ ہے ظفر! بے حد تکلیف دہ۔"

"کیوں؟"

"میں خود اپنی نگاہوں میں اس قدر گر چکی ہوں کہ تم سے نگاہ ملا کر بات کرنا بھی میرے لیے ایک آزمائش بن جاتا ہے۔"

"بھول جاؤ شرمین! گزرے ہوئے لمحوں کو بالکل بھول جاؤ۔"

"میرا جرم، میری زیادتیاں مجھے زندگی بھر چین نہیں لینے دیں گے۔"

"قصور صرف تمہارا نہیں شرمین! اس ماحول کا ہے جس میں تم نے پرورش پائی۔ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے تمہارے لیے غلط راہوں کا انتخاب کیا۔"

"میں اپنے آپ کو زندگی بھر معاف نہیں کر سکوں گی۔"

"تم قابل معافی ہو، سراسر قابل معافی۔"

"شرمین کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"مجھے یقین ہے اب ہم زیادہ بہتر اور زیادہ خوش گوار زندگی گزار سکیں گے۔"

"نہیں۔"

"ہماری زندگیاں صرف اپنے لیے نہیں ہیں شرمین! ہمیں اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے بارے میں کوئی سمجھوتا کر لینا چاہیے۔"

"میں زندگی بھر احساس ندامت کا شکار رہوں گی اور تمہاری نظروں کے سامنے رہ کر یہ احساس اور بھی شدید ہو جائے گا۔"

"مجھ پر اعتماد کرو گزشتہ زندگی کے بارے میں تم میری زبان سے کبھی ایک لفظ بھی نہیں سنو گی۔ میرا دل بہت وسیع ہے۔" ظفر نے کہا۔

پھر صبر وضبط کا دامن چھوٹ گیا، جبیں سجدہ ریز ہو گئی۔ اشک غم قدموں میں جذب ہو گئے۔

ظفر نے جھک کر اسے اٹھایا اور اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے بولا۔

"راستے کبھی کبھی وقت کی گرد میں دھندلا کر کھو بھی جایا کرتے ہیں اور انسان بھٹک بھی جایا کرتے ہیں۔"

شرمینہ کی بند پلکوں تلے قطرہ قطرہ مینہ برس رہا تھا۔

"اس گھر کے در و دیوار تمہارے منتظر ہیں۔ ہم پھر ایک ہو سکتے ہیں۔"

اور کمرے میں شرمینہ کی سسکیوں کی آواز بلند ہو گئی۔

☆☆

ایک دریچہ کھلا رہا

نزہت جبیں ضیاء

اگر کوئی لڑکی رخصتی سے پہلے بیوہ ہوجائے تو اس پر منحوس کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ وسوسوں اور اندیشوں نے اس کی پر بہار زندگی میں الجھنوں کا زہر گھول دیا تھا۔ ان بکھرے گیسوؤں کی کہانی جنہوں نے سلجھنے میں قسمت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

معاشرے کی فرسودہ روایات کو بیان کرتی کہانی

''کومل بیٹا! ذرا جلدی کرو افطاری میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔'' شگفتہ بیگم نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کچن میں پکوڑے تلتی ہوئی کومل سے کہا۔ ''اور ہاں جب افطار تیار ہو جائے تو برابر میں نئے پڑوسیوں کے ہاں ایک ٹرے بھجوا دینا۔''

''جی اچھا امی!'' پلیٹ میں پکوڑے نکالتی ہوئی کومل نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''بس! آخری آئٹم ہے۔'' اور پھر آخری آئٹم کی تیاری میں اسے چند ہی منٹ لگے۔ اسی لمحے تراب وضو کر کے آ رہا تھا۔ کومل نے افطار سے بھری ٹرے اس کے حوالے کر دی۔

تراب ٹرے لے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ دو قدم پر ہی دروازہ تھا۔ بیل دینے پر انیس بیس سال کی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ کاٹن کے فیروزی سوٹ پر ہم رنگ دوپٹا نماز کے اسٹائل سے باندھے جاذب نظر نقوش اور گوری رنگت والی لڑکی تھی..... تراب نے چند لمحے اسے دیکھا..... پھر جلدی سے ٹرے آگے بڑھا دی۔

''میں آپ کے پڑوس سے آیا ہوں۔ امی نے بھجوایا ہے۔''

''شکریہ!'' لڑکی نے ٹرے تھام لیا۔

''ٹرے میں بعد میں لے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر تراب واپسی کے لیے مڑ گیا۔

تراب کے آنے تک برآمدے میں دسترخواں لگ چکا تھا اور سب لوگ دسترخوان پر بیٹھے تھے۔

''کیسے لوگ ہیں بھائی؟'' کومل پڑوسیوں کے بارے میں فکرمند تھی۔

''لوگوں کو تو نہیں دیکھا..... مگر جس لڑکی نے ٹرے لی اور بڑی زبردست تھی۔'' تراب نے کومل کے کان میں سرگوشی کی۔

''لڑکی.....! سچ کیا میرے جتنے ہوگی؟'' لڑکی کا سن کومل خوش ہوگئی۔

''ہاں تمہارے جتنی ہی تھی۔ بس اب چپ کرو۔ اذان ہو رہی ہے۔'' تراب نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے جب کال بیل بجی۔ کومل دروازے کی طرف لپکی باہر ایک پیاری سی لڑکی ہاتھوں میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔

''میں آپ کے پڑوس.....''

''جی جی اندر آئیں نا!'' کومل نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور اسے اندر لے آئی۔ شگفتہ بیگم بھی چلی آئیں۔ اس نے جھک کر شگفتہ بیگم کو سلام کیا۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔

''میرا نام میثال ہے۔ میں اور میری امی بس ہم دو ہی ہیں اور آپ.....؟''

''میں کومل ہوں، میرے بھائی تراب، جو افطاری دینے آئے تھے۔ امی اور ابا جی بس!'' کومل نے اپنا تعارف کروایا۔

''اچھا! اب میں چلتی ہوں امی کو چائے بھی دینا ہے۔'' جاتے جاتے وہ بڑے خلوص سے اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی۔

''ضرور آؤں گی، بیٹی! اپنی امی کو میرا اسلام کہنا۔'' شگفتہ بیگم نے کہا تو وہ ''جی بہتر۔'' کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''ویسے بھائی! لڑکی واقعی بہت پیاری ہے۔'' تراب اور وہاب نماز پڑھ کر واپس آئے تو کومل نے تمام تفصیلات اس کے گوش گزار کر دیں۔

''ارے ..... تمہاری تو سی آئی ڈی بڑی زبردست ہے۔'' تراب تفصیل سن کر ہنس دیا۔

☆☆☆

متوسط طبقے کی اس آباد میں وہاب صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ وہاب صاحب پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے جب کہ تراب بی کام کے بعد کسی ادارے میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ کومل کالج میں بی اے کے طالبہ تھی۔ شگفتہ بیگم سلیقہ مند خاتون تھیں، میاں کی آمدنی میں گھر بڑے سلیقے سے چلاتی تھیں۔ تراب کی ملازمت کے بعد ہاتھ کھلا ہوا گیا کومل اور تراب کی شادی کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے لگیں۔ ساتھ ہی تراب کے لیے لڑکی کی تلاش بھی شروع

کردی۔ کومل تراب سے چار سال چھوٹی تھی، ماں باپ کے علاوہ وہ بھائی کی بھی بہت لاڈلی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں میں نوک جھوک ہوتی رہتی۔ یوں کا گھرانا خوش باش اور آسودہ تھا۔

رمضان المبارک کا مہینہ ویسے ہی بہت مصروف ہوتا ہے۔ شگفتہ بیگم اور کومل باوجود چاہنے کے میثال کے گھر نہ جاسکیں اور پھر اتفاق سے ایک دن انہیں یہ موقع میسر آ ہی گیا۔

سبزی کی خریداری کے دوران دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے سے غائبانہ کے بعد بالمشافہ تعارف ہوگیا اور کومل امی کو لے کر ان کے گھر چلی آئی۔ تین کمروں کا صاف ستھرے صحن اور چمکتے ہوئے کچن والا یہ گھر بیٹی کے سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

''آداب آنٹی!'' کومل نے بڑے ادب سے سلام کیا۔

''جیتی رہو...... یقیناً تم کومل ہو'' کہہ کر انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی......!'' وہ مسکرائی اور پھر صوفے میں دھنس گئی لیکن میثال نے اسے بیٹھنے نہ دیا۔

''آؤ کومل! میرے کمرے میں چلیں۔''

تھوڑی دیر بعد میثال اسے اپنے کمرے میں لی آئی۔

یہ کمرا بھی صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی۔ الماری میں نفیس کتابیں......! کومل اس کے ذوق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جتنی پیاری وہ خود تھی اتنا ہی خوب صورت اس کا ذوق تھا۔

''میثال! لگتا ہے تمہیں شاعری سے بہت لگاؤ ہے؟'' ڈھیر سارے غزلوں کے مجموعے دیکھ کر کومل کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہاں خوب صورت اشعار میری کمزوری ہیں۔ فارغ اوقات میں یہی پڑھتی ہوں۔''

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کیا مصروفیت ہے تمہاری؟'' میثال نے فوراً ہی بات بدل دی۔

''وہی جو سب لڑکیوں کی ہوتی ہے۔'' کومل مسکرا کر کہا۔ ''تم اپنی سناؤ۔''

''بڑی مختصر سی تفصیل ہے۔ انٹر کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی ہوں۔ جب کہ امی ریٹائرڈ گورنمنٹ ٹیچر ہیں۔''

''تم نے آگے تعلیم حاصل کیوں نہیں کی؟'' کومل نے پوچھا۔

''بس حالات ہی ایسے ہوگئے تھے۔'' میثال نے دھیرے سے کہا۔ اس کی اداسی دیکھ کر کومل نے اس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

''شکر ہے تم ہمارے پڑوس میں آگئی ہو ورنہ تو امی کہیں دور نہیں جانے دیتی تھیں۔''

''میثال سے اجازت لیتے ہوئے کومل نے ہنستے ہوئے کہا'' اب ہماری کمپنی بہت اچھی رہے گی۔'' میثال نے بھی مسکرا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

جب کومل گھر لوٹی تو تراب اور وہاب تراویح پڑھ کر واپس آچکے تھے۔ شگفتہ بیگم دستر خوان لگا چکی تھیں۔

''اللہ! اتنی دیر بیٹھ گئی۔'' باتوں میں اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کومل نے حیرت سے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بہت تفریح ہو رہی ہے ہماری بیٹی کی۔'' وہاب صاحب نے پیار سے کومل کی طرف دیکھا۔

''جی ابو جی! برابر میں گئی تھی اور بھائی! میثال جتنی پیاری ہے ویسا ہی اس کا شوق ہے۔ اس کے پاس شاعری کی بہت ساری کتابیں ہیں۔ اس کی امی بھی بہت ڈیسنٹ ہیں اور......''

''بس بھئی اب بس بھی کرو۔'' تراب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے حالاں کہ اس کا دل چاہ رہا تھا اس کے بارے میں جاننے کے لیے۔

''جایئے نہیں بولتی آپ سے......'' کومل نے منہ بنالیا۔

''دوسری صبح تراب نے آفس جانے کے لیے گھر سے قدم نکالا تھا کہ میثال کے گھر کا دروازہ بھی کھلا۔ پلین کاٹن کے لائٹ گرین سوٹ پر بڑا سا پرنٹڈ دوپٹا اوڑھے کاندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے وہ آہستگی سے چلتی ہوئی۔ جب تراب کے پاس سے گزری تو تراب نے جلدی سے سلام کر ڈالا۔ جواب دے کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر تقریباً ہر روز ہی ایسا ہونے لگا اس روز عجب واقعہ ہوگیا۔ تراب حسب معمول آگے تھا اور میثال ذرا فاصلے پر۔ گلی کراس کرتے ہوئے یوں ہی تراب نے پلٹ کر دیکھا تو ایک غیر مانوس حلیے والا نوجوان میثال کے بے انتہا قریب چلا جارہا تھا پھر اس نے ایک غلط حرکت یہ کی کہ سگریٹ کا دھواں میثال کے منہ پر چھوڑ دیا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے میثال کو کھانسی آگئی تھی۔ تراب کا خون کھول اٹھا۔ وہ پلٹا قبل اس کے کہ وہ نوجوان میثال سے کچھ کہتا۔ تراب کا ایک زبردست گھونسا اس کی گردن پر پڑا۔ اس اچانک افتاد سے گھبرا کر وہ غصے سے پلٹا ہی تھا کہ دوسرے مکے نے اس کے چودہ طبق روشن کردیے۔ ''کمینے، بے غیرت انسان، شرم نہیں آتی؟'' تراب غصے سے بے قابو ہورہا تھا۔ اتنے میں گلی سے چند بزرگ حضرات اور نکل جنہیں دیکھ کر وہ لفنگا گھبرا گیا۔

''دیکھ لوں گا تجھے۔'' وہ شاید عادتاً دھمکی دے کر جلدی سے بھاگا۔

میثال بہت گھبرا گئی تھی۔ ''یہ..... یہ کیا کیا آپ نے؟''

''میں نے اسے بدمعاشی کی سزا دی ہے۔'' تراب غصے بولا۔

''مگر..... وہ اب آپ کو دھمکی دے کر گیا ہے۔ یہ لوگ بہت خراب ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔''

''تو کیا میں سب کچھ دیکھ کر انجان بنا رہتا.....؟''

''آئی ایم سوری تراب صاحب! میری وجہ سے آپ کو ذہنی اذیت ہوئی..... بہرحال اپنا خیال رکھیے گا۔''

''تراب نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر بولا۔ ''اور آپ بھی.....!''

میثال اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اسکول جانے کا ارادہ ترک کے گھر واپس ہوگئی۔

☆☆☆

آج اکیسواں روزہ تھا۔ آج شگفتہ بیگم کے ہاں افطار پارٹی تھی۔ میثال دوپہر سے ان کے ہاں آگئی تھی تاکہ کومل کا ہاتھ بٹا سکے۔ ساری تیاری عصر تک مکمل ہوچکی تھی۔ تراب کسی کام سے اندر آیا تو اسکائی بلیو سوٹ میں سر پر جارجٹ کا دوپٹا اوڑھے میثال اسے کوئی حور لگی۔ تراب کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ وہ جلدی سے پلٹ گیا مگر اس دوران وہ ایک فیصلہ کرچکا تھا۔

رات کو جب اس نے کومل سے بات کی تو وہ خوشی سے بھنگڑا ڈالنے لگی۔ ''بھائی! یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔''

جب کومل نے شگفتہ بیگم اور وہاب صاحب سے بات کی تو ناہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ویسے بھی وہ بہو کی تلاش میں ہی تھے اور پھر میثال جیسی مثالی لڑکی ہو تو کیا بات ہے۔ یوں دوسرے دن کومل اور شگفتہ بیگم بات کرنے کی غرض سے ان کے گھر پہنچ گئے لیکن ایک انکشاف نے انہیں حیرت کے سمندر میں ڈبو دیا۔

میثال کی امی کہہ رہی تھیں۔ ''یہ تو میثال کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے لوگوں نے اسے اس قابل سمجھا ہے مگر.....'' انہوں نے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے رگڑا..... اور کہا'' شاید آپ لوگ نہیں جانتے اتنی کم عمر میں میثال بیوگی کا دکھ دیکھ چکی ہے وہ بھی ایک نہیں..... دو دفعہ.....!''

''اف.....'' اتنی پیاری معصوم اور کم سن بچی کے ساتھ ایسا المیہ.....!'' شگفتہ بیگم کا دل بھی بھر آیا۔ انہوں نے میثال پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ کومل جتنی عمر ہوگی..... مگر کتنا درد تھا اس کے اندر..... پھر ان سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ وہ کومل کو لیے واپس آگئیں۔

''کیا.....؟'' تراب چیخ اٹھا۔

''ہاں بیٹا!'' شگفتہ بیگم بہت دل گیر تھیں۔

وہاب صاحب بھی بہت حیران تھے۔ ''بیگم! یقین نہیں آتا اتنی سی بچی..... بیوہ اور وہ بھی دو بار.....!''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا..... مگر..... مگر یہ حقیقت ہے۔ ایک بھیانک سچائی.....'' کومل بھی بہت دل گرفتہ تھی۔

''یا اللہ! اتنی پیاری سی لڑکی کے اندر کتنا درد ہے۔ کتنی ویرانیاں..... کتنی اداسی.....!

''لیکن..... بیٹا میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ بیوگی کوئی برائی یا لعنت نہیں۔ پھر بھی تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی.....'' نرم دل شگفتہ بیگم نے حتمی انداز سے تراب سے کہا تو سب ان کے فیصلے کو سراہا۔

☆☆☆

'' پلیز کومل! اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات مت کرنا.....'' کومل نے جب میثال کے کان میں یہ بات ڈالی تو میثال بھڑک اٹھی۔

''میری زندگی میں اب اس نام کی کوئی جگہ ہے نہ ضرورت.....!''

''مگر..... میثال یہ تو ضروری ہے نا.....؟''

''ضروری..... ہونہہ!'' وہ طنز سے ہنسی ''ایک نہیں دوبارہ دلہن بنی ہوں نا مگر..... کیا ہوا؟ کیا ملا؟..... تہی داماں..... تہی دست رہی..... دیکھو آج بھی میرا دامن خالی ہے۔'' اس کا غم اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ آنکھوں میں ویرانیاں اور وحشتیں تھیں۔

کومل اس کی وحشت زدہ آنکھیں اور سرخ پڑے چہرے کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''اچھا..... اچھا..... پلیز ریلیکس..... چلو ہم اب اس موضوع پر بات نہیں کرتے۔ چلو تم پانی پی لو۔'' کومل دوڑ کر پانی لے آئی۔ میثال قدرے سنبھلی تو اسے لے کر چھت پر آگئی جہاں کھلا آسمان تھا اور ٹھنڈی ہوا تھی.....!

☆☆☆

'' میں کیا کروں شگفتہ بہن.....! میں تو چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں وہ اپنے گھر کی ہوجائے مگر وہ کسی صورت نہیں مانتی..... کہتی ہے مرجاؤں گی۔ اب شادی نہیں کروں گی..... مگر وہ بھی کیا کرے۔ میرے بچی کے ساتھ اتنا برا ہوا کہ خدا دشمن کے ساتھ بھی نہ کرے۔ کتنی خوش، کتنی مطمئن رہا کرتی تھی میری بچی!'' شاہدہ خاتون ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگیں۔ شگفتہ بیگم ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ ہمہ تن گوش تھیں۔

☆☆☆

''امی! میرا رزلٹ آگیا ہے۔'' میثال چہکتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ وہ ابھی اسکول سے لوٹی تھی۔ میٹرک میں اس نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔ اکرام صاحب تو خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔

سارے محلے میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ انہی دنوں اکرام صاحب کی اکلوتی بہن بشریٰ بھی آگئیں جو عرصہ دراز سے سعودی عرب میں مقیم تھیں۔ میاں کے انتقال کے بعد وہ دل کی مریضہ بن گئی تھیں۔ اس لیے وہ اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے وجیح کے ساتھ مستقل پاکستان آگئیں۔ وہ میثال سے بہت پیار کرتی تھیں۔ پاکستان آنے کے کچھ دنوں بعد ہی انہیں دل کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ زندگی کے آخری لمحوں میں انہوں نے آخری تمنا کہہ کر اٹھارہ سالہ وجیح کا نکاح پندرہ سالہ میثال سے کردیا۔ اس اچانک افتاد سے میثال تو گھبرا گئی۔ اسے بھوری آنکھوں والا خوب صورت سا وجیح اچھا تو لگا مگر..... ابھی دونوں ہی میں بچپنا تھا..... ماں کے مرنے پر وجیح بہت ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ایسے وقت میں ماموں ممانی کے ساتھ میثال اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھے..... یہ ننھی سی لڑکی جو اس کی اپنی تھی..... اسے جان سے زیادہ عزیز ہوگئی تھی۔ اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوگیا تھا مگر..... میثال کی ہمدردی، محبت اور خلوص نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف راغب کیا اور اس نے میثال کے ساتھ ہی کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ دونوں ساتھ آتے جاتے تھے۔ کھانا، پینا، پڑھنا، کھیلنا، گھومنا، پھرنا غرض یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزم بن چکے تھے۔ یوں ان کی معصوم محبت پروان چڑھتی رہی۔

اس روز کالج سے لوٹتے ہوئے میثال کو گول گپے والا نظر آگیا۔ میثال مچل اٹھی۔ وجیح روڈ کراس کرکے ٹھیلے والے کے پاس جا پہنچا۔ میثال وہیں قریب درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ گول گپے لے کر وہ جیسے ہی پلٹا۔ سامنے سے آتی ہوئی تیز رفتار وین اسے روندتی ہوئی چلی گئی۔ یہ سب کچھ اتنا جلدی ہوا کہ میثال تو سکتے میں آگئی۔ جب اکرام صاحب اسپتال پہنچے تو داماد کی موت کے ساتھ بیٹی کو سکتے کی کیفیت میں پایا۔ شاہدہ خاتون تو پاگل سی ہوگئیں۔ میثال بے جان بت کی طرح منجمد ہوکر رہ گئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ہی طرف دیکھ رہی

تھی۔ جب وجیح کی میت اٹھائی جانے لگی تو شاہدہ خاتون کی گریہ وزاری نے اثر دکھایا اور میثال بھی چیخ کر رو پڑی۔ بین کر رہی تھی، کسی صورت قابو نہیں آرہی تھی اور وہاں موجود ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اس واقعے کے بعد میثال بالکل چپ ہو کر رہ گئی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز دور خلاؤں میں تکتی رہتی۔ اکرام صاحب اور شاہدہ خاتون بیٹی کی حالت پر تڑپ جاتے۔ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اکرام صاحب دل کے مریض بن گئے۔ باپ کی بیماری اور گھر کے حالات دیکھتے ہوئے میثال نے کسی حد تک خود کو بہتر کرلیا تھا۔ اب وہ ماں باپ کے سامنے نارمل رہنے کی کوشش کرتی اس نے دوبارہ سے کالج جانا بھی شروع کردیا تھا۔ کافی دن گزر گئے۔ میثال نے انٹر کا امتحان بھی دے دیا۔ اس عرصے میں شاہدہ خاتون کے دور پرے کے کوئی بھائی سیالکوٹ سے آئے۔ انہیں یہ معصوم اور پیاری سی میثال اتنی پسند آئی کہ انہوں نے جھٹ اپنے بیٹے کا رشتہ دے دیا حالاں کہ انہیں تمام حالات کا علم تھا۔

میثال نے سنا تو تڑپ اٹھی۔ ''نہیں امی جی.....! پلیز آپ منع کردیں۔''

مگر ماں باپ کے بہت سمجھانے پر اکرام صاحب کی طبیعت کے پیش نظر وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے کے لیے تیار ہوگئی حالاں کہ ایسا کرتے ہوئے کتنا تڑپی تھی۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ میثال نے بھی اپنی بہتری اسی میں سمجھی اور یوں نہایت سادگی سے نکاح ہوگیا۔ رات کو رخصتی تھی تمام تیاریاں ہوچکی تھیں اور اسے سیالکوٹ جانا تھا مگر قدرت کو تو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ باپ کی دہلیز پر برات کی منتظر بیٹھی رہی کہ..... اچانک شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ جگہ جگہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ دہشت گردی کی اس کارروائی میں برات زد میں آگئی۔ دلہا شکیب جو آگے گاڑی میں تھا۔ فائرنگ سے موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔

میثال اس خبر کے بعد اور سناٹے میں آگئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اکرام صاحب یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے اور دل پکڑے ایک طرف ڈھلک گئے..... یہ تقدیر کا کیسا مذاق تھا کہ ہر آنکھ اشکبار تھی..... ایک معصوم سی لڑکی آج دوسری بار کتنے بڑے المیے کا شکار ہوئی تھی۔ میثال کے کانوں میں عورتوں کے تبصرے زہر بن کر اتر رہے تھے۔

''ہائے ہائے دلہن بیچاری کی عمر تو دیکھو اور بیوگی..... ہائے بے چاری.....!''

''رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی..... کیسی تقدیر ہے بے چاری کی.....!''

''تقدیر اس کی کیا خراب ہوگی..... تو بے چارے دو جوان جہان لڑکوں کی خراب تھی..... مجھے تو لگتا ہے اس کے قدم ہی بھاری ہیں..... جس سے جڑی اسے کھا گئی۔''

''دلہن تو بن گئی..... سہاگن نہ بن سکی۔''

میثال سوچنے لگی شاید یہ سچ ہی کہتی ہوں..... میں ہی بدنصیب ہوں..... میرے نصیب میں شادی کا سکھ نہیں۔ وہ تڑپ اٹھی۔

مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا، کاروبار زندگی اسی طرح چلتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد شاہدہ خاتون اور میثال کافی حد تک سنبھل گئے۔ شاہدہ خاتون نے بھی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ میثال دن رات ان کے ساتھ لگی رہتی..... لگتا تھا وہ ڈر سی گئی ہے۔

واقعات کچھ بھی سہی مگر اس کی زندگی میں ٹھہراؤ اور وقار سا آگیا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے پرائیویٹ اسکول میں جاب کرلی تھی۔ وہ لوگ جس محلے میں رہتے تھے وہاں اکثر بوڑھی خواتین توہم پرستی کا شکار تھیں۔ اس لیے جوان بیٹیوں کو میثال سے دور رہنے کی تلقین کرتیں کہ مبادا اس کی نحوست ان کی بیٹیوں پر نہ پڑ جائے۔ مائیں اپنے جوان بیٹوں کو گھر کے آگے سے گزرنے نہیں دیتیں۔ شاہدہ خاتون اور میثال یہ بات جانتے تھے اس لیے انہوں نے وہ گھر فروخت کرنے کا ارادہ کرلیا حالاں کہ ایسا کرتے وقت شاہدہ خاتون کتنا روئی تھیں کہ اس گھر سے ان کے مرحوم شوہر کی یادیں وابستہ تھیں، یہاں کے کونے کونے سے انہیں میاں کی خوش بو آتی تھی۔ شاہدہ

کاتون نے ایک آدھ بار دبی دبی زبان سے میثال سے شادی کا تذکرہ کیا تو میثال بھڑک اٹھی۔

''کیوں امی! آپ چاہتی ہیں کہ پھر کوئی نوجوان میرے نام سے منسوب ہو اور ختم ہوجائے.....؟'' آواز میں بے انتہا تلخی تھی۔

''مگر بیٹی.....!''

''اگر مگر نہیں امی! اگر آپ میری زندگی چاہتی ہیں تو اس بات کا آئندہ کوئی ذکر نہیں ہوگا۔'' وہ حتمی انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور شاہدہ خاتون اپنی جگہ ساکت رہ گئیں۔

☆☆☆

شاہدہ خاتون نے سسکیوں کے درمیان کہانی ختم کی تو شگفتہ بیگم بھی برداشت نہ کرسکیں..... آگے بڑھ کر انہوں نے شاہدہ خاتون کو گلے لگالیا.....

''صبر کرو بہن اللہ بہتر کرے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ لوگ اتنے کاری زخم کھائے بیٹھے ہیں اور وہ میثال اتنی پیاری معصوم سی بچی کتنی ٹوٹی ہوئی..... کتنی بکھری ہوئی ہے۔ اپنے اندر کتنا بڑا آنسوؤں کا سمندر لیے پھرتی ہے..... مگر شاہدہ بہن! اب تم مجھے اپنی بہن سمجھ کر ہر بات کہہ سکتی ہو..... ان شاء اللہ میثال کے لیے بھی آگے خوشیاں فرش راہ ہوں گی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہوتی ہے اور مجھے لگتا ہے اب اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو مزید نہیں آزمائے گا۔'' شگفتہ بیگم کے لہجے میں ہمدردی کے ساتھ بے پناہ سچائیاں بول رہی تھیں۔

☆☆☆

عید سر پر آگئی تھی، میثال نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ امی کے اصرار پر اس روز وہ ایک ساتھی ٹیچر کے ساتھ بازار چلی آئی۔ بلا کا رش تھا، لگتا تھا سارا شہر امڈ آیا ہے۔ جیسے تیسے خریداری کے بعد وہ اس رش سے گھبرا گئی تو جلدی سے واپسی کی راہ لی۔ فرخندہ سامنے سے آتی ہوئی بس میں سوار ہوگئی مگر اس کی بس ابھی نظر نہیں آرہی تھی۔ اپنے مخصوص روٹ کی بس کی تلاش میں دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک اسے سامنے سے تراب آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کترا کر نکلنا چاہتی تھی کہ وہ بالکل سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''میری بات سنو۔'' تراب بولا۔ ''کیا میں بہت برا شخص ہوں؟''

''تراب کے بے تکے سوال پر وہ چونکی۔

''یہ آپ سے کس نے کہا.....؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''آپ کے انکار نے۔'' تراب نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں.....'' وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''اگر ایسی بات نہیں تو آپ نے رشتے سے انکار کیوں کیا؟'' تراب کے سوال پر وہ جم سی گئی۔

''پلیز تراب صاحب! یہ پوچھنے کا آپ کو کوئی حق نہیں..... میری مرضی اور میری زندگی ہے..... میں جو چاہوں گی کروں گی اور میں کسی کو اس میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' وہ قدرے سنبھل کر سخت لہجے میں بولی۔

''بے شک زندگی آپ کی، مرضی آپ کی اور مجھے کوئی حق نہیں دخل اندازی کا..... مگر میں صرف اپنے بے وقعت ہونے کی جاننا چاہتا ہوں جو آپ کی عزت واحترام میرے دل میں ہے اس کے ساتھ ایک خوب صورت سا جذبہ بھی ہے۔ ایک ایسا جذبہ جسے میں چاہت کا نام دوں گا۔ کیا اس کی تپش آپ نے محسوس نہیں کی.....؟ کیا آپ کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں؟'' تراب کا لہجہ ملتجی ہوگیا۔

''پلیز تراب صاحب! بس کریں..... میرے دل میں کوئی نازک جذبہ، کوئی احساس، کوئی تپش نہیں ہے..... میرا دل خالی صفحے کی طرح ہے اور میں اسے خالی ہی دیکھنا چاہتی ہوں..... بے شک آپ ایک اچھے انسان ہیں مگر میرے دل میں آپ کے لیے کچھ ایسا نہیں جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور میں آپ سے گزارش کرتی ہوں آئندہ آپ اس سلسلے میں کوئی بات نہ کیجیے گا۔'' وہ حتمی انداز میں بولی اور چلتی ہوئی رکشا اسٹینڈ کی طرف بڑھ

گئی۔

تراب ہونقوں کی طرح اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تیزی سے رکشے میں سوار ہوئی تو اسی وقت پرس کے نیچے دبی ہوئی ڈائری سڑک پر گر پڑی۔ رکشہ آگے جاچکا تھا۔ ''یہ لڑکی پاگل ہے شاید.....!'' تراب کو اس پر سچ مچ غصہ آگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈائری اٹھالی۔ تراب کا دل اس کے لیے مچل رہا تھا اور وہ اتنی ہی گریزاں تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی سمت چل دیا۔

رات کو خلاف معمول وہ جلدی کمرے میں آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کسی کی ڈائری پڑھنا بڑی غیر اخلاقی حرکت ہے مگر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے میثال کی ڈائری اور اوراق پلٹ دیے۔

ڈائری میں میثال کا روزنامچہ تھا۔ ہر دن کی کہانی۔ وہ پڑھنے لگا۔

''آج پڑوس سے افطار آئی۔ خاصا اسمارٹ سا بندہ تھا۔ میں ٹرے واپس کرنے گئی تو ایک پیاری سی اپنے نام کی طرح کومل لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ اچھے لوگ لگتے ہیں۔ شکر ہے اچھا پڑوس ملا ہے۔

کومل میرے پاس آئی۔ کافی وقت گزارا بہت پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔ شاید اپنے بھائی سے بہت پیار کرتی ہے بہت ذکر کرتی ہے مجھ سے کہتی ہے آگے پڑھ لوں مگر اب دل نہیں لگتا پڑھائی میں۔

آج صبح صبح تراب نظر آئے بہت ڈیسنٹ پرسنالٹی ہے۔ جانے کیوں ان کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے مگر..... کومل آئی تھی ان کی امی بھی بہت اچھی خاتون ہیں اور ابا بھی بہت شفیق لگتے ہیں۔ سلام کا جواب اتنے پیار سے دیتے ہیں کہ بے اختیار ابو جی یاد آجاتے ہیں۔

روز ہی تراب سے دعا سلام ہوجاتی ہے۔ میں نے ان میں ایک اچھا انسان دیکھا ہے۔ نیک اور شریف..... آج صبح اس لڑکے کی بدتمیزی پر تراب کا غصہ اور پھر تادیکھ کر میرے دل میں ان کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں مجھے خوب صورت چمک نظر آتی ہے مگر مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے اس لڑکے سے۔ خدا تراب کو حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

جانے کیوں..... تراب کا سامنا کرتے ہو۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے شاید..... ان کے لیے میرے ..... دل میں نہیں..... ایسا نہیں کرسکتی میں..... مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں.....

آج مجھے بہت افسوس ہورہا ہے کہ میں نے ..... کومل کو بری طرح جھڑک دیا جب اس نے مجھ سے تراب کے رشتے کے بات کی..... پر میں کر کروں؟ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی شاید..... اس لیے کہ میرے دل میں بھی تراب کے لیے کوئی میٹھی کسک ہے..... مگر میں اس بات کی خود کو اجازت نہیں دے سکتی میں..... ہرگز نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کوئی ہنستا بستا گھر پھر سے اجڑ جائے۔ جہاں قہقہے بکھرتے ہیں وہاں آنسوان کا مقدر بن جائیں..... آنٹی کتنی پیاری ہیں..... انکل کتنے شفیق اور ابو جیسے اور کومل کتنی معصوم اور بھولی بھالی..... تراب کتنے اچھے انسان ہیں۔ کتنی آسودہ زندگی ہے ان کی۔ میں اپنا منحوس سایہ ان پر ڈال کر..... ان کی ہنستی بستی دنیا میں شامل ہوکر انہیں اپنے جیسا دکھی نہیں کرسکتی۔ تراب ایک اچھے انسان ہیں..... چاہے جانے کے قابل ہیں، اس بات کا اعتراف کرتی ہوں..... کہ ..... شاید..... شاید میں بھی..... انہیں چاہنے لگی ہوں..... اگر میں عام لڑکیوں جیسی ہوتی تو آج کتنا خوش ہوتی کہ مجھے تراب جیسا شریک سفر نصیب ہوتا..... مگر میں تو..... بدنصیب ہوں۔

میں کوشش کروں گی کہ تراب کا سامنا نہ کروں..... میری خدا سے دعا ہے کہ وہ تراب کو ایسی شریک حیات نصیب کرے جو اس کے لیے خوشیاں لے کر آئے جو ان کی فیملی کے لیے مبارک ثابت ہو..... مجھے پتا ہے امی بھی دل سے یہی چاہتی ہیں کہ میں شادی کرلوں..... مگر میں..... پھر سے نہیں..... نہیں خدا مجھے ہمت اور حوصلہ دے (آمین)''

پھر آگے سارے صفحے خالی تھے۔

اف خدایا!..... تراب نے سر تھام لیا۔ کتنی بے وقوف لڑکی ہے..... محض ایک وہم کی بنا پر وہ اپنی زندگی خود ہی داؤ پر لگا رہی ہے۔ صرف دوسروں کی خوشیوں کی خاطر..... تراب کو اس پاگل پاگل لڑکی پر بے انتہا پیار آ گیا۔

اسی وقت تراب نے فیصلہ کر لیا..... اٹل فیصلہ.....!

سحری کے وقت اس نے کومل اور شگفتہ بیگم کو سب کچھ بتا دیا پھر وہاب صاحب کے مشورے کے بعد وہ سب لوگ ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

☆☆☆

آج انتیسوں روزہ تھا۔ چاند متوقع تھا اس لیے محلے کے حضرات اور بچے سڑکوں پر آ گئے تھے۔ وہاب صاحب، شگفتہ بیگم اور کومل کو لے کر بازار گئے ہوئے تھے۔ افطار کے بعد تراب چھت پر چلا آیا۔ میثال کی چھت ان کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ میثال بھی چھت پر موجود تھی۔ چاند نظر آ گیا تھا۔ باہر بچے شور و غل کر رہے تھے۔ میثال بھی آنکھیں بند کیے جذبے کے عالم میں آسمان کی طرف منہ کیے دونوں ہاتھوں کا ہالہ بنا کر دعا مانگ رہی تھی۔ لائٹ براؤن ڈبل جارجٹ کے ڈائس والے سوٹ پر ویسا ہی دوپٹا سر پر پھیلائے اس وقت وہ مقدس مریم لگ رہی تھی۔

تراب چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے دیوار پھلانگ کر عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دعا ختم کر کے منہ پر ہاتھ پھیر کر جیسے ہی میثال نے آنکھیں کھولیں۔ عین سامنے تراب کو دیکھ کر بری طرح گڑبڑا گئی۔

''آپ.....؟''

''جی میں!'' تراب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرے جھک کر کہا۔

''چاند مبارک ہو!''

''آپ کو بھی.....!'' وہ جلدی سے کہہ کر تیزی سے جانے کے لیے مڑی کہ تراب کے مضبوط ہاتھ نے اس کے نازک ہاتھ کو جکڑ لیا.....

''پلیز تراب! ہاتھ چھوڑیں میرا.....'' وہ قدرے غصے سے بولی۔

''نہیں جناب! ہم نے یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں تھاما۔'' تراب کی شوخی نے اسے مزید بوکھلا دیا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو کیا بہک گئے ہیں؟'' آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

''بہکی تو تم ہو پاگل لڑکی.....! جو بہکی بہکی باتیں سوچتی ہو۔'' تراب کی گرفت ہاتھوں پر بدستور مضبوط تھی۔

''تراب! پلیز کوئی دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا؟'' میثال کی حالت چوروں جیسی تھی۔

''کوئی دیکھ لے گا تو اسے یہ ڈائری دکھا دوں گا۔'' تراب نے ڈائری اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

''یہ سب کیا ہے.....؟ آپ کے پاس کیسی پہنچی؟'' وہ بے انتہا حیرت زدہ تھی۔ پچھلے دو دنوں سے وہ کتنی پریشان تھی اس ڈائری کے لیے..... میثال نے جھپٹ کر ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لی..... ''یہ سب کچھ کر کے آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ نیچی نگاہیں کیے عجیب سی کیفیت دوچار تھی۔

''بے شک میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے غلطی کی تمہاری پرسنل ڈائری پڑھ لی مگر مجھے آج اپنی اس غلطی پر شرمندگی نہیں ہے بلکہ شکر ادا کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ کا کہ مجھے تمہاری بے وقوفیوں کا علم تو ہوا۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ ''ایسی توہم پرستی..... بھلا ہم کون ہوتے ہیں قدرت کے کام میں دخل دینے والے..... جو شخص جتنی زندگی لے کر آتا ہے اتنا ہی جیتا ہے۔ اس میں میری یا تمہاری مرضی شامل نہیں ہو سکتی سمجھیں؟''

''پلیز تراب! میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے آواز کی کپکپاہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

''بہت ہوچکی تمہاری مرضی.....اور تمہاری الٹی سیدھی سوچیں..... اب وہ ہوگا جو سب چاہیں گے..... سب کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے تم نے تو.....کبھی غور سے تم نے شاہدہ آنٹی کو دیکھا ہے؟ ان کی آدھی بیماری تو تم ہو۔ کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کل کو اگر خدانا خواستہ انہیں کچھ ہوجائے تو تمہارا کیا ہوگا؟ اکیلی لڑکی ہو کر کس طرح رہ سکو گی؟ اور جہاں تک وجیح اور شکیب کا تعلق ہے تو دونوں اتنی ہی زندگی جیے جتنی وہ لے کے آئے تھے۔ اس میں تمہارا تو کوئی دوش نہیں تھا۔ ایسے حالات و معاملات میں ہمیں صرف اللہ پر شاکر رہنا چاہیے۔ شاید اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہو۔ تم نے کم عمری میں اتنے صدمے جھیلے۔ اتنے دکھ اٹھائے مگر اب جب خدا تم پر مہربان ہو رہا ہے.....تم کیوں انکار کر رہی ہو؟'' تراب نے ایک لمحے کے لیے رک کر میثال کو دیکھا۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

''مجھ پر رحم کریں تراب!'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

''رحم تو تم مجھ پر کرو۔ ان تمام رشتوں پر کرو جو ہم سے منسلک ہیں اور ہاں کان کھول کر سن لو.....! بہت ہوگئی تمہاری۔ اب ہم جو چاہیں گے وہ ہوگا کیوں کہ ہم سب تمہاری بھلائی چاہتے ہیں اور ہاں تیار رہنا آج رات کو ہمارا نکاح ہے پھر تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آجاؤ گی۔''

میثال کے پیروں تلے زمین نکل گئی.....''کیا کہہ رہے ہیں.....؟''

''ہم سچ کہہ رہے ہیں بالکل، اب اچھی بچی کی طرح نیچے چلی جاؤ آنٹی سے دعائیں لو اور میرے پاس آنے کی تیار کرو۔ کومل اور امی تمہاری کپڑے لے کر آتی ہی ہوں گی۔'' تراب اسے ہونق چھوڑ کر دیوار پھلانگ کر اپنی چھت پر آگیا۔

محلے کے چند بزرگ افراد کی موجودگی میں انتہائی سادگی سے میثال اور تراب کا نکاح ہوگیا۔ شاہدہ خاتون بہت مطمئن تھیں۔ کومل بے انتہا خوش، شگفتہ بیگم تو بار بار میثال کی بلائیں لے رہی تھیں اور یوں دل میں عجیب واہمے اور خدشات لیے میثال اپنے آنگن سے تراب کے آنگن میں چلی آئی۔

''دیکھو بھئی! اپنے قدموں پر چل کر صحیح و سالم تمہارے پاس آگیا ہوں۔'' کمرے میں داخل ہو کر تراب نے شوخ لہجے میں کہا تو میثال معصومیت سے اسے دیکھنے لگی۔ تراب کو بے اختیار اس پر پیار آگیا۔

☆☆☆

صبح اذان کے ساتھ میثال کی آنکھ لگ گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ برابر میں سویا ہوا تراب بالکل معصوم بچے کی طرح لگ رہا تھا۔ جانے کس خدشے کے تحت میثال دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے سینے پر سر رکھ کر سانس محسوس کرنے لگی۔ تراب کے منہ پر اس کے ریشمی بال بکھرے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

میثال کو اس کیفیت میں دیکھ کر تراب دھیرے دھیرے سے بولا۔ ''محترمہ! شکر کریں میں زندہ ہوں اور رات بھی خیریت سے گزر گئی۔''

میثال گھبرا کر جلدی سے اٹھ گئی۔ ''نئی زندگی کی نئی صبح اور خوب صورت ابتدا مبارک ہو ساتھ میں عید کی بھی بہت بہت مبارک باد۔'' تراب نے پیار سے ہاتھ تھام کر کہا تو میثال بھی مسکرا دی۔

''ویسے میثال! یہ میری زندگی کی سب سے حسین چاند رات تھی اور سب سے حسین عید ہوگی اور مزے کی بات دیکھو تمہارا ہو کر میں زندہ بھی ہوں۔'' تراب کی شوخی پر وہ تڑپ کر بولی۔

''پلیز.....تراب! آج کے بعد ہماری زندگی میں کبھی بھی یہ اسٹوپڈ ذکر نہیں ہوگا۔'' میثال نے تراب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شکر ہے خدا کا ہماری بیگم ایک رات میں ہی سمجھدار ہوگئیں۔'' تراب نے سکھ کا سانس لیا۔ میثال آسودہ ہو کر تراب کی بانہوں میں سما گئی۔ ایک زمانے کے بعد خوشیوں کا موسم اس کے دل میں چراغ جلانے کے لیے آیا تھا۔

☆☆

صبح وصال کی ماروں کا فسانہ، برق جس آشیانے پر گری اسے بنانے میں ایک زمانہ لگا تھا

جنون کی راہ پر دیوانگی کے پھول کھلتے ہیں۔ اس نے بھی چمن زاروں میں بہاروں کے خواب دیکھے تھے مگر رنجشوں کی منہ زور آندھیوں نے سب کچھ بدل دیا۔

ستارے ہم کو دیکھیں گے

کوثر ریاض

اعزاز کا خط پورے چھ مہینے کے بعد آیا تھا۔
وہ بھی ابا، امی کی بجائے حنا کے نام۔ حنا فخر سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ بھائی نے اسے اس قابل سمجھا یاد رکھا۔ وہ خط کو چوم رہی تھی۔ بھائی نے لکھا تھا۔

''حنا! اماں اور ابا کو بتا دو، میں ایک ماہ بعد کسی بھی دن ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ شپ کی ملازمت، جدائی کے موسم کی طرح خزاں کے رنگ لے کر آتی ہے، لیکن ملن کی رت کتنی حسین، پر بہار ہوتی ہے، اس کا لطف ہم جیسوں کو اپنے گھر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے لمبی جدائی کے بعد...... سب کو دیکھنے، اپنوں سے ملنے کے موقعے کتنے دلفریب ہوتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ابا نے خاندان والوں سے دور پشاور میں رہنے کا فیصلہ کر کے سب سے دوری اختیار کر لی۔ خیر میں کراچی میں سب سے مل آؤں گا اور گھر آ کر ایک اچھی سی دعوت کا انتظام بھی کرنا ہے جو لوگ وہاں ہیں، وہ اپنوں سے کم تو نہیں۔ ہاں تم اپنی سہیلیوں کی فہرست تیار رکھنا۔ روشی کی بھی دوستوں کو بلائیں گے اور ہاں یاد آیا۔ تمہاری وہ پگلوٹ سہیلی کیسی ہے، اسے ضرور بلانا۔''

اعزاز کو تو حنا کی تمام سہیلیاں ہی پگلوٹ لگا کرتی تھیں اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس سہیلی کا ذکر ہے۔ وہ روشنا کی طرف دوڑی۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے، روشنا سمجھا دیتی تھی۔ اس نے خط دکھا کر پوچھا۔

''روشی! یہ کس سہیلی کا لکھا ہے بھائی نے؟''

روشی نے حنا کے حیران چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''ارے اسی لمبی آنکھوں والی کا جو بھائی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتی تھی اور بھائی نے کہا تھا اس کی آنکھیں نارنگی کی پھانکیں۔ اچھی تو ہے، کیا خیال ہے، بھائی کے لیے ٹھیک ہے۔''

حنا منہ بنا کر رہ گئی۔ نارنگی کی پھانکوں پر دولت کا مسالا لگا ہوا تھا۔ اس کے ابا کو کاروبار میں زبردست منافع ہوا تھا اور وہ اچانک ہی بے حد امیر ہو گئے تھے۔ بھلا وہ بھائی کو کیا پسند کریں گے۔ گو بھائی بھی دولت کمانے شپ پر گئے تھے۔ تین سال سے وہ اس شپ پر تھے اور خوب پیسے بھیج رہے تھے مگر نومی کے ابا کے مقابلے میں ان کی حیثیت صفر تھی۔

بھائی کے لیے تو آمین ہی مناسب تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے مگر چچا نے ٹال دیا۔ امی کہتی ہیں کہ اسے ایک طرح سے انکار ہی سمجھو۔ بھائی کو امی نے باور کرایا تھا کہ وہ اونچے لوگ ہیں۔ اپنے ہم رتبہ رشتہ کریں گے اور تبھی تو بھائی نے ایجنٹ سے رابطہ کر کے شپ پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چچا کی پوزیشن کے مطابق بننا چاہتے تھے تا کہ چچا کو کوئی اعتراض نہ ہو۔

مگر امی نے کہا۔ ''چچا ہرگز نہ مانیں گے۔ ان کو...... اپنی دولت پر غرور بہت ہے اور آمین بھی تو اتنی پیاری ہے۔ اسے رشتوں کی کیا کمی۔ اس کے خالہ ماموں سب کے گھر لڑکے موجود ہیں۔ وہ سب خوش حال ہیں۔''

اور بھائی شپ پر گئے تو پھر آنے کا نام ہی نہ لیا۔

اب انہیں بہنوں کے جہیز کی فکر تھی اور گھر کی حالت کو درست کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً چیزیں بھی بھیجتے رہتے تھے۔ اب تو گھر کافی بہتر ہو گیا تھا ہائے آمین کتنی اچھی کتنی پیاری ہے۔ اس گھر میں اس کی آہٹیں رونق بکھیر دیں گی بھابی تو اور کوئی بھی بن سکتی ہے مگر آمین جیسی بہن اور دوست کہیں نہیں ہے۔ کاش! چچا مہربان ہو جائیں۔''

مگر امی کہتی ہیں۔ ''انہوں نے انکار کیا ہے، تو اب کیا اپنا تھوکا چاٹیں گے، ہرگز نہیں۔''

''بھائی آئیں تو اس باران کی منگنی تو کر ہی دیں گے۔''

''مگر کس سے؟''

''ہاں، کس سے۔ بھائی کو خط لکھا تو تھا مگر انہیں ابھی ملا نہیں۔'' ان کا تو جواب بھی چھ ماہ سے پہلے وصول نہیں ہوتا تھا اور چھ ماہ میں تو دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ آمین کی دنیا ہی بدل گئی۔ کون سوچ سکتا

تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، مگر ایسا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آمین اکیلی ہو گئی تھی۔ حالاں کہ گھر میں تو بے شمار لوگ تھے۔ قریبی عزیز، دور کے رشتے دار، پڑوسی جان پہچان والے اور ابا کے کاروباری دوست، مگر ابا سب سے روٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہی وار میں ڈھے گئے تھے وہ۔ اجل کا وار ہی اتنا سخت تھا۔ انہیں تو کبھی دل کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ باقاعدہ ورزش بھی کرتے تھے۔ احتیاط بھی، مگر دل نے ایسا دھوکا دیا کہ سب کو حیران کر گئے۔ حیرت اور صدمے کی شدت نے آمین کے آنسو بھی خشک کر دیے تھے۔ وہ خشک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس اژدہام کو دیکھ رہی تھی جو گھر میں جمع تھے مگر یہ کیسا ہجوم تھا، جہاں شور نہ تھا۔ دبی دبی سرگوشیاں تھیں اور مدھم آہٹیں۔

ابا کی رخصتی کا منظر اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ سب ابا کو لے گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی...... لوگ کہہ رہے تھے ''کاروبار میں سخت گھاٹا ہوا ہے اس لیے عابد علی برداشت نہ کر سکے۔ دل کی حرکت رک گئی۔'' ابا کا دل اتنا کمزور تو نہ تھا مگر جانے کتنا بڑا گھاٹا ہوا تھا کہ وہ جان سے گزر گئے۔

لاہور، پنڈی، ملتان سب جگہ سے رشتے دار پہنچے، بے شمار...... ٹیلی گرام اور خطوط بھی آئے۔

نہیں آئے تو پشاور سے چچا اور چچی اماں......

کسی کو تار نہ خط۔ کئی دن تک وہ منتظر رہی۔ ایک سوال زبان کی نوک پر آ کر اٹک جاتا، مگر کس سے پوچھتی۔

چچا کا خون سفید ہو گیا ہے، چچی اماں بھی خاموش ہیں۔ فون تو ان کے گھر پر بھی ہے اور روشنا حنا...... کیا یہ جاہل ہیں۔ دو لائن لکھنا نہیں جانتیں۔

جب گھر میں جمع مہمان واپس گئے، تب اس نے پھپھو سے ہی پوچھ لیا۔

''پھپھو! چچا ابا کیوں نہیں آئے۔ کیا انہیں خبر نہیں کی گئی......؟''

پھپھو نے سرد آہ بھر کر اس کے بالوں میں انگلیاں پرو کر کہا۔ ''خبر تو کی ہے، لیکن بھائی جان بہت بیمار ہیں بھابھی ان کی وجہ سے پابند ہیں۔''

''اور روشنا، حنا...... فون خط کچھ نہیں، لگتا ہے چچا خفا ہیں ابا سے۔''

''اپنوں کی خفگی ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتی ہے بچے۔ ادھر آیا، ادھر گیا اور پھر وہ ذات ہی نہ رہی، تو خفگی کس سے، بس مجبوری ہو گی کوئی۔''

پھپھو نے تو اسے تسلی دینا چاہی مگر دل کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ مجبوری...... کس کس کی مجبوریاں قابل اعتبار ہیں، اگر اعزاز ہوتا تو وہ سمجھتی کہ اس نے سب کو منع کیا ہے مگر وہ تو ملک میں تھا ہی نہیں۔ حنا نے بھی عرصے سے خط نہیں لکھا تھا۔ چچا بھی کبھی فون کر لیتے تھے۔ اتنا بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے اس سے یا ابا سے کہ جس کی سزا وہ خاموش رہ کر دے رہے ہیں۔

ہر گزرتا دن مایوسی کے بادلوں کو گہرا کرتا گیا۔

پھپھو بھی گھر چلی گئیں اور وہ بوا اور حشمت کے ساتھ گھر میں رہ گئی۔

پھر پھپھو بہاولپور جانے لگیں تو اسے بھی زبردستی ساتھ لے گئیں کہ اس کا دل بہل جائے گا۔

رفیعہ ساتھ گئی تھی۔ پھپھو کو بہاولپور میں رفیعہ اور صفیہ کے جہیز کے لیے دوپٹوں اور ساریوں پر کامدانی بنوانا تھی۔ شیڈو ورک کی بیلیں کڑھوانا تھیں۔ وہ آمین کو مشورے کے لیے لے گئی تھیں مگر شدید گرمی کے باعث وہ ان کے ساتھ زیادہ نہ رہ سکی اور اکیلی واپس آ گئی۔

☆☆☆

ثناء کی مہندی پر زبردست پروگرام بن رہا تھا حالاں کہ ابٹن کے دن ہی خاص دھما چوکڑی ہو چکی تھی اور جوڑے بنائے جا چکے تھے۔ جوں ہی رسم کے بعد ثنا چوکی سے اٹھی سب نے رفیعہ کو گھسیٹ کر بٹھا دیا۔ ساتھ ہی لڑکوں نے پکڑ کر ضیا کو دھکیل دیا۔ پھر تو قہقہے لگے تو رفیعہ بری طرح جھینپ کر بھاگی اور اب مہندی کے لیے بھی طرح طرح کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ گانوں میں اضافے، دولھا والوں کے ناموں کے ساتھ جملے بازیاں۔

نہ جانے کیا کیا پروگرام تھے۔ مہندی کے تھال آمین کے حوالے کرکے لڑکیاں بیوٹی پارلر سدھاریں کہ سب کو بال سیٹ کرانا تھے۔ آمین برآمدے میں بیٹھی ہاتھ میں دستانہ پہنے مہندی سجا رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں لڑکوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ ایک دوسرے پر فقرے کسے جا رہے تھے۔ گستی لڑی جا رہی۔ اچانک اس شور میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ طوفان سا امڈ آیا۔ ہنگامہ برپا ہوگیا۔ چند منٹ بعد ہی تیمور نے کمرے سے جھانک کر کہا۔

''صفیہ، مزنہ، بوا، ذرا جلدی سے چائے بنوا کر بھیجو۔ بھئی بڑی بڑی ہستیاں تشریف لائی ہیں، فرحت بھائی ہیں اور اعزاز الدولہ.....''

''کوئی نہیں ہیں، سب گھر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔'' ممانی نے صحن میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

''ارے۔'' تیمور نے باہر نکل کر آمین کو دیکھا۔

''یہ لڑکی نہیں ہے کیا۔ بھئی عزت مآب حضرت اعزاز الدولہ صاحب کی سواری آئی ہے۔ فٹافٹ گیارہ پیالی چائے بنوا کر بھیجو۔''

آمین کے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ وہ مہندی چھوڑ کر اٹھی۔ ممانی نے اسے مٹھائی کی جگہ بتائی۔

کچن میں کوئی چولھا خالی نہ تھا۔ رضیہ آپا اور بوا کے بڑبڑانے کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے چائے کا پانی رکھ ہی دیا۔ ممانی کے بتائے ہوئے پوشیدہ مقام پر مٹھائی کے ڈبے خالی ملے۔ ممانی نے سن کر سر تھام لیا۔

''ایسا غضب نہ دیکھا نہ سنا۔ کیسے چیونٹے ہیں۔ چلو تم حبشی حلوہ نکال لو۔ آٹے کے ڈرم میں ہے۔'' ایک اور پوشیدہ مقام۔

حلوہ بھی ذرا سا تھا۔ رضیہ آپا کی چڑچڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے سوجی نکالی اور بھون کر حلوہ بنالیا۔

پانی پک چکا تھا۔ جھٹ پٹ پتی ڈال کر پکا کر چائے بنائی۔

پیالیوں میں چائے ڈال کر حلوہ پیالے میں رکھ کر گیارہ چمچے بھی رکھ دیے۔ ٹرے بوا کو دے کر وہ پھر اطمینان سے برآمدے میں جا کر مہندی سجانے لگی۔ کمرے میں شور کے باوجود، اس کی آواز با آسانی سنائی دے رہی تھی۔

''کوئی ضرورت تو نہیں اور میں تھکا ہوا ہوں یارو، غور کرو۔ تین مہینے مسلسل سفر کرکے آج پہنچا ہوں۔ آرام کرنے فرحت کے گھر گیا تھا، یہ یہاں لے آیا۔ میں تو فوراً سو جانا چاہتا ہوں۔''

''سو جانا، اوپر کمر اخانی پڑا ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''مگر مہندی لے کر ضرور جانا ہے۔''

''مجھے مہندی کی رسم پسند نہیں۔ فضول اچھل کود..... میں سب سے ملاقات کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ اندر تو جانے دو مجھے، پھر چلوں گا۔''

''کوئی جانے دے گا تو چلو گے نا، یاد رکھنا، آسانی سے نہیں مانے تو مار مار کر اپاہج کر دیں گے ہم اور اسٹریچر پر ڈال کر لے جائیں گے۔''

''واہ، اچھی زبردستی ہے۔ بھئی میں ان رسموں سے الرجک ہوں۔ سخت خلاف شرع.....''

''اچھا مولانا صاحب! ادھر شپ پر تو وعظ کہتے ہوگے، مگر یہ خوشی کا موقع ہے۔''

''تو شادی تو خود ہی لفظ خوشی کا ہم معنی ہے۔''

''اچھا..... اچھا! اندر سب سے مل آؤ، پھر پروگرام بناتے ہیں۔''

دروازہ کھلا، کوئی باہر آیا، آمین کی انگلیاں لرزنے لگیں مگر آہٹ، قدموں کی چاپ پر۔ کے بغیر صحن میں چلی گئی۔ خالہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ممانی باتیں کر رہی تھیں۔ رضیہ آپا دوڑی آئیں۔ ایک وہی اپنی جگہ مجسمہ بنی بیٹھی رہی اور اسے دیکھ کر نہ دیکھنے کا تاثر دینے میں بھی وہ کامیاب رہا۔ مہندی پر ستاروں کا جال ٹیڑھا ہوگیا، کہکشاں بکھر گئی (جو افشاں سے بن رہی تھی وہ)

سب نے بزور اسے روکا۔ شام تک، وہ سب سے لڑتا رہا مگر کسی نے اسے جانے نہ دیا۔ لڑکیوں نے

بھی اسے خاصا تنگ کیا۔ تحفے مانگتی رہیں۔ وہ ٹالتا رہا۔

''کمال ہے، آپ کچھ لائے ہی نہیں، جو باہر جاتا ہے، وہ کم از کم بہنوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لاتا ہے۔''

''میں مزدوری کرنے گیا ہوا تھا، تحفے خریدنے نہیں اور یہ بھی مجھے علم نہ ہوا کہ میرے جاتے ہی کوئی ایسا انقلاب آیا ہے کہ یہاں پر چیزیں ملنا بند ہو گئی ہیں۔''

''ملنا بند تو نہیں ہوئی ہیں مگر مفت میں تو نہیں ملتیں۔''

''اور خیر سے یہ سب مفت خوریاں ہیں۔''

''آپ نہ بولیں، آپ تو خود مہا کنجوس ہیں۔''

''اچھا اب فرمائشوں کا سلسلہ بند کرو، یہ جو بالوں میں گھونسلے بنوا کر آئی ہو سر پر، ڈر ہے کہیں کوئی چڑیا آ کر نہ بیٹھ جائے اور انڈے نہ دے دے۔''

''سمدھیا نے پر رعب ڈالنے کا اچھوتا طریقہ..... نیا انداز، نرالی ترکیب۔''

''بس کرو، اور جھٹ پٹ تیاری کرو، جو تیار نہ ہو سکی، اسے ہم چھوڑ جائیں گے۔''

سب کمروں میں گھس گئیں۔ آمین نے سادہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے دوپٹے پر ستاروں کا جال تھا۔ اب اسے یہ دوپٹا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سب لڑکیوں سے پوچھ چکی تھی کہ کسی کے پاس سادہ دوپٹا ہو تو اسے دے دے۔ آخر رضیہ آپا کی بیٹی سارا کا دوپٹا اس کے سوٹ کا ہم رنگ نکلا۔ سارا تو خوشی خوشی دوپٹا بدل کر باہر نکلی۔ اترائی پھر رہی تھی۔ اعزاز نے پوچھ لیا کہ دوپٹا کہاں سے آیا تو وہ سرگوشی میں بولی۔

''پلیز اعزاز ماموں! کسی کو بتایئے گا نہیں کہ میں نے مینو خالہ سے لیا ہے دوپٹا، میں ذرا سب پر رعب جما کر آتی ہوں۔''

سامنے ہی تو آمین کنگھا کر رہی تھی مگر اعزاز نے دیکھ کر بھی رخ موڑ لیا۔ گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اتنی بے نیازی؟ چوٹی کو بل دیتے ہوئے وہ آنسو نہ روک سکی۔

خالہ نے اس کی بھیگی پلکوں کا راز پا لیا۔ ا
گلے لگا کر تسلیاں دینے لگیں۔

''نہیں خالہ! کوئی خاص بات نہیں۔ امی
خیال آ گیا تھا۔ سب موجود ہیں، ایک وہی نہیں
ہیں۔''

خالہ اتنی بے وقوف نہ تھیں کہ اس کے بہلاو
میں آ جاتیں۔ کئی شادیاں ہو چکی تھیں۔

تب تو اسے امی کا خیال نہیں آیا تھا۔ دس سا
ان کی وفات کو ہو چکے تھے۔ اگر وہ باپ کا کہتی تو الب
یقین کیا جا سکتا تھا۔ خالہ، ثنا کی ماں تھیں مہندی میں
نہیں جا رہی تھیں۔ ان بلڈ پریشر ہائی تھا۔ انہی کی آ
لے کر آمین نے بھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ا
اتنے ہجوم میں شوخ قہقہوں، سریلی جھنکاروں میں کس
کو احساس تک نہ ہوا کہ آمین جو دوپہر بھر مہندی سجا
رہی تھی۔ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ ثنا اس پر خفا ہوئی کہ
وہ کیوں نہیں گئی اور وہ سر درد کا بہانہ کر کے وہیں لیٹ
گئی۔ اس نے چادر سے جسم ڈھانک لیا۔ منہ پر دو
ڈال کر آنکھیں بند کیے پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر سب کو گ
ہوئی تھی کہ اعزاز نے ثنا کے کمرے میں دستک دی او
اندر آ گیا۔ ثنا نے سلام کر کے حیرت سے پوچھا۔

''آپ سب کے ساتھ نہیں گئے؟''

''دراصل میں تو اس رسم کے خلاف ہوں اور
ایسی رسم جس کی شادی ہو رہی ہے، وہی اس کو
انجوائے نہ کر سکے۔ سارے لوگ ہنس رہے ہیں، گا
رہے ہیں خوشی منا رہے ہیں اور جس کے نام پر یہ ہلا
گلا ہو رہا ہے، وہ ایک کمرے میں قید ہے، بھلا یہ کہاں
کا انصاف ہے؟''

''بس رہنے دیں اعزاز بھائی، غیر ممالک جا کر
آنے والے لوگ تو ان موقعوں کے متلاشی رہتے
ہیں، ترسے ہوتے ہیں بے چارے اور آپ.....!''

''بھئی، مجھے اس لحاظ سے اختلاف ہے
ناں..... شادی کسی کی، لطف دوسروں کے حصے میں۔''

''یہ بھی لطف ہی ہے کہ ایک ہستی کی خوشی میں شریک ہوکر دوسرے لطف اندوز ہو رہے ہیں میں تو بہت خوش ہوں کہ میری غیر موجودگی کی اہمیت نہیں۔ حالاں کہ سارا شور شرابا میری وجہ سے ہے۔''

''بھئی، تم بہت نیت سیر ہو اور ایثار پسند بھی۔''

''سب لڑکیاں ایثار پسند ہوتی ہیں۔''

''میرا تجربہ تو صفر ہے۔''

''تو آپ کوشش کریں تجربہ بڑھانے کی۔''

''ضرورت کیا ہے اور سناؤ کون صاحب ہیں یہ جن کے نام کا قرعہ نکلا ہے؟''

''مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' ثنا جھینپ گئی۔

''کسی نے نہیں بتایا کیا؟''

اعزاز کی نظر سامنے کروٹ سے لیٹی آمین کی جانب گڑ گئی تھی۔

''یہ کون ہے بھئی؟''

''بوجھیں تو جانوں۔''

''ہائیں، میں کیوں بوجھوں علم غیب تو نہیں رکھتا میں۔''

''آمین ہے۔''

''یہ سب کے ساتھ نہیں گئی؟''

''جی، سر میں درد ہے اس کے۔''

''سر میں تو میرے بھی درد ہو رہا ہے اور درد میں چائے سے افاقہ ہوتا ہے۔''

''بوا سے کہیے، بنالائیں گی، یا میں آمین کو جگا دیتی ہوں، وہی بنالائے گی۔''

''نہیں، رہنے دو اتنا عرصہ باہر رہا ہوں، اپنا کام خود کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ میں خود ہی بنالوں گا۔''

''آپ، چائے کے علاوہ اور کیا بنا لیتے ہیں؟''

''چائے کے علاوہ..... وائے..... کھانے کے علاوہ وانا..... اپنے علاوہ دوسروں کو بھی ٹھیک ٹھاک بنا لیتا ہوں۔''

''سمجھ میں نہیں آیا کہ اس چنڈال کمپنی نے آپ کو چھوڑ کیسے دیا۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ سر پھاڑنے سے دریغ نہیں کریں گے، ٹانگیں توڑ کر اسٹریچر پر لے جائیں گے۔''

''لے گئے تھے، مگر میں نے انہیں چکمہ دیا اور کھسک آیا۔ خبر ہونے میں دیر لگے گی۔ خاصا مجمع تھا وہاں، لوگ کھو سکتے ہیں۔''

ثنا ہنسنے لگی۔ ''جب خبر ہوگی تو دیکھیے گا۔''

''اپنی بوٹیاں نوچیں گے۔ اچھا اب چلتا ہوں تم کو دیکھنے چلا آیا تھا۔ اچھی لگ رہی ہو، چمک رہی ہو۔''

''جائیں، بناتے ہیں آپ۔'' ثنا شرما گئی۔

''بالکل نہیں، تم خود بنی بنائی ہو۔ میں کیا بناؤں گا بلکہ اور بگاڑ دوں گا۔ یار، میری ڈرائنگ خاصی کمزور ہے۔ میں تو تمہیں پیلے جوڑے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں تو یہ حلیہ نظر نہیں آسکے گا۔''

''اعزاز بھائی! آپ بھی اب کرلیں نا شادی۔''

''لو جی، نا شادی پہلے کہہ دیا، یعنی ابھی کرلوں، بغیر ماں باپ اور بغیر دلہن کے..... نا شادی۔''

''دلہن تو آپ جس کو کہیں گے ہم بنالیں گے۔'' ثنا نے ایک چور نظر آمین پر ڈالی۔

(بھلا کوئی سو سکتا ہے جب دو آدمی مستقل بک بک کر رہے ہوں۔)

''میری ناقص عقل میں یہ بات نہیں سماتی کہ آخر ہر خاتون مجھ سے یہ فرمائش کیوں کرتی ہے خود تو غلطی کی مرتکب ہو چکیں، دوسروں کو ترغیب۔''

''غلطی ہے؟''

''بلکہ مہلک غلطی..... زندگی بھر ایک ہی چہرا نظر کے سامنے رہا ہے۔ میں تو اس یکسانیت سے بہت جلد بور ہو جاؤں۔''

''تو پھر دو چار کرلیں؟'' وہ ہنس پڑی۔

''لگتا ہے مجھے بھگانے میں بہت دلچسپی ہے، چلا.....!''

''ارے..... ارے نہیں، اعزاز بھائی رکیے تو.....''

وہ پکارتی رہی مگر اعزاز جا چکا تھا۔ ثنا نے پھر آمین کو دیکھا۔

جنبش نہیں کی تھی اس نے۔ اتنی گہری نیند تو نہ تھی اس کی۔

رات دیر سے سب لوگ واپس آئے۔ شور سے آمین جاگ اٹھی۔ آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ شدت ضبط سے..... یا آنسوؤں کی فراوانی کے سبب۔ ثنا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''اماں! پشاور سے کوئی نہیں آیا۔ ماموں جان کی فیملی؟'' رضیہ آپا، پھپھو سے مخاطب تھیں۔

آمین کے کان کھڑے ہو گئے۔

''ہاں، پتا نہیں بھائی جان مصروف ہوں گے اور اعزاز تو آ گیا ہے۔''

''وہ پشاور سے تو نہیں آیا۔ شپ سے اتر کر آ گیا، اسے تو شادی کی خبر بھی نہ تھی۔ ماموں جان کو آنا چاہیے تھا۔ ان کی نمائندگی بھی ضروری تھی۔ ایک ہی تو لڑکی ہے خالہ زبیدہ کی۔''

''اپنی اپنی سوچ کی بات ہے، کوئی مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔'' پھپھو نے ٹالا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ ایک تو اتنی دور جا کر گھر بنایا۔ سارا کنبہ تو کراچی لاہور میں اور ماموں جان وہاں اکیلے پڑے ہیں۔ ممانی کا کیا دھرا ہے سب۔ ان کا خاندان جو ادھر ہے اور دور رہنے والوں کو تو ایسے موقعوں پر ضرور شریک ہونا چاہیے۔ پورا خاندان، برادری جمع ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میں سب سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔''

''چھوڑو رضیہ، کوئی اور بات کرو۔'' پھپھو، رضیہ کی محبت سے خائف رہتی تھیں۔

''اتنی دور سے آنا آسان تو نہیں۔''

''واہ! کیوں چھوڑ دوں۔ نہیں وہ کنبے سے پیچھا چھڑانے کے لیے تو یہ حرکتیں نہیں کر رہے؟ ان کی بیٹی کی شادی ہوگی تو کیا آپ نہیں جائیں گی..... دور سے کیا ہوتا ہے، دل نزدیک ہونے چاہئیں۔''

''اے توبہ رضیہ! ذرا سی بات کو داستانِ امیر حمزہ نہ بنا۔ اعزاز تو شریک ہو گیا اور شکوہ وہ کریں جن کے گھر کی شادی ہے ہمیں کیا۔''

''تو کیا ہم الگ ہیں؟ یہ ہمارے خاندان کی تقریب ہے۔ خالہ زبیدہ کی اکلوتی بیٹی کی شادی وہ بے چاری تکلف میں کوئی شکوہ نہیں کر رہیں، مگر ہم تو کریں گے، بولیں گے اور روشنا کی شادی کا بائیکاٹ کریں گے۔''

''فضول باتیں مت کرو، ہمیں کسی سے بدلہ نہیں لینا ہے۔''

''ہمیں تو لینا ہے۔'' رضیہ چڑ کر بولی۔

''ہم نئی نسل کے لوگ برابر کی بنیاد پر رشتے استوار کرتے ہیں۔''

''استوار کرتے ہیں کہ توڑتے ہیں۔'' پھپھو نے جھلا کر کہا۔

''تم اسی طرح جھگڑا کروا کر خاندان کو تفرقے کا شکار بنوا دو گی، چپ ہو جاؤ اب۔''

''اماں! انہوں نے کبھی بھی جوڑنے کی کوشش کی؟ ماموں کے جنازے پر نہ آئے۔ آنا تو دور کنارہ، کوئی تسلی کے دو بول فون پر بھی نہ کہے۔ یتیم بھتیجی کا انہیں خیال نہ آیا۔ اسے سرپرستی کی ضرورت تھی مرنے والا تو گیا۔ بچوں کا کیا قصور ہے کہ وہ بزرگوں کے دست شفقت سے محروم کر دیے جائیں۔ کیا یہ ان کا فرض نہ تھا کہ آمین کی خاطر آتے؟''

''چپ رہو۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ ایسی بات منہ سے نکالنا بھی نہیں چاہیے، وہ جانیں ان کا کام۔''

''اماں آپ تو سدا اپنے میکے کا بھرم رکھنے کے لیے پردہ پوشی ہی کرتی رہیں۔'' رضیہ خفگی سے جاتے جاتے رک کر بولی۔

''مگر جو حقیقت ہے، وہ سب پر ظاہر ہو چکی ہے اور اسے کوئی بھلا نہیں سکتا کہ آپ کے دونوں بھائیوں کے درمیان مخالفت کی ایسی دیوار قائم ہو چکی تھی جسے ایک بھائی کی موت بھی گرا نہ سکی۔''

''میں تو اس لڑکی کی زبان سے سخت عاجز

ہوں۔ وقت دیکھے نہ موقع، ادھر سسرال سے شکایتیں آتی ہیں۔ ایسے سچ کا کیا فائدہ جو دلوں کو آزار دے۔'

رضیہ جا چکی تھی، مگر پھپھو بڑبڑاتی رہیں۔

اور آمین کے سر پر جیسے دکھوں کا پہاڑ آن گرا۔ مخالفت کی دیوار؟ مخالفت کی دیوار..... کیسی مخالفت اسے کیوں معلوم نہ ہوسکا۔ ہوا کیا تھا کیا اعزاز کی یہ اجنبیت اسی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ رضیہ آپا سے پوچھو ں، مگر وہ بتائیں گی نہیں۔ شاید بتا دیں۔ پھپھو یقیناً ٹال دیں گی..... شادی کا ہنگامہ ہر طرف افراتفری تھی۔

کسی کو لمحہ بھر کی فرصت نہ تھی۔ شور تھا..... قہقہے..... مذاق..... لطیفے وہ مرجھائی کلی کی مانند ایک جگہ بیٹھی تھی۔ پہلے بھی اعزاز کے رویے پر دل برداشتہ تھی۔ اس نئے انکشاف نے تو دل پر غم کی سیاہ رات مسلط کردی تھی۔

خالہ نے اس کے لیے شوخ رنگ کا کامدار سوٹ بنوایا تھا۔ وہ ویسے ہی رکھا رہا۔ وہ ایک سادے کپڑے کا جوڑا پہنے ثنا کے پاس آ بیٹھی۔ ثنا اس کے چہرے کی اڑی رنگت، آنکھوں کی نمی اور لبوں کی لرزش سے جان گئی تھی کہ وہ مضطرب اور غم زدہ ہے۔ ضرور کسی نے کچھ کہہ دیا ہے لیکن ادھر اس نے کوئی سوال کیا۔ آمین کا دل غم سے بوجھل اور آنکھوں کا سیلاب جل تھل کردے گا۔ وہ بے قابو ہوگئی تو اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔

شادی کی تقریب، مہمانوں سے بھرے ہوئے گھر میں تماشا نہ بن جائے، اس لیے وہ خاموشی سے اس کے تاثرات پر غور کرتی رہی۔ آمین نہ جانے کس الجھن کا شکار تھی۔ کبھی بیٹھتی، کبھی اٹھتی۔ رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتی۔ کبھی کپڑے تہ کرکے الماری میں رکھتی، کبھی نکالتی۔ سٹر پٹر کررہی تھی بلاوجہ۔

لڑکیاں ثنا کے کمرے میں تیار ہورہی تھیں اور کمرے کا حال ابتر ہورہا تھا۔

روبی بھی آ چکی تھی۔ ثنا چند لمحوں بعد روبی کی معمول بن جانے والی تھی۔

''آمین! ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو، مجھے بڑی گھبراہٹ ہورہی ہے۔''

اس نے دبی زبان سے آمین کو پکارا تھا، جو کھڑکی کے پردے ڈال رہی تھی۔

''نیا انکشاف۔'' روبی ہنس دی۔

''ثنا بی بی کو گھبراہٹ ہو رہی ہے دلہن بنتے ہوئے۔''

لڑکیاں مذاق اڑانے لگیں۔ ثنا نے روبی کے ساتھ ہی بیوٹیشن کورز کیا تھا اور آج کل وہ اس کے بیوٹی کلینک میں کام کررہی تھی۔ نہ جانے کتنی دلہنیں وہ خود سجا چکی تھی۔ سب اسی بات سے لطف لے رہی تھیں۔ آمین اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سمجھانے لگی۔

''کہیں دور تو نہیں جا رہیں، ایک ہی شہر ہے پھر کیسا گھبرانا وغیرہ.....''

''تم کو معلوم نہیں آمین! میری ساس نے مجبور ہوکر یہ رشتہ کیا ہے، ورنہ ان کے خاندان میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی نہیں۔''

''تو تمہیں کیا فکر ہے؟''

''فکر..... مجھے تو خوف آرہا ہے۔ سنا ہے بڑی کڑوی زبان والی خاتون ہیں۔ راحت نے بتایا ہے کہ ابرار کی ضد کے سبب وہاں ان کے گھر تو روز طوفان آیا کرتے تھے، مگر آخر بیٹے کی ضد کے آگے جھکنا پڑا۔ راحت جانتی ہے کہ میں اس قصے سے الگ ہوں۔ یہ ان کا یک طرفہ فیصلہ ہے، مگر والدہ سمجھتی ہیں کہ میں نے ان کے معصوم بیٹے کو..... پھانسا ہے۔ حالاں کہ راحت سے دوستی ہے، وہ ایک دو بار راحت کے ساتھ ہوٹی پارلر آئے تھے بس..... میرا جرم اتنا بڑا تو نہیں ہے ناں۔''

''ظاہر ہے، ابرار کی بہن سے دوستی کو جرم نہیں کہا جاسکتا۔''

''دعا کرنا آمین! میں ان کا دل جیت کر سرخرو ہوجاؤں، ان کی غلط فہمی دور کرسکوں۔''

روبی اپنے ''پٹارے'' کو کھول کر بیٹھ گئی تھی اور اب ثنا اس کے سامنے ساکت بیٹھی تھی۔

☆☆☆

رخصتی کے بعد در و دیوار پر اداسی نے ڈیرے ڈال دیے۔ گھر تو مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، مگر لگتا تھا، ثنا ساری رونق لے کر چلی گئی۔ وہ خود تو دعاؤں سے جھولی بھر کر لے گئی، مگر گھر والوں کو غم ثنا کر گئی۔

خالہ نے کئی دن آمین کو روکے رکھا۔ اعزاز کب واپس گیا اسے کسی نے بتایا نہیں اور وہ تو اس سے یوں بے نیاز اور غافل رہا، جیسے جانتا اور پہچانتا ہی نہیں۔

ثنا دو تین مرتبہ آئی، مگر موقع نہ ملا کہ اس سے ساس کے سلوک کا پوچھتی، لیکن اس میں اب پہلے جیسی تیزی نظر نہ آئی۔ خالہ کی ہر بات وہ بے چوں چرا مان لیتی۔ شادی سے پہلے بہت ضد کرتی تھی۔ حجت کے بغیر کوئی بات مانتی نہیں تھی۔

تین بھائیوں کی بہن تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی۔ اس کے نخرے اٹھائے جاتے، ہر خواہش پوری کی جاتی۔ اگر سسرال میں اس کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی بھی ہوئی تو وہ تو برداشت نہیں کرے گی۔ نہ جانے پھر کس طرح شاید ابرار اتنے روشن خیال نہ ہوں۔ عام مرد کی طرح ماں کو فوقیت دیں اور بیوی کی حق تلفی انہیں نظر ہی نہ آئے۔

خالہ کو ہر طرح سے معلومات کرنا چاہیے تھی۔ ثنا نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا اور ابرار بھائی کتنے خوش نصیب ہیں کہ جو انہوں نے چاہا۔ انہیں مل گیا۔ دنیا میں انسانوں کی لاکھوں قسمیں ہیں اور سب اس ایک قسم سے (جو کہ وہ خود تھی) ہزار درجے بہتر تھیں۔ ارے اس پر کس نحوست کا سایہ تھا کہ کوئی ہمدرد سر پر ہاتھ رکھنے یا تحفظ دینے کو تیار نہ تھا۔

چچا ابا خدا جانے کس بات پر روٹھے بیٹھے تھے۔ پھپھو کو اپنے شوہر کی بدمزاجی کا سابقہ تھا۔ ماموں، ممانی سعودی عرب سے ریال کمار ہے تھے۔

ایک خالہ تھیں جو روز اس کو دیکھنے آجاتیں ساتھ لے جاتیں۔

اب خالہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنا گھر کرائے پر دے کر ان کے گھر آجائے۔ انہیں بہت فکر تھی کہ آمین کیسے اکیلی رہے گی، مگر آمین اپنے گھر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوئی تھی، جوان ہوئی، جہاں اس کے ماں باپ نے آخری سانس لیے اس سے اس کی وابستگی بہت گہری تھی۔

خالہ کے دلیل دینے پر کہ ''لڑکی ماں باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں شاید کہیں نہ جاسکوں اور آپ کا گھر سسرال تو نہیں۔ بوا اور بابا ہیں، حشمت موجود ہے، میں اکیلی نہیں ہوں۔ کیوں فکر کرتی ہیں آپ؟''

''تو بیٹا! پھر یہ تو بہت مشکل ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے پاس آکر رہنے لگوں۔ آخر میرے گھر کو کون سنبھالے گا۔ ایک بہو آگئی ہوتی، تو میں یہ بھی کر لیتی۔ دس چکر پنڈی کے لگا چکی ہوں کہ بھئی اب تاریخ دے دیں۔ حنا کے ساتھ ہی اکبر بھی نمٹ جائے مگران کی مجبوریوں کی داستان بڑھتی جاتی ہے۔''

خالہ سمدھیانے کے شکوے کرنے لگیں۔

☆☆☆

وقت وقت کی بات ہے۔ اتفاق یوں بھی ہوتا ہے کہ حشمت کسی بھاجی، بھتیجی کی شادی میں شرکت کے لیے ملتان گئی۔

اس کے اگلے دن ہی بوا کے جوان بھانجے کی اندوہناک موت کی خبر آگئی۔ خبر ملتے ہی بوا اور بابا روتے دھوتے سرگودھا چلے گئے۔ انہیں خیال ہی نہ آیا کہ آمین اکیلی کیسے رہے گی، یا اسے خالہ کے گھر پہنچا دیتے۔

رات سر پر تھی اور وہ بالکل اکیلی۔ بڑا سا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ٹی وی، ریڈیو لگا کر سناٹے سے نجات حاصل کی۔ رات بارہ بجے

نشریات ختم ہوگئیں۔

اچانک بجلی بھی چلی گئی۔ اب سناٹے، اندھیرے اور خوف کی حکمرانی تھی اور ہر سمت بھوتوں کے سامنے منڈلا رہے تھے۔ بستر پر سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اٹھ کر موم بتی کی تلاش کرنا بھی دشوار تھا۔ کبھی چور کی آہٹ، کبھی قاتل کی دہشت ناک آنکھیں، کبھی جن بھوت کے ہیولے۔ خوف اور ہیبت سے لڑلڑ کر نڈھال ہوگئی۔ دہشت نے بخار کی شکل اختیار کرلی۔ جو بدن سے چھوٹ گیا۔ اب وہ بخار سے جنگ کررہی تھی۔

صبح ہوئی، وقت گزر گیا، کب سورج نکلا اور روشنی نے خوف کو نگل لیا۔ اسی لیے نیند بھی آ گئی اور جانے کس مہربان نے صبح دروازے کی گھنٹی بجادی۔ بہ مشکل وہ اس قابل ہوئی کہ اٹھ کر دروازے تک جاتی۔ خالہ تھیں۔

اس کی صورت دیکھ کر ہی خالہ سمجھ گئیں کہ کوئی سخت پریشانی لاحق ہے۔ اسے بخار میں مبتلا دیکھ کر..... بوا، بابا اور حشمت کی غیر موجودگی تمام جرائم آمین کے سپرد کرکے وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ پھر ایک دن اس کے گھر جا کر سارا سامان ایک کمرے، ایک اسٹور میں بند کیا۔ ضروری کپڑے لے کر آ گئیں اور کہہ دیا۔

''بھول جاؤ کہ اب تمہیں وہاں قید تنہائی کے لیے چھوڑا جائے گا۔''

''خالہ مگر میں.....!''

''کچھ نہیں سن رہی میں۔''

''اتنا بڑا گھر اور اتنا اچھا باغ، پتا ہے اس باغ کو ابا نے خاص طور پر میرے لیے لگایا تھا۔ زمین کا پلاٹ خرید کر اس میں سارے پھل دار پودے میرے لیے لگوائے تھے۔''

''اے بی بی! سب معلوم ہے، مگر اس باغ کا پھل، اس مرحوم جنّی نے تو کھایا نہیں، جو اسے لگا رہا تھا۔ وہ تو پودے لگا کر ملک عدم سدھارے۔ تم کو یہ باغ کیا دے گا۔ رات اکیلی بخار میں بھن رہی تھیں تو باغ یا باغ کا کوئی پودا یا کوئی پتا تمہارے کام آیا۔ ارے یہاں آدمی، آدمی کے کام نہیں آتا، کوئی کسی کا دکھ بٹائے نہ درد بانٹے۔''

خالہ سخت ناراض تھیں۔ ان کی محبت بے مثال تھی اور خلوص لاثانی۔ اکبر، عمر، اثر بھی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ خالو تو تھے ہی سراپا شفقت۔

ثنا آئی، اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اب دونوں کی تنہائی کا مداوا ہوگیا، گو کہ اکبر، عمر، اثر تھے، مگر وہ لڑکے تھے اور ثنا کے جانے کے بعد کوئی رازدار نہ رہا تھا۔ ثنا خوش تھی کہ امی کو اس کا نعم البدل آمین کے روپ میں مل گیا ہے۔

''امی! مگر آمین زندگی بھر تو یہاں نہیں رہے گی۔ آپ ماموں سے بات کریں ناں، اعزاز بھائی کے لیے، اس سے بہتر رشتہ تو مل ہی نہیں سکتا۔ اپنے ہیں اور بچپن سے یہ دونوں ایک دوسرے کے رازدار، دوست رہے۔''

''میں کیسے بات کروں، زاہد بھائی کو خود رشتہ دینا چاہیے اور سنا ہے، بھائی، بھائی میں کچھ ان بن تھی۔''

''جس سے ان بن تھی، وہ دنیا میں نہیں، آمین سے تو ان بن نہیں ہوگی۔ کیا وہ اعزاز کے انتظار میں عمر گزار دے گی؟''

''بیٹا! پھر میں کیا کروں، وہ بڑے ہیں، بھائی کی میت پر آنے کی زحمت نہیں کی۔ بعد میں ہی آ کر بھتیجی کا دکھ بٹاتے۔ کوئی تسلی دیتے، اگر کچھ کہنے کی ہمت ہوتی تو ان کی اس بے حسی کا شکوہ کرتی..... لگتا ہے خون سفید ہوگیا۔''

''تو پھر خالہ شاہدہ سے کہیں، وہ ان کی سگی بہن ہیں کچھ کریں۔''

''وہ اندھی تو نہیں ہیں، کیا انہیں کچھ علم نہیں۔ یتیم بھتیجی اکیلی رہ رہی ہے۔ اس کا خیال نہ آیا تو شادی کی کیا فکر ہوگی۔''

خالہ کو فکر تھی مگر کس سے کہتیں۔ دونوں بھائیوں میں کیسی مخالفت تھی، اس کا بھید نہیں کھلا۔

ثنا کو میکے آئے کافی دن ہوگئے تھے۔ ابرار تو ایک بار آ کر خیریت پوچھ گئے تھے۔ ثنا کی مصروفیت کا بھی بتایا تھا، لیکن ثنا کہیں سے فون ہی کرلیں۔ خالہ بے چاری کو سانس کی تکلیف تھی۔ اکبر کرکٹ ٹیم کے ساتھ کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ عمر، اثر کے امتحان نزدیک تھے۔ پڑھائی میں جتے ہوئے تھے۔ خالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو آمین انہیں حکیم کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر کے علاج سے کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا تھا۔ حکیم صاحب خاصے بذلہ سنج، بے تکلف قسم کے معالج تھے۔

''ہاں جی، کہیے کیا تکلیف ہے؟''

''حکیم صاحب! بہت تکلیف ہے۔ سانس کا مرض ہے مجھے۔'' خالہ اپنی کیفیت بتانے لگیں۔

وہ ہنسنے لگے اور بولے۔

''یہ تو بہت مبارک مرض ہے آپا! لوگ تو آرزو کرتے ہیں کہ سانس رہے۔''

''سانس رہے، مگر اس کے ساتھ توازن بھی تو ہو اور توازن نہ ہو تو، زندگی سزا ہے۔''

''سچ کہا بی بی! اصل چیز ہے توازن۔ سانس کا آنا جانا تو معمول ہے مگر توازن ہونا لازمی ہے، ورنہ زندگی سزا بن جاتی ہے اور توازن تو زندگی کے ہر لمحے، ہر شعبے میں ہونا چاہیے۔''

حکیم کی دواؤں کا پلندہ لے کر گھر آئیں تو خالو نے منہ بنالیا۔

''ارے بابا! ڈاکٹر سے کہاں کی دشمنی ہے تمہیں، لے آئیں گٹھڑی بھر دوائیں، تمہارے لیے دو گولیاں کافی ہیں۔''

''ہاں، مگر مجھے دو بھی نہیں، ایک گولی بھی کافی ہے بندوق کی۔'' خالہ جل کر بولیں۔

''پستول کی کہو بیگم! بندوق تو بھاری چیز ہے، آپ ہیں دھان پان۔ اس کی اتنی بھاری گولی بھی آپ کے لیے زیادہ ہی ہوتی۔''

خالو مذاق کرنے میں کسی سے کم نہ تھے۔

حکیم کا نسخہ پڑھنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔ خالو نے ہی پڑھ کر سنایا۔ آمین ہدایات کے مطابق دوائیں کوٹنے، چھاننے اور ابالنے کا کام کرتی۔ پھر پیالہ بھر کر خالہ کے سامنے لاتی۔ اکیلی ہوتی تو سو دفعہ منہ بنا کر بہ مشکل دس منٹ میں دوا حلق سے اتارتیں۔ خالو سامنے ہوتے تو سانس روک کر ایک دفعہ ہی پی جاتیں۔

آمین کو ہنسی آجاتی۔ خالو سمجھتے تھے۔ ہنس کر کہتے۔

''بڑی بہادر ہیں تمہاری خالہ۔ ہاں بھئی، مزے مزے کا شربت ہے۔''

خالہ منہ پھیر کر ابکائی روکتیں۔

''اس بچی کو تم نے آزمائش میں مبتلا کر دیا؟'' خالو اسے روز دوائیں ابالتے اور چھانتے دیکھ کر بولے۔

''تمہاری بیٹی ہوتی تو ہرگز یہ کام نہ کرتی۔ سیدھی جاتی ڈاکٹر کے پاس۔''

''میری بیٹی بڑی خدمت گزار ہے اور میری فرمانبردار۔ وہ بھی یہی کرتی۔ بیٹیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں نیک اور فرمانبردار۔ یہ تو لڑکے ہوتے ہیں بدذات۔''

''ہوں..... ہوں میرے بیٹوں کو خبردار جو گالی دی انہیں۔''

''خالہ! اگر سب بیٹے ایسے ہوں تو لوگ کیوں چاہت کریں بیٹوں کی۔ نہ سب لڑکے برے ہوتے ہیں نہ سب لڑکیاں لاجواب۔'' آمین نے دونوں کے درمیان ثالثی کا فرض ادا کیا۔

''ارے ثنا کتنے دن سے نہیں آئی بیٹی آمین! ذرا کل جا کر اس کی خیریت لا..... میرا حال بتا دینا، مگر زیادہ نہیں، ابرار نے بھی کتنے دنوں سے شکل نہیں دکھائی۔''

''شکر کر خدا کی بندی، داماد نیک اور لائق ہے۔'' خالو نے تسلی کے انداز میں کہا۔

☆☆☆

خالہ کی خواہش تھی، آمین ٹال نہ سکی، ورنہ اس کا

بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ ثنا کی ساس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ انہوں نے ثنا کو عاجز کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں، مگر ثنا کبھی اقرار نہ کرتی۔ صبح اثر کر ساتھ لے کر وہ ثنا کے گھر جا دھمکی۔

سامنے برآمدے میں ساس بیٹھی تھیں۔ آمین اور ثریا کے سلام کے جواب میں منہ ٹیڑھا کر کے بولیں۔

''اچھا تم ہو، بہورانی کمرے گانے سن رہی ہوں گی اور کوئی کام ہی نہیں۔ اے شمی! جاؤ، بہو کی بہن کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔''

''کیوں آنٹی! میں آپ کے پاس نہیں بیٹھ سکتی؟'' آمین خوش گوار لہجے میں بولی۔

وہ حیران ہو کر بولیں۔ ''ہاں، ہاں مگر میں ہوں ذرا ٹیڑھی کھیر، اس لیے لوگ مجھ سے گھبراتے ہیں۔ ارے بہو مجھ سے گھبراتی ہیں تو ان کی بہن کو بھلا کیا دلچسپی ہوگی؟''

''میں سمجھی کہ میں اتنی ہیبت ناک ہوں کہ آپ مجھ کو برداشت نہیں کر سکتیں۔''

''لو اور سنو، برداشت تو میں تمہاری بہن کو کر رہی ہوں۔'' ٹیڑھی کھیر زیادہ ہی ٹیڑھی تھی۔

''آپ کی صحت کیسی ہے؟ خالہ نے آپ کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا ہے۔'' امی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''لو مجھے کیا ہونا تھا، یوں کہو، بیٹی کی یاد آ رہی ہے، اسی لیے بھیجا ہے۔''

''نہیں، وہ پچھلے دنوں سنا تھا کہ آپ کے گھٹنے میں درد ہے۔ خالہ خود بیمار ہیں، آ نہیں سکتیں۔''

''ہاں، ہاں وہ بہت پرانی بات ہوگئی۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہاری خالہ کیا بستر پر دراز ہیں کہ آ نہیں سکتیں۔ خیر دیر سے سہی، انہیں خیال تو آیا۔ شکریہ کہہ دینا۔''

''خالہ کافی دن سے بیمار ہیں۔ پہلے ڈاکٹر کا علاج کیا، کچھ افاقہ نہیں ہوا تو حکیم صاحب کو دکھایا ہے آپ بزرگ ہیں، دعا کریں اللہ انہیں صحت دے۔'' آمین روغن قاز ملے جا رہی تھی۔

''یہ بھی فیشن ہو گیا ہے کہ ذرا سی بیماری بڑھا کر بتانا، پہلے ڈاکٹر کو دکھایا پھر حکیم کو، اے بھئی ڈاکٹر کا علاج مہنگا، فیس زیادہ، صاف بات کہنے میں کسی کی نانی مرتی ہے، تو مرے۔''

وہ تنی سے جلبلا کر بولیں۔ ان کے کڑوے پن نے آمین کو سلگا دیا۔ شمی سے پوچھنے لگی کہ..... وہ اب کیا کر رہی ہے؟

''بی اے کے رزلٹ کا انتظار ہے۔'' شمی نے اسے بتایا۔

''اچھا! میں ذرا ثنا سے مل لوں، پھر چلتی ہوں، اثر کا بھی کل پیپر ہے۔ میں زبردستی پڑھائی سے اٹھا لائی بے چارے کو۔''

''بے چارے کا ہے کو ہوں گے، وہ تو مالک ہیں، ہمارے بیٹے کے سالے صاحب بادشاہ ہوئے۔ دیکھ لو سیدھے بہن کے پاس جا گھسے۔''

''اچھا چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔ اثر! آؤ بھئی۔'' وہ حد سے زیادہ الجھ گئی تھی۔

''اری شمی! بہو کو بلا لے، کل کلاں کو ہوگا کہ ساس نے بہو کو بہن سے ملنے نہیں دیا۔'' ساس چلائیں۔

شمی اماں کو گھورتے ہوئے آمین کو ثنا کے پاس لے گئی۔

ثنا کو کچن سے برآمد ہوتے ہوئے آمین دیکھ چکی تھی۔

''پلیز! ذرا دیر ٹھہریں، میں چائے لاتی ہوں، جب تک آپ بھابھی سے گپ شپ کریں۔'' شمی آہستہ سے بولی۔

''گپ شپ۔'' آمین کے دل سے دھواں سا اٹھ رہا تھا جی چاہتا تھا، سب کے گلے دبا دے۔ ثنا کا سب سے پہلے۔

ثنا نے آمین کو گلے لگا لیا۔ ہنس کر اس زحمت کے بارے میں پوچھا، جو آمین نے اس کے گھر آ

کر کی تھی۔

آمین کو ثنا کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ اف کس قدر تناؤ والا ماحول تھا اور ثنا ہنس رہی تھی۔

اثر نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''اچھا آپی! میں چلتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی آمین بھی باہر نکلی۔ ثنا نے انہیں روکا نہیں، وہ بھی باہر آ گئی۔ برآمدے میں اثر کو دیکھ کر بڑی بی نے اشارے سے روکا۔

''اے شہزادے! ذرا رکنا۔ دوسرے گھر میں اجازت لے کر آتے ہیں۔ یہ کہاں کی تمیز ہے کہ منہ اٹھا کر اندر جا بیٹھے۔ تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی۔''

آمین اور اثر ہکا بکا ہو گئے۔ ثنا کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔

اثر نے قدرے رک کر کہا۔ ''سوری آنٹی! آئندہ خیال رکھوں گا۔'' اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

آمین بھی اسے پکارتے ہوئے لپکی۔ شمی چائے لے کر آ رہی تھی، پیچھے سے چلائی۔

''آپی! آپی! چائے تو پیتی جائیں۔ اثر بھیا! رکو.....!''

اس نے ان دونوں کو گیٹ پر جا لیا۔ آمین کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''امی کی باتوں کا خیال نہ کریں، یہ ان کی مجبوری ہے، کریک ہیں ذرا۔ اثر بھیا! آؤ! اگر تم نے چائے نہیں پی تو میں سمجھوں گی کہ تم بہن کے گھر آ کر پچھتا رہے ہو۔''

''واقعی پچھتا رہا ہوں۔'' اثر سنجیدہ تھا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔

شمی، آمین کو پکڑ لائی۔ آمین توہین اور غصے کے اثر میں تھی۔ بڑی بی ابھی تک بڑبڑا رہی تھیں اور ثنا اسی جگہ چپ چاپ کھڑی تھی، جہاں آمین نے اسے پہلے دیکھا تھا۔

''ارے تو کیوں پیچھے دوڑی۔ وہ کیا ہم جیسے فقیر ہیں جو تیرے پاپڑ، چپس کھانے کو رک جاتے۔ یہ اونچے گھرانے کے لوگ ہیں۔''

''امی! اب چپ ہو جائیں۔'' شمی نے تلخی سے کہا۔ ''مہمانوں کی ذلت کر کے پتا نہیں کیا ملتا ہے آپ کو۔''

آمین اور ثنا کو لے کر شمی ڈائننگ ٹیبل پر برتن رکھنے لگی۔ چائے، چپس، پاپڑ اور کباب رکھ کر شمی واپس چلی گئی تو آمین نے ثنا کو دیکھا۔

''کیوں برداشت کر رہی ہو یہ سب؟''

''پھر کیا کروں، اپنی عزت، اپنی تعلیم، خاندانی برتری کو رسوا کروں، جواب دے کر، لڑ کر۔''

آمین چپ ہو گئی۔ جلدی سے چائے پی کر وہ باہر آئی تو بڑی بی کی مزاجی کیفیت بدل چکی تھی۔

''ابے بچی! تم کچھ خیال نہ کرنا۔ جانے مجھ کرموں جلی نے کیا کہہ دیا تمہیں، برا تو نہیں لگا؟''

''بہت برا لگا ہے، مگر آپ بزرگ ہیں، کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ ہم خاندانی لوگ برداشت کرنا جانتے ہیں۔''

بڑی بی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ثنا گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی۔

''امی کو بس خیریت بتا دینا۔''

آمین، پھپھو کے گھر کے راستے پر ہو لی۔ اسے ثنا پر غصہ تھا۔ یہ وہی ثنا تھی، جس کے نازنخروں کے چرچے تھے۔ ذرا سی نے اعتراض کیا، اس نے واویلا اور رونا دھونا شروع کیا۔ کوئی نصیحت کرے۔ یہ آپے سے باہر..... کسی کی ذرا سی تنقید کی برداشت نہ تھی۔ یہ تبدیلی کیوں کر آئی اس میں۔

☆☆☆

پھپھو گھر میں ملیں۔ رفیعہ صفیہ سلائی کر رہی تھیں۔ رضیہ آپی کپڑے الگ کر کے رکھ رہی تھیں۔ شاید کسی تقریب کی تیاری تھی۔ پھپھو نے لپک کر آمین کو گلے لگایا۔ رضیہ آپا نے لپٹایا۔

''مل گئی جناب کو فرصت، کچھ یاد ہے کس جنم میں ملے تھے ہم؟''

جنید بھائی نے کتاب میز پر رکھ کر اس کی

خیریت بھرپور طریقے سے دریافت کی۔ وہ دیوار کی آڑ میں تھے، نظر نہیں آرہے تھے۔

''آپ نے تو اتنا بھی نہیں کیا۔ میں آ تو گئی، اس کے علاوہ، میں اب خالہ کے گھر ہوں، جو یہاں سے بہت دور ہے۔ آپ نے تو رشتہ نبھانے کا ارادہ بھی نہیں کیا۔''

''کیوں، مجھ سے کیا رشتہ ہے۔ اگر تم سمجھتیں تو خالہ کے پاس جانے کے بجائے ہمارے پاس آتیں۔''

''جو مجھے لینے آیا، میں اسی کے ساتھ چلی گئی۔ آپ آتے تو انکار نہیں کرتی۔''

''خیر، یہ تو اب کہہ رہی ہو نا۔ ویسے اب ہمارے رشتے بھی ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔''

''ہمارے خاندان میں رشتے توڑنے کا رواج ہوگیا ہے۔'' آمین نے افسردگی سے کہا۔

رضیہ نے اسے گلے لگالیا۔

''ہاں میں بھی یہی کہتی ہوں۔ ہمارا خاندان..... خودغرضی کا نمونہ ہوگیا ہے۔ بڑوں نے بھی کوئی اچھی مثال نہیں پیش کی۔ ماموں جان کو دیکھو۔''

''رضیہ!'' پھپھو نے پکارا۔ ''بس کرو، بات نہ بڑھاؤ۔ سچ ہے، میں کسی قابل ہوتی تو اپنی بچی اپنے پاس لاکر رکھتی۔ آمیری جان، میرے پاس آ کر بیٹھ۔''

''اگر یہ صاحبہ خود آجائیں تو ہم نکال دیتے۔'' جنید کسمسا کر بولا۔

''جنید!'' رضیہ آپا نے ڈپٹ کر کہا۔ سچ کو مصلحت سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کے بجائے انہیں دور کرنا بہادری ہے۔ تم کسی قابل ہوتے تو امی یوں بے بس، بے اختیار نہ ہوتیں۔''

''بس سارے قصے میں قصوروار میں ٹھہرا۔ ہر کسی کو میں ہی نظر آتا ہوں۔ نصیحتوں، فصیحتوں کا ہدف، جیسے میری نالائقی نے دنیا کے سارے کام روکے ہوئے ہیں۔''

جنید بڑبڑاتا، پیر مارتا باہر چلا گیا۔

''آپا! اتنے دن بعد تو جنید بھیا ہمارے پاس آ کر بیٹھے تھے۔'' رفیعہ خفگی سے گویا ہوئی۔

''اب پھر خفا ہو کر چلے گئے، پھر ان کی صورت کو ترس جائیں گے ہم۔''

''تو کون سی حسین صورت ہے، جس کے دیکھنے سے گھر نعمتوں..... برکتوں سے مالا مال ہوجاتا ہے۔ نہ دیکھنا دو چار دن، ہڈحرام، نکما، آرام طلب، ہونہہ!'' رضیہ آپا تپی بیٹھی تھیں۔

''آپ کو تو ہر عیب انھی میں نظر آتا ہے، اپنے دیور کو تو جیسے دیکھا نہیں۔''

''کیوں، دیکھنا کیسا، صبح شام لتے لیتی ہوں۔ اس کے، مگر سچ کو کون آئینہ دکھا سکتا ہے۔ جتنے نکمے آوارہ لوگ ہیں، وہ سب میرے فصیحتوں کی لسٹ پر ہیں۔''

''لیڈری کا شوق۔'' رفیعہ نے مشین میں سر گھسا کر کہا۔

''فائدہ؟ نشتہ.....!''

آمین کا جی چاہتا تھا، اٹھ کر دوڑ لگادے۔ سب ایک دوسرے سے شاکی۔ امن چین کا زمانہ تو جیسے رہا ہی نہیں۔ عجیب خفا خفا سا ماحول تھا۔ اوپر سے رضیہ آپا کی تلخ سچائی۔ صفیہ اٹھ کر کسی کام سے چلی گئی۔

رفیعہ گلے کا نیا ڈیزائن بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

آمین نے رضیہ آپا کے پاس بیٹھ کر آہستہ سے پوچھ لیا۔

''رضیہ آپا! آپ کو تو پتا ہوگا۔ ابا اور چچا ابا میں کس بات پر کھنچاؤ ہوا تھا کہ چچا ابا، ابا کے مرنے پر بھی نہیں آئے۔ انہیں میری یتیمی اور بے کسی پر ذرا ترس نہ آیا اور اختلاف یاد رہا۔''

''خدا کو دیکھا تو نہیں، عقل سے پہچانا ہے۔'' رضیہ آپا نے اس کے سوال کو سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔

''مجھے کسی نے کچھ بتایا نہیں، بس اندازہ کرسکتی

ہوں کوئی بات تو ضرور ہے مگر کیا..... خود ماموں جان منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔''

''ایسی کیا بات ہوسکتی ہے رضیہ آپا! اتنا بڑا سانحہ گزر گیا۔ کیا انہیں دکھ نہ ہوا ہوگا۔ نہ صرف ابا کی اچانک موت، بلکہ ان کے کاروبار کا صفایا بھی ہوگیا۔ اگر اختلاف تھا تو ابا سے تھا۔ میرا تو کوئی قصور نہیں۔ مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہیں وہ۔ کیا آدمی کے ساتھ سارے رشتے تعلق ختم ہوجاتے ہیں، اگر ہوجاتے ہیں تو مخالفت کو بھی ختم ہونا چاہیے۔'' اگر مجھ سے بھی دشمنی ہے تو خالہ کو ہی ایک تار دے دیتے۔ وہ ان کی خالہ زاد بہن ہیں اور ان کے بہنوئی۔ چچا ابا کے بھی بہنوئی تھے۔''

''ارے بیٹا!'' رضیہ آپا نے اسے تھپکا۔

''یہ دنیا بس اسی طرح دکھاوے اور بناوٹ پر قائم ہے۔''

''تو دکھاوے کے لیے سہی۔ ان کی طرف سے ایک تار ہی آجاتا، دنیا ختم تو نہیں ہوئی۔''

''جھوٹ اس دنیا کا قانون بن چکا ہے میری جان، شکر کرو، تمہیں تمہاری خالہ کی محبت نصیب ہے۔ ان کا خلوص ابھی زندہ ہے تو سمجھ لو، دنیا ختم نہیں ہوئی۔''

''رضیہ آپا! خالہ تو امی سے زیادہ چاہتی ہیں مگر کبھی کبھی جی چاہتا ہے، مجھے چچا ابا چچی اماں بھی..... پیار کریں، کوئی تو ہو ابا کا اپنا سگا، جو میرے قریب ہو۔''

رضیہ آپا چپ ہوکر اسے پیار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد جیسے اچانک یاد آنے پر بولیں۔

''ارے ہاں فیصل آباد کے چک میں ماموں جان، ماموں میاں کی مشترکہ زمین بھی تو تھی۔ سنا ہے بڑی زرخیز زمین تھی۔ کچھ آمدنی اس کی آتی ہے؟''

''نہیں تو، مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔''

''کہیں وہ فروخت تو نہیں کردی ماموں میاں نے۔ تمہیں اطلاع ہونا چاہیے۔''

''نہیں، شاید وکیل صاحب کو علم ہو۔''

''بھئی زر اور زمین کے تنازعے خاصے جان لیوا ہوتے ہیں۔ اس زمین پر تو دونوں بھائیوں کا حق تھا۔ نانا کی خرید کردہ زمین تھی۔ نانا نے اپنی زندگی میں امی کو ان کا حصہ دے دیا تھا، اس لیے ہمیں تو کچھ خبر نہیں۔''

''رضیہ آپا! آپ نے ایک بار کہا تھا، دونوں بھائیوں کے درمیان مخالفت کی دیوار کھڑی ہے۔ وہ کیسی دیوار تھی.....؟''

''میں نے کہا تھا؟ اچھا..... یاد نہیں۔'' وہ صاف ٹال رہی تھیں۔

''اچھا سنو! اعزاز نے تم سے کچھ کہا، کوئی بات اپنی، جب وہ ثنا کی شادی میں آیا تھا۔''

آمین کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ منہ سے ایک لفظ نہ بول سکی۔ گردن سے انکار کردیا۔

''جی چاہتا ہے گردن دبادوں، یہ جتنے ہمارے خاندان کے خودغرض، بے حس لوگ ہیں۔ جوتوں سے چھترول ہونا چاہیے۔ زندگی کو مذاق بنانے والے کمینے، کتے۔''

رضیہ آپا طیش میں تھیں۔

''ارے شب کی زندگی رنگین بنانے والوں کو کسی معصوم کی جذبات کا کیا احساس۔ دفع کرو، بھاڑ میں جائے اعزاز۔ آمین! ذرا سی پروانہ کرنا۔ اچھا! میں تمہارا ساتھ دوں گی۔''

وہ جانے کے لیے باہر نکل رہی تھی تو پھوپھا صاحب اندر آرہے تھے۔ ترچھی بے رحم نظروں سے دیکھا۔

''ہوں، تو یہ آزادیاں ہیں۔ اکیلے اکیلے گلیوں، بازاروں کے چکر، اس گھر سے اس گھر طواف..... واہ! یہ شرافت ہے۔ ماشاءاللہ ہماری لڑکیوں نے ماں کے بغیر اپنی گلی نہیں دیکھی اور یہ .....''

رضیہ آپا سامنے آگئیں۔

''ابا! خدا سے ڈریں۔ خدا کسی پر برا وقت نہ لائے۔ آمین کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہے۔ ہمارا

خون ہے۔ یہی تو خوبی ہے ہمارے ننھیال کی، اپنے خاندانی وقار کو ہمیشہ اونچا اور قائم رکھا، کھرا خون ہے۔''

''اچھا ہوں تو دھیال کیا بدمعاشوں کا جتھا ہے؟'' پھوپھا ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''آپ خود جانتے ہیں، اپنے خاندان کو، میں کیوں کچھ کہوں۔''

رضیہ آپا نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔ بیٹی باپ سے دو ہاتھ آگے۔ نیا تازہ خون..... منہ پھٹ اور بے دھڑک..... رضیہ آپا کسی سے دبنا نہیں جانتی تھیں۔

آمین چپکے سے باہر آ گئی۔

تمام پھوپھا نے یہی وتیرہ اختیار کیے رکھا۔ سسرال پر گالیوں کی بوچھاڑ پھپھو واقعی بے جگر خاتون تھیں، جوان کی کم ظرفی کو برداشت کرتی رہیں اسی لیے رضیہ آپا بے لگام ہوگئیں۔ مگر وہ منافقت سے کام لینا جانتی تھیں نہ جھوٹ کو برداشت کر سکتی تھیں۔

خالہ کے پرسکون گھر میں راحت ہی راحت تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ثنا ہنستی مسکراتی ابرار کے ساتھ آئی۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ سسرال میں کس عذاب سے دوچار رہتی ہے۔ سب سے خوش ہو کر ملنا، اثر سے خاص طور پر لپٹ کر ملی۔ ماں کو پلنگ پر دیکھا تو خوب ناراض ہوئی۔

''اپنی حالت کو دیکھیں، مجھے بیماری کی خبر تک نہ کی۔ کیا میں غیر ہوگئی ہوں۔ گھر سے نکالا ہے، کیا دل سے بھی نکال دیا؟''

وہ خفا ہو رہی تھی، بگڑ رہی تھی۔ پہلی والی ثنا بن گئی۔

خالہ اسے مناتی رہیں۔ آمین چائے لائی تو ثنا نے کھانے پینے سے انکار کر دیا۔

خالہ نے داماد سے فریاد کی۔

''بیٹا! اسے سمجھاؤ، میں نے تو اس لیے اطلاع نہیں کی کہ یہ پریشان ہو کر دوڑی آئی ہے۔ اب تو ٹھیک ہوں، کمزوری ہے بس۔''

''ثنا! آنٹی کی کمزوری کا خیال کرو۔ یہ کیا بچپن ہے؟'' ابرار نے ساس کی حسب فرمائش ڈانٹا۔

''جب میں اس گھر کی کوئی نہیں ہوں، غیر ہوں تو کیوں کھاؤں پیوں۔''

''میں جو تمہارے گھر کھا پی کر آئی تھی، تمہاری ساس کے طعنے اور تشنے۔ کیا وہی سب مجھ سے سننا چاہتی ہو۔'' آمین نے دھمکی دی۔

''افوہ! بہت تیز ہوگئی ہو۔ بھئی میری ساس کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ تم کیوں نقل کرو۔'' ثنا نے ہنس کر کہا۔

ابرار کے جانے کے بعد دونوں کمرے میں بیٹھ گئیں۔

ثنا ماں کے ہاتھ پیر دباتی رہی۔ لطیفے سنا کر سب کو ہنساتی رہی۔ کیسی چلبلی ہو رہی تھی۔ بڑی خود اعتمادی تھی اس میں۔ اثر کو کل کی بات یاد دلا کر مذاق اڑاتی رہی۔ خالہ نے پوچھ لیا تو بولی۔

''امی! کل میری ساس نے اثر کو ذرا ڈانٹ دیا تھا، تو یہ سرخ چقندر ہو کر آ گیا۔ کھایا پیا کچھ نہیں۔''

''نہ بیٹے! بزرگوں کی بات کا برا نہیں مناتے۔'' خالہ نے نصیحت کی۔

اثر منہ پھلا کر چلا گیا۔

خالہ دوا پی کر سو گئیں تو وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ آمین نے ثنا کی کھنچائی کی۔

''آمین! میں وہاں بے بسی کی تصویر نظر آتی ہوں مگر بے بس ہوں نہیں اور وہ اس لیے نظر آتی ہوں کہ مجھے وہیں رہنا ہے۔ وہی میرا آشیانہ، وہی پناہ گاہ، وہی قلعہ ہے، کیوں کہ جس کی وساطت سے جس کے نام پر میں وہاں گئی ہوں، وہ میرا دلبر، دلدار، میرا دوست ہے، سمجھ گئی یا اور سمجھاؤں۔''

''بہت ہے، مگر اس عمل میں انا کچل جاتی ہے۔ عزت نفس کا قتل ہوتا ہے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوگی، چپ سادھو۔''

''انا کو ہوا بنانے کی میں قائل نہیں اور یہ معمولی باتوں سے پگلی بھی نہیں جاتی۔ اس کے علاوہ ابرار کو مجھ پر بھروسا ہے۔ تمی اور راحت میری ہامی ہیں۔ انوار میرا ثنا خواں ہے۔ اتنے لوگوں کی محبتوں کو میں ایک اپنی انا کی خاطر تو پامال نہیں کرسکتی۔ مجھ پر ان سب کی رفاقتوں کا قرض ہے، جو میں اسی طرح اتار رہی ہوں، اس لیے مائی ڈیئر کہ یہ اعتبار کا رشتہ سب سے مضبوط ہے، جو ابرار اور میرے درمیان قائم ہو چکا ہے اور جو ہم دونوں کی ہمت اور قربانیوں سے مضبوط تر ہو رہا ہے۔''

آمین کی سمجھ میں ثنا کی ''قربانی'' نہ آئی۔ شام کو ابرار نے اس سے بہت کہا کہ وہ دو چار دن یہیں رہے اپنی امی کے پاس، ان کی تیمارداری کے لیے مگر وہ رکنے پر تیار نہ تھی۔ ''پھر کسی دن آجاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ ابرار کے ساتھ چلی گئی۔

☆☆☆

موسم بدلنے کے ساتھ خالہ بھی صحت یاب ہو رہی تھیں۔ کمزوری البتہ بہت تھی۔ ثنا پھر ایک لمبا غوطہ لگا گئی۔ اس دن کے بعد پھر آئی نہیں۔ البتہ دو بار ابرار آکر خیریت معلوم کر گئے۔

پھپھو نے چچا ابا کا خط لا کر دیا۔ آمین کے نام خط میں اپنی چند مجبوریوں کا سرسری ذکر تھا، جس کی وجہ سے وہ اس کے پاس نہیں آسکے تھے۔ اس کے بعد روشنا کی منگنی کا بلاوا تھا۔

''تیاری کرلو، کل ہی بکنگ کرا لیتی ہوں میں۔''

''روشی کی منگنی، کیا بہت دھوم دھام سے ہو رہی ہے، جو یہاں تک دعوت نامے آگئے۔''

''نہیں، بس اپنے ہی ہیں۔ میں تم.....!''

''خالہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں۔ کمزور بہت ہیں اور پھر..... میری تیاری بھی نہیں ہے۔''

''تیاری کا کیا ہے۔ دو چار جوڑے رکھ لو، ہم چند دن تو رہیں گے۔''

آمین کو چچا ابا کے خط کا بھروسا نہ تھا۔ لگتا تھا، کسی اور سے لکھوایا گیا ہے یا پھر..... پھپھو کو منگنی کی اطلاع بہت پہلے تھی۔ انہوں نے اس کے ۔ فرمائش کر کے خط منگوایا ہے۔ اس دن رفیعہ، صفیہ سلائیاں، کسی تقریب کی تیاری ظاہر کر رہی تھیں۔

اس نے پھپھو کو سوچ کر جواب دینے کا کہہ ٹال دیا۔

خالہ اصرار کرنے لگیں کہ وہ ضرور جائے۔ موقع تھا روٹھوں کو منانے کا، دوریاں مٹانے کا، ا کے جانے سے ان لوگوں کا غبار بھی ڈھل جائے گا۔

''تم ثنا کو جا کر کہہ آؤ کہ وہ میرے گھر کا چ لگائے۔''

ثنا نے بھی تو اس دن کے بعد پھر پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔

☆☆☆

پھر وہی ساس، ان کی بدمزاجی اور کڑو لفظوں کا سامنا۔

''اے ہوگی کہاں اپنی محل سرا میں آرام کر رہی ہوگی۔ میں نے بھی تکلے کی طرح سیدھا نہ کر دیا تو نام بدل دینا۔''

''جی۔'' آمین بدحواس ہوگئی۔

''اتنی معصوم نہیں ہو، جتنا ظاہر کر رہی ہو۔'' و بگڑ کر بولیں۔

اور آمین اٹھ کر ثنا کے کمرے کی طرف بھاگی، مگر وہ کمرے میں نہ تھی۔ پھر وہ کچن کی پچھلی طرف سے ثنا کو آتے دیکھ کر آگے بڑھی مگر یہ کیا ثنا کا حلیہ بھی برا عجیب تھا۔ بکھرے بال، رنگ اڑا ہوا، ہاتھ میں جھاڑو، کٹر صاف کرنے والا ربر کا برش اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی آرہی تھی۔ آمین نے جلدی سے اسے پکڑا۔

''کیا ہوا ثنا؟'' وہ اس کی حالت سے پریشان ہوگئی۔

''گیس..... گیس چڑھ گئی دماغ میں۔'' ثنا جیسے نیند میں تھی۔

''کیسی گیس؟''

''وہ کٹر کی..... شمی! مجھے پکڑو، میں گری۔''

ثنا کو شاید صاف نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ آمین

کو بھی نہیں پہچان رہی تھی۔ آمین بے حد ڈر گئی۔ وہ زور زور سے چلانے اور شمی کو پکارنے لگی۔ شمی اور راحت آئیں بہ مشکل ثنا کو پکڑ کر کمرے میں لے جا کر لٹایا۔ شمی دوڑ کر محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

راحت ثنا پر پانی کے چھینٹ ڈالنے لگی اور اماں ،اس دوران ڈانٹنے اور چلانے کے فرائض انجام دیتی رہیں۔

''اری! یہ سب ڈراما بازی ہے۔ بہت شوق ہے اسے اداکاری کا۔ معصوم، مظلوم بننے کا۔''

''امی! چپ رہیں۔'' راحت، ثنا کی حالت دیکھ رہی تھی، جس پر مکمل غشی طاری تھی۔

مگر امی چپ ہونے والوں میں نہ تھیں۔ ڈاکٹر حمیدہ آئیں۔ انہوں نے ثنا کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ انجکشن لگایا۔

ثنا بے حد کمزور ہو رہی تھی۔ پلکیں تک کھولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''بی بی! میں نے پہلے بھی کہا تھا، ان کا بلڈ پریشر بہت لو ہے، جسم میں خون کی کمی ہے، انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

اماں ڈاکٹر سے الجھنے لگیں۔ ''کیا ہوا ہے اسے، چنگی بھلی تو ہے، کمزور کدھر ہے۔ کام سے بچنے کا بہانا ہے اور اس کی چالاکو بہن جب آتی ہے اسے کوئی پٹی پڑھا جاتی ہے۔ اسی نے بے ہوش ہونے کا ڈھونگ رچانے کا کہا ہوگا۔''

''اماں جی! آپ کی بہو واقعی بہت کمزور ہے، انہیں آرام اور غذا کی ضرورت ہے۔''

''اے تو ہر ڈاکٹر اپنی فیس بنانے کے لیے یہی کہتا ہے، تم بھی یہی کہو گی۔''

''چلیں آپ فیس نہ دیں۔ کوئی بات نہیں، آخر محلے داری کا حق ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر ہنس دی۔

''مگر آپ بہو کا خیال کریں، بچہ بہت کمزور ہے۔''

ابرار کو خدا نے فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ ڈاکٹر انہیں سب صورت حال بتانے لگی۔

''مجھ سے پوچھ، کچھ نہیں ہوا اسے، نخرے ہیں، ارے تیری بیوی گھر بسانے والی نہیں ہے۔ یہ لڑکوں کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اور نوکریاں کرنے والیاں بھلا گھر بسانا کیا جانیں۔ منٹ منٹ بعد بے ہوشی کا ڈھونگ۔''

ابرار، ڈاکٹر کو دروازے تک چھوڑنے گئے۔

پھر ثنا کے پاس آئے۔ وہاں آمین سر تھامے بیٹھی تھی۔

''آج میں نہ ہوتی تو آپ کی بیگم دوسرے جہان سدھار جاتیں۔ گٹر صاف کرنے میں گیس چڑھ گئی اور سن لیں ابرار بھائی، میں پشاور جا رہی ہوں، اب ثنا جانے، ان کی والدہ جانیں، یہی کہنے آئی تھی میں، اب چلتی ہوں۔''

''ثنا کو بھی ساتھ لے جائیں، میں آپ دونوں کو چھوڑ آتا ہوں۔''

''ثنا کو آپ قبرستان لے جایئے۔'' وہ جل کر بولی اور باہر آ گئی۔

یہ وہی ثنا تھی، جس کو پھولوں کی طرح رکھا تھا خالہ نے..... گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیا کہ اس کے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔ وہ گٹر صاف کر رہی ہے اور اس کو یاد نہیں کہ وہ کس قدر نفیس مزاج نازک طبع تھی۔ اکبر کے کمرے میں کبھی قدم نہیں رکھتی تھی کہ وہاں اس کے موزوں کی بو ہوتی تھی۔ اف! یہ لڑکیاں۔

وہ گھر پہنچی تو خالہ کو خوش دیکھا۔

''ابرار کا فون آیا تھا۔ ثنا کو ڈاکٹر حمیدہ کے کلینک میں داخل کیا ہے۔ ڈرپ لگی ہوتی ہے، کمزوری ہے بس۔''

''آپ کو خوشی ہو رہی ہے۔'' وہ تعجب سے کھڑی رہ گئی۔ کوئی پریشانی خالہ کو نہ تھی۔

''ان دنوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، اللہ خیر کرنے والا ہے۔'' خالہ مسکرائیں۔ شرما گئیں۔

اگلے دن صبح ابرار، ثنا کو چھوڑ گئے۔ ثنا ڈراپ

لگنے سے خاصی بہتر نظر آئی۔ آمین نے اس سے پھر بات کی اور شرمندہ کرنا چاہا کہ وہ اپنی انا، وقار اور عزت نفس کی قربانی دے کر کوئی بڑا تمغہ نہیں پا سکے گی۔ یہ ناقدر لوگ ہیں۔

''بات یہ ہے میری جان۔'' ثنا نے سنجیدگی سے کہا۔

''جس سے محبت کی جائے، اس پر جان نثار کرنا مشکل نہیں ہوتا، مگر جو ہم سے محبت کرتا ہے، اس کی خاطر..... انا و وقار، عزت، محبت، مجھے بے دریغ لٹانے میں فخر محسوس ہوتا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں کہ ابرار بھائی تم سے محبت کرتے ہیں۔''

''کبھی کبھی نظر آنے والا منظر دھوکا اور نہ نظر آنے والا سین حقیقت ہوتا ہے۔''

☆☆☆

اب وہ پشاور میں تھی۔ اسٹیشن سے ہی کوفت کا سامان ہونے لگا۔ اگر اسے علم ہوتا کہ اعزاز ابھی واپس نہیں گیا تو وہ آنے کا پروگرام ہی نہ بناتی۔ وہ اسٹیشن پر آیا تھا اور آمین پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ بے زاری اور مجبوری۔

وہ بھی پچھتائی ہوئی اپنی بے خیالی کو کوستی ہوئی چل رہی تھی۔ معلوم کیوں نہ کیا کہ وہ ہے یا گیا..... اب اس کی بیزاری اور بے نیازی کو برداشت کرنا، گھر میں داخل ہوئی تو جھجک کر پیچھے ہوگئی..... رفیعہ، صفیہ، پھپھو سب سے گلے مل رہی تھیں اور وہ پیچھے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ پھر حنا نے اسے دیکھا۔ چچا ابا نے اس کو گلے لگا کر پیار کیا۔ چچا ابا کے پاس سے ابا جیسی مہک آ رہی تھی۔

آمین کو ابا یاد آ گئے۔ وہ بزوران سے چمٹی ہوئی رو رہی تھی، جیسے بچھڑے ہوئے باپ سے عرصے بعد ملی ہو۔ وہی محبت، وہی حرارت جو ابا کے قرب میں محسوس ہوتی تھی۔ لاکھ آنسو روکنا چاہتی تھی مگر دریا طغیانی پر ہو تو ہر تدبیر رائیگاں ہو جاتی ہے۔

چچا ابا کے آنسو اس کے بالوں میں موتی پرو رہے تھے۔

ماحول اچانک بے حد سوگوار ہو گیا۔ چند لمحے پیشتر، پھپھو سے ملتے وقت کی وہ خوشی کی لہر معدوم ہو گئی تھی۔

پھپھو تھکا دینے والے سفر کی روداد سنانے لگیں تو چچی اماں نے کہا۔

''ارے یہ اعزاز کدھر گیا۔ روشی کے منگیتر کی تصویر اس کے پاس ہے، پھپھو کو دکھاؤ۔''

''تصویر کا کیا دیکھنا، کوئی اندازہ ہی نہیں ہوتا، میں اسے خود ہی چلتا پھرتا دیکھوں گی۔''

مگر رفیعہ، صفیہ بے تاب ہو گئیں۔ رفیعہ خود ہی تصویر لینے چلی گئی۔ چند منٹ بعد آ کر مایوسی سے بولی۔

''وہ تو بستر پر اوندھے پڑے ہیں۔ اتنی آوا یں دیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔''

''چلو سب چلتے ہیں۔'' حنا نے تجویز پیش کی۔

''آؤ آمین، روشی تم بھی آؤ۔''

وہ چاروں ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

آمین اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ابا کی یاد، چچا ابا کی صورت دیکھ کر امڈ رہی تھی۔ بار بار آنسو پلکوں میں آ کر اٹک جاتے۔ کبھی دامن سے لپٹ جاتے و سر جھکائے پھپھو اور چچی اماں کی باتیں سن رہی تھی مگر ذہن ماضی کی سیر کر رہا تھا۔

کئی سال پہلے یہیں اسی جگہ وہ بیٹھی ہنس رہی تھی۔

اعزاز اندر داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ حنا اور روشی اسے یوں رکتا دیکھ کر سوالیہ انداز میں دیکھنے لگیں۔

''میں سمجھا، یہ سامنے کوئی ڈیکوریشن پیس رکھا ہوا ہے قیمتی۔ میں سوچ رہا تھا یہ ابا نے کہاں سے منگایا ہے۔''

آمین جھینپ گئی۔

روشی اور حنا ہنس کر کہنے لگیں۔

''کراچی سے بھائی..... کراچی سے منگایا ہے یہ انمول موتی۔''

''اتنا بڑا موتی؟'' وہ انتہائی حیرت سے بولا۔

''قیمتی جو ہے، انمول۔'' اور سارا دن وہ دونوں اسے ڈیکوریشن پیس کہہ کر چھیڑتی رہیں اور ہر بار اعزاز ''قیمتی'' بلکہ انمول کہہ کر تعریف مکمل کرتا۔

تنگ آ کر وہ چچی اماں کی مدد کے لیے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

چچی اماں نے انہیں ڈانٹا تو اعزاز نے کہا۔

''اماں! کچھ غلط تو نہیں ہے، جہاں بیٹھتی ہے وہ جگہ جگمگا جاتی ہے۔''

اور چچی اماں بھی تائید کرنے لگیں۔

کتنا حسین وقت تھا وہ مگر اب وہ وقت اختلاف کی گرد تلے اوجھل ہو چکا تھا۔ آمین اب سچاوٹ نہیں بناوٹ تھی، جو چچا ابا کے ایک خط پر ہی بھاگی چلی آئی تھی۔

رفیعہ، صفیہ، روشی اور حنا دوسرے کمرے میں باتیں کر رہی تھیں۔

وہ پھپھو کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ جہاں پھپھو کی رہائش کا انتظام تھا۔ لڑکیوں کی باتیں، قہقہے، ہنسی کی جھنکاریں گھر میں گونج رہی تھیں۔ پھپھو اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔

کیا رفیعہ اور صفیہ کو آرام کی ضرورت نہ تھی، سفر تو انہوں نے بھی کیا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رونے کی وجہ سے آنکھوں اور سر میں درد ہو گیا تھا۔ پھر کوئی پھپھو کو بلانے آیا اور وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

برآمدے سے ان کی آواز آ رہی تھی۔

''آمین سو گئی ہے، نیند لے لے گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

چائے کی پیالیوں میں چمچے کی کھنک..... کاش! اسے بھی چائے مل جائے۔

سر میں اتنا شدید درد تھا کہ بستر سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ کچھ جھجک بھی تھی۔ کسی نے آ کر اسے بلایا نہیں۔ چائے کے لیے پکارا نہیں۔ وہ تکلف میں یوں ہی لیٹی رہی۔

اعزاز کی آواز بھی آتی رہی۔ ورنہ شاید وہ اٹھ کر چلی جاتی۔ وہ اپنی اس قدر افزائی پر مسلسل ہنستے جا رہے تھے اور اب تو آنکھ اور کنپٹی میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

شام ہو گئی پھر رات آ گئی اور حنا اسے کھانے کے لیے ''جگانے'' آئی تو اسے دو تکیوں پر ماتھا ٹیکے بیٹھا دیکھ کر حیران ہو گئی۔

''ارے ہم تو سمجھ رہی تھے کہ تم سوئی ہوئی ہو، چلو اٹھو، کھانا کھا لو، انتظار کر رہے ہیں سب۔''

''تم لوگ کھاؤ حنا! میں نہیں کھاؤں گی، دل نہیں چاہتا۔''

''مگر تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔''

''میرے سر میں سخت درد ہے اور متلی ہو رہی ہے پلیز! تم لوگ کھاؤ۔''

''بخار لگ رہا ہے۔'' حنا نے اس کے ماتھے کو چھو کر کہا۔ وہ اس کا سر دباتی رہی۔

پھر صفیہ آئی۔ ''حنا! تم بھی سو گئیں کیا، چلو نا! اتنی سخت بھوک لگی ہے۔''

وہ کچھ غور کیے بغیر بولتی رہی۔ ''ہائے اللہ آمین! دوپہر بھر ہم نے اتنی باتیں کیں کہ بس تھک گئے۔''

''ہاں، میں سن رہی تھی۔''

''ایں، تم سن رہی تھیں سوئیں نہیں کیا؟''

''اتنا سخت درد تھا، نیند ہی نہیں آئی۔'' اب بھی اس کی آنکھیں درد کی شدت سے سرخ اور بھیگی بھیگی تھیں۔

''اوہ! اعزاز بھائی تو کہہ رہے تھے کہ تم لوگوں کی بک بک میں کوئی سو سکتا ہے! اور آمین نے چائے بھی نہیں پی۔'' صفیہ کو افسوس ہو رہا تھا۔

صفیہ نے باہر جا کر سب کو بتا دیا کہ آمین کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ دوپہر بھر جاگتی رہی اور اسے کسی نے چائے تک نہیں دی۔

پھر کوئی خفا ہوا کہ آمین کو چائے کیوں نہیں دی گئی۔

چچی اماں بولیں۔ ''وہ کوئی مہمان ہے آجاتی۔''

پھر رفیعہ اور روشی نے کہا۔ ''مگر ہمیں تو بتا کئی دفعہ آکر بلا گئی تھیں کہ چائے پی لو۔''

چچی اماں کہہ رہی تھیں۔ ''میرا دماغ اتنا حاضر نہیں کہ ایک ایک کی خبر رکھوں۔''

روشی اس کے لیے کھانا لے آئی۔ اصرار کر کے کھلایا۔ چائے کے ساتھ درد کی گولی کھلائی۔ درد کم ہوا تو اسے نیند آ گئی۔

صبح اٹھی تو سارا بدن دکھ رہا تھا۔ لمبا سفر، آنسو، غصہ، اپنی بے قدری پر جھلاہٹ، سب مل کر اس کے درد کا سبب بنے۔

مگر صبح وہ نارمل تھی۔ وضو کر کے برآمدے میں آئی۔ کونے میں نماز کی چوکی تھی۔ اسے کمزوری کا احساس ہوا تو دیوار تھام لی۔

وہ بہ مشکل چوکی تک پہنچی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اسے ڈیکوریشن پیس بنا دیا گیا تھا۔ اسے چکر آ گیا۔ ماضی کے دھندلکے میں خود اپنی شبیہہ دیکھ کر سر تھام لیا۔ وہ ہنسی، کس قدر ہنسی آتی تھی اسے خصوصاً روشی اور حنا کے ساتھ، اعزاز کی باتوں پر۔

آنکھوں میں دھند چھا رہی تھی۔ نماز کے لیے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی مگر پتا نہیں کس نے اسے پکڑ لیا۔ دماغ میں سناٹا اور آنکھوں کے آگے غبار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ہو کیا رہا ہے نقاہت تھی، چکر تھا۔

بہ مشکل بیٹھے بیٹھے اس نے نماز پڑھی۔ سجدے میں سر کہیں گم ہو جاتا اور تاریکی چھا جاتی۔ نماز ختم کر کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دعا مانگے۔ اپنے لیے یا کسی کے لیے۔ ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ نہی دامن ہو گئی ہو۔

اس کی نماز کے دوران جانے کس نے چائے اور بسکٹ چوکی کے کونے پر رکھ دیے تھے۔ شکر ادا کر کے چائے پی اور دیوار تھام کر واپس کمرے میں آ گئی۔ پھپھو ابھی سو رہی تھیں۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد سورج نے کرنوں کا جال پھینکا۔ ہر سمت سنہرا رنگ بکھر گیا۔ کھڑکی سے اندر آنے والی کرنوں میں مٹی کے اڑتے ہوئے ذرات رنگ برنگی کہکشاں میں ڈھل گئے۔

☆☆☆

منگنی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ رفیعہ، صفیہ وہی کپڑا استری کر رہی تھیں جو آمین نے دیکھے تھے اور خیال کیا تھا کہ شاید کسی کی شادی قریب ہے۔ گویا پھپھو کو منگنی کی اطلاع اس دن بھی تھی۔ پروگرام بن چکا تھا مگر آمین کو نہیں بتایا اور اس کا یہ خیال بھی صحیح ثابت ہوا کہ چچا ابا کو لکھ کر، ان سے آمین کے لیے خصوصی خط لکھوایا منگوایا تھا۔ کسی اور نے ان کے نام سے لکھ دیا۔

سہ پہر سے ہی مہمان آنے لگے۔ روشی اور حنا کی سہیلیاں، چچی اماں کا کنبہ، ملنے والے سب جمع ہو گئے۔ گانے ہو رہے تھے۔ خوب شور مچا تھا۔ روشی زعفرانی سوٹ پہنے بیٹھی تھی اور سہیلیوں کو گانے کے سلسلے میں مشورے بھی دیتی جا رہی تھی۔ دولہا والوں کے آنے میں دیر تھی۔ حنا نے کہا۔

''چلو ہم ان سے پہلے ہی تحفے دے دیتے ہیں جب وہ آئیں گے تو اپنی رسم کر لیں گے۔ تم پھول پہناؤ۔ میں بھی ریشم کا کنگنا لاتی ہوں۔''

آمین نے پھپھو سے پوچھا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔

روشی کی سہیلی کے پاس کیمرا تھا۔ وہ تیار ہو گئی۔

آمین نے گیلے کاغذ سے پھولوں کا گہنا نکالا، الجھے ہوئے ہار سلجھاتے ہوئے پھولوں کی ٹرے حنا کے ہاتھ میں دے دی اور بسم اللہ کہہ کر سیدھے ہاتھ میں گجرا پہنا دیا۔ سارا کا کیمرا تصویر کے لیے تیار تھا۔ کھٹ سے تصویر کھینچی گئی۔ ابھی وہ گرہ لگا رہی تھی کہ چچی اماں نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر گجرا روشی کی کلائی سے نوچ لیا۔ ان کے دھکے سے حنا پھولوں

کی ٹرے سمیت گر پڑی۔

''کیا کر رہی ہو تم؟'' چچی چلائیں۔ ''ابھی رسم ہوئی نہیں کہ اس کے کورے بدن پر پھول سجانے آ گئیں۔ کسی سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں کیا مر گئی تھی۔ ہٹو یہاں سے۔ شاہدہ تم نے منع نہیں کیا۔ واہ! لحس ہاتھ لگوا دیے۔ اپنی منگنی تو ٹوٹ چکی..... میری بچی.....!''

انہوں نے اسے دھکا دیا اور جانے کیا کیا کرتی رہیں۔

وہ اب سب کچھ سن رہی تھی۔ دھکے سے وہ گری تو اسے لگا کہ کسی نے پہاڑ سے دھکا دے کر پاتال میں گرا دیا ہے۔ ہتک اور صدمے سے وہ گنگ ہو گئی۔ رنگ فق ہو گیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے پھپھو کو دیکھا۔ وہ نظر چرا گئیں اور مسکینی سے بولیں۔

''اے ہے، مجھے تو خیال ہی نہیں آیا کہ.....!''

چچی اماں وہاں سے جاتے جاتے بولیں۔

''جو کچھ کرنا ہے، دولہا والوں کے جانے کے بعد۔''

مگر اب اس وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ آمین کو چکر سا آ رہا تھا۔ وہ صحن میں آ کر ایک کرسی پر گر گئی۔ حنا زمین پر گرے ہار پھول چن رہی تھی اور ماں کے خلاف بڑبڑا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد حنا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور معذرت کرنے لگی۔ بہت شرمندہ تھی حنا۔

دولہا والے آئے، شور شرابا۔ ڈھولک ڈفلی، گانے بجانے ہوتے رہے۔ آمین جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی رہی۔ اپنی حیثیت کا ادراک ہونے کے بعد اب وہ کسی جوش کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ دولہا ہنسی مذاق کے دوران روشی کو..... انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ پھر اس نے اصرار کیا کہ وہ بھی روشی کے ہاتھ سے ہی انگوٹھی پہنے گا۔ روشی انکار میں گردن ہلا رہی تھی۔ آخر چچا ابا نے آ کر دولہا کو انگوٹھی پہنا کر جھگڑا نمٹایا۔

کھانے کے لیے سب مہمان صحن میں آئے تو روشی کمرے سے چلی گئی۔ آمین بھی اس کے پاس جا بیٹھی۔ چند لڑکیاں آ کر دولہا پر تبصرے کرنے لگیں۔

روشی نے آہستہ سے کہا۔ ''آمین، تم میرے پاس کیوں نہیں آئیں۔ دور بیٹھی رہیں۔ عامر نے پھر بھی تمہیں دیکھ لیا۔ خاص طور پر پوچھ رہے تھے۔''

''ہائیں، نظر باز لگتے ہیں۔ روشی ذرا قابو میں رکھنا۔'' کسی لڑکی نے کہا۔

دراصل آمین کی بردباری اور چہرے کا وقار ہر کسی کو متوجہ کرتا ہے۔ تم سب اس قدر ریک بک کر رہی تھیں اور آمین دور بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔

حنا اس کو بتا چکی تھی کہ وہ آمین ہماری کزن ہے۔ انہیں آمین سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ اتنا ذکر سن چکے ہیں نا۔''

روشی نے آمین کو گلے لگا لیا اور روشی کے جھمکے نے اعلان کیا کہ ان کا یہ پوز محفوظ کیا جا چکا ہے۔ اعزاز، کیمرا لیے اندر آیا تھا۔

''اللہ بھائی آمین کی تو کوئی تصویر لی نہیں گئی۔ ایک دو اور لے لیں۔'' روشی منت کر رہی تھی۔ اور وہ اس کی سہیلیوں کی کھٹا کھٹ تصویریں اتار رہا تھا۔

''سب چلے گئے۔ سب چلے گئے۔ میدان صاف ہے۔'' حنا شور کرتی اندر آئی۔

''آمین! امی نے کہا ہے اب جسے جو کرنا ہے، وہ کر لے۔ ہار وار پہنائے۔''

''ہاں بھئی بچیوں! اب تمہاری باری ہے۔'' چچی امی نے کن بچیوں کا کہا تھا۔ ہار پھول تو صرف آمین لائی تھی۔ سب کے ٹوکنے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھی۔

''اعزاز بیٹا۔ کیمرا لاؤ۔ تصویریں بہت اچھی ہونا چاہئیں۔'' چچی اماں لگاوٹ سے بولیں۔

پہلے حنا نے ریشم کا کنگن روشی کو پہنایا۔ پھر آمین نے ہار پہنائے۔ گجرے رفیعہ، صفیہ نے پہنا دیے۔ آمین نے سفید خوب صورت سوٹ روشی کو دیا اور حنا کو بھی انگوٹھی دی۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ اعزاز تصویریں لے رہا تھا مگر وہ کیمرا لے کر جدھر جاتا آمین رخ پھیر لیتی۔

''بھئی یہ کیا سلسلہ ہے۔ سب کو انگوٹھی پہنائی جا رہی ہے۔ آخر میرے حصے کی انگوٹھی کدھر ہے؟''

''بھائی! آپ جب کہیں۔ ہم آپ کو انگوٹھی پہنا دیں۔'' حنا نے چہک کر کہا۔

پھر آمین کو چپکے سے بتایا۔ ''وہ جو اورنج اور لباس میں لڑکی ہے ناں اس سے بھائی کی منگنی کا سوچ رہے ہیں ہم۔'' آمین نے بغور لڑکی کو دیکھا۔

''آخر میری باری کب آئے گی اور کہاں ہے انگوٹھی۔'' اعزاز برابر بول رہا تھا۔

پھر اس نے حنا کو انگوٹھی اتار کر آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا اور زور سے بولا۔

''اوہو، امیٹیشن نگ ہے۔ گھٹیا سا...... نرا دھوکا حنا اب تم اتنی بھی گئی گزری نہیں ہو کہ یہ معمولی انگوٹھی پہنو۔ ارے انگوٹھی تو روشی کی ہے۔ ہم تمہیں بھی ویسی قیمتی پہنانے کے چکر میں ہیں سسٹر۔''

حنا کے احتجاج کے باوجود انگوٹھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لی اور کیمرے کا فیتہ لپیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے لبوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

سب مہمانوں کے جانے کے بعد گھر والے کھانے کے لیے جمع ہوئے تو روشی کی سسرال پر تبصرے سے زیادہ اعزاز کے لیے لڑکی کے انتخاب پر رائے زنی ہوئی۔

''حنا! وہ اورنج سوٹ والی بہت اچھی ہے۔ بس وہی ٹھیک ہے۔''

''بڑی ہی بد دماغ ہے۔'' اعزاز نے رائے دی۔ ''سب کو نچا کر رکھ دے گی۔''

''وہ آسمانی شرارہ پہنے ہوئے جو روشی کی دوست تھی۔ اچھی ہے۔'' رفیعہ نے کہا۔

''وہ بڑی شیخی خور ہے۔ توبہ اور نخرے؟ اف خدایا۔''

''پھر وہ کالے سوٹ والی۔''

''اس کی منگنی ہو چکی ہے۔''

''اور اس کا منگیتر پچھتا رہا ہے۔'' اعزاز نے لقمہ دیا۔ ''منگنی ٹوٹنے کے بعد چانس ہے۔''

''ارے، اتنی اچھی اچھی لڑکیاں ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں۔'' چچی اماں پھپھو سے مخاطب تھیں۔

''آپا کی نند کی بیٹی ایسی پیاری، حسین، مہ جبیں، یہ لڑکا سنجیدہ ہوتو میں کہیں بات چلاؤں۔ اس کی بھی شادی ہوگئی۔ بھئی کون چھوڑتا ہے اچھی لڑکیوں کو۔ فٹافٹ بیاہی جاتی ہیں۔ یہ بولا ہی نہیں۔''

''بھابھی! اعزاز کی شادی خاندان میں ہونا چاہیے۔'' پھپھو جانے کیوں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھیں۔

''میں بھر پائی۔'' چچی اماں تیزی سے بولیں۔ ''اب انکار سننے کا حوصلہ نہیں اور سچی بات ہے کہ اب ددھیال میں تو اس کے جوڑ کی کوئی لڑکی ہے نہیں۔''

''تین تو سامنے بیٹھی ہیں۔'' اعزاز نے چپکے سے کہا۔ حنا اور روشی ہنس پڑیں۔

''آمین! تم بھی تو بولو۔'' چچی اماں بطور خاص اس کی طرف مڑیں۔ ''آج جو لڑکیاں آئی تھیں ان میں کون سی اچھی رہے گی اعزاز کے لیے۔ آخر کو تم بہن ہو۔''

یہ وہ چچی اماں تھیں جو جی جان سے آمین کو بہو بنانے کے درپے تھیں۔ یہاں تک کہ جب ایک بار اعزاز نے اسے سسٹر کہہ کر بلایا تو بہت خفا ہوئیں اور کہا آئندہ آمین کو بہن نہ کہنا۔ بس کزن کہنے کی اجازت دی تھی اور آج جما جما کر اس سے رائے لی جا رہی تھی۔ آمین سٹپٹا گئی۔

''جی...... میں کیا بتاؤں۔ سب ہی اچھی تھیں۔''

''اماں! سب سے کرلوں؟'' اعزاز معصوم صورت بنا کر بولا۔ سب کو ہنسی آ گئی۔

''یہ مذاق نہیں ہے اعزاز تمہارے ساتھ کے سب لڑکوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اب کیا تم بڑھاپے میں کروگے؟''

''سب ایک غلطی کریں۔ تو لازم ہے کہ میں بھی کروں۔ مجھے پیسہ اکٹھا کرنے دیں آپ۔ ابھی اتنی دولت نہیں کمائی کہ کسی سرمایہ دار کی لڑکی کی طرف نظر

اٹھا سکوں۔"

اس نے آمین کو اچٹتی نظر سے دیکھا۔ "اور یہ اورنج سوٹ والی بے حد دولت مند باپ کی بیٹی ہے اور میں..... اب ان پیسے والوں کی طرف تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گا۔"

اسے غصہ آ گیا تھا۔ بغیر کھانا پورا کیے وہ باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے ایک قہر بھری نظر آمین پر ڈالی تھی اور آمین اپنی جگہ پتھر کی بن گئی۔

"سب پیسے والے ایک جیسے نہیں ہوتے کیسے سمجھاؤں۔" چچی اماں بھنا کر بولیں۔ "اب مرنے والوں کو کچھ کہنا بھی گناہ ہے۔"

انہوں نے بھی چور نظر آمین پر ڈالی۔ نہ جانے آمین کا کیا قصور تھا اور اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی۔ اشاروں کنایوں میں باتیں اسے بھی پسند نہیں تھیں۔ مرنے والوں کے بجائے..... آمین کے ابا کا نام لے سکتی تھیں بلا تکلف..... کون روکتا ان کی زبان۔

چچا ابا اپنے کمرے میں تھے۔ وہ رات کا کھانا جلد کھا کر لیٹ جاتے تھے۔ رات دیر تک سب روشنی کے جوڑے، مہندی، چوڑیاں، انگوٹھی اور سلامی کا ذکر کرتے رہے۔ مہمانوں پر اعتراض اور تبصرے۔ اعزاز بھی آ گیا اور مضحکہ اڑانے میں پیش پیش رہا۔

"اور روشی..... تمہاری ایک نند بالکل بند گوبھی کی طرح لگیں۔ پہلے تو منہ بنا کر بیٹھی رہیں۔ میں نے ان کا حال پوچھا۔ تو چہرے کا زاویہ تبدیل ہوا۔ پھر حنا کی بات پر مسکرائیں۔ غرض بند گوبھی کی طرح پرت اترتے چلے گئے۔ کھانا کھاتے وقت تو وہ اندر کا نرم گودا رہ گئیں۔ ویسے ہمارے ہاں بھی اس قسم کی چیز پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ بھی ضرور مذاق اڑا رہے ہوں گے۔" وہ زور سے ہنسا۔

"مگر فرق ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ اوپر سے سفید، اندر سے سیاہ۔ اوپر نرم اندر سخت۔"

آمین کے دل میں چھن سے کوئی چیز ٹوٹی۔ اعزاز نے اشارہ جو کیا تھا۔ سب ہنس دیے سوائے حنا کے جو بھائی کو گھور رہی تھی۔

"بھائی..... بری بات ہے۔ کسی کے بارے میں یوں نہیں ریمارکس دینے چاہئیں۔"

"اوہ تو میں غیبت تو نہیں کر رہا۔ ہاں پہلے ضرور غیبت تھی تب تم نے نہیں ٹوکا۔" اس نے حنا کے سر پر چپت رسید کر کے کہا۔ "اور جو جیسا ہے اسے ویسا کہنا میں کیا حرج ہے۔ یوں بھی کسی کو خوش فہمی کا شکار ہوتے دیکھنا میری برداشت سے باہر ہے۔"

آمین کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور پھپھو سے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ ابھی دروازے سے باہر نکلی تھی کہ چچی اماں بول پڑیں۔

"دیکھا شاہدہ بی! ہماری کسی خوشی میں شریک ہونے کو تو وہ تیار نہیں۔ بیماری کا بہانا کر کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ آخر تم اسے کیوں لائی ہو؟"

اعزاز کا کہنا تھا کہ اماں اگر وکیل ہوتیں تو کمرا عدالت میں ان کی آواز ہر سمت بخوبی سنائی دے جاتی اور لڑکیوں کا کہنا تھا کہ اگلی دو گلیوں تک اماں کی آواز آرام سے سنی جا سکتی ہے۔ آمین کو چکر سا آ گیا۔ دیوار تھام لی۔ حنا کی من من سنائی دے رہی تھی۔

"امی! آپ لوگ غلط بات تو نہ کیا کریں۔ نقاہت ان کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ بیمار بننے کا کسے شوق ہوتا ہے۔"

"بیمار نہ سہی، بننے کا شوق ہر شخص کا ہے۔" اعزاز نے کہا۔

☆☆☆

رات اتنی تاریک تھی کہ کھلی کھڑکی سے ایک کالی چادر کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ نہ جانے یہ تاریکی قسمت پر مسلط تھی یا وقت پر۔ اسٹریٹ لائٹ بھی آج بند تھی ورنہ اس کے گرد اڑتے پتنگے ہی نظر آتے۔ لیکن آج کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہر راستہ جیسے بند تھا اور ہر مسافر اجنبی۔ پھپھو بولتی ہوئی آئیں۔

"اے آمین! کیا سو گئیں۔ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔" انہوں نے لائٹ جلائی۔

"پھپھو! ہم واپس کراچی کب جائیں گے؟"
انہیں آمین کی آواز بھاری سی لگی۔
"منگنی کے لیے آئے تھے ناں۔ وہ تو ہو گئی۔ اب واپسی کی بکنگ کرالیں۔"
"اچھا بیٹا! میں نے کہا تھا۔ مگر بھابھی نے کہا کچھ دن تو رکو۔"
"پھپھو! میری طبیعت بہت خراب ہے۔ لگتا ہے جیسے آخری وقت آ گیا ہو۔"
"اوئی اللہ نہ کرے۔ ہاں پانی موافق نہیں آیا تمہیں۔ کل بھائی سے بات کروں گی۔" ظاہر تھا کہ ٹال رہی ہیں۔
"آپ نے کہا تھا چار دن رہیں گے خالہ بیمار تھیں ثنا کب تک رہے گی ان کے پاس۔ اسے سسرال جانا ہے۔"
"تم بھی کب تک رہو گی خالہ کے پاس۔ ہر لڑکی کو ایک دن سسرال جانا ہوتا ہے۔"
"مجھے کہیں نہیں جانا۔" وہ چڑ کر بولی اور کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔
پھپھو نے کئی بار پکارا۔ وہ چپ رہی مگر نیند تو ...موں سے کوسوں دور تھی اور ماضی کی خوش گوار ...ب قریب آ گئیں۔
ماضی جو خواب بن گیا تھا۔ خواب جو سراب تھا۔ ...ب نظر......
"حنا، ہیلو۔ میں کراچی سے آمین بول رہی ...ں۔"
"آمین، ہیلو یہ تم ہو۔ سچ مچ۔ ایمان سے۔ ...ن نہیں آتا۔"
"بھئی بات سنو، مشکل سے تو لائن ملی ہے۔ ...ٹ نہ جائے۔ میں تمہارے ہاں آ جاؤں کچھ دن ...کے لیے۔"
"کچھ دن کیوں، تمام عمر کے لیے جی آیئے۔ ہم آپ کی راہوں کو پلکوں سے جھاڑ دیں گے۔ آنکھیں قدموں تلے بچھا دیں گے اور کچھ۔" اعزاز کی شوخ آواز سن کر وہ چپ ہو گئی۔

"دیکھیں جی، مشکل سے لائن ملی ہے۔ حنا کو دیں ریسیور۔ اس سے بات کرنا ہے مجھے۔"
"ہم کچھ اتنے برے بھی نہیں۔ کب آ رہی ہیں آپ۔ آج صبح کوا بول رہا تھا حالاں کہ کوئل کوکتی تو اچھا لگتا۔ میں نے ایک ڈھیلا مار کر کوے کو اڑا دیا۔ کم بخت نے نیند خراب کر دی تھی۔"
"ہاں آمین، حنا بول رہی ہوں۔ یہ بھائی زبردستی کود پڑے۔ کیسے آ رہی ہو اور کب؟"
"بھئی ثنا کی کلاس تفریحی دورے پر پشاور، تربیلا، سوات وغیرہ جا رہی ہے۔ میں ثنا کے ساتھ پشاور آ جاؤں گی مگر یہ اعزاز بھائی تو......ڈھیلا مار کر کوے کو بھگا چکے۔ جو قاصد ہوتا ہے۔ میں کیا کروں گی آ کر۔"
"ارے نہیں، بھائی مذاق......"
"ارے بابا۔" اعزاز نے حنا سے ریسیور چھین لیا۔ "میں نے کوے کو ڈھیلا ضرور مارا تھا مگر وہ آٹے کا کوا تھا۔ کوا آٹا لے اڑا۔ ہم میزبانی کرنا جانتے ہیں۔"
"اور بھائی کہہ رہے تھے۔" حنا نے پھر ریسیور اچک لیا۔
"آجا میرے یار کوے۔ مہمان کی خبر لا میرے کوے۔ آنکھ کے گیت گائیں۔ تو ہائے چونچ کہہ، میں بولوں گا ہائے دل۔ دل دل۔"
"بکواس بند کرو۔" وہ جھینپ گئی۔ "ثنا جواب سوات سے واپس آئے گی تو مجھے پنڈی تک پہنچانے کا انتظام ہو سکے گا؟"
"انتظام ہو جائے گا۔ میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔" اعزاز بہت لہک کر بولا۔ "مگر یہ واپسی کی ضرورت کیا ہے۔ ہمارا خانہ دل ویران پڑا ہے۔ آ کے اسے بسا دے۔ مطلب یہ کہ ہم مہمان نہیں آپ کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اپنا۔"
"حنا......ایسی فضول باتوں سے تو بہتر ہے کہ میں ثنا کے ساتھ سوات کی حسین وادی کی سیر کرلوں۔"

فون بند کر کے کتنی دیر وہ مسکراتی رہی۔ پشاور بہت دور سہی ان کے دل تو قریب تھے۔ چچا ابا، چچی اماں اسے بہو مان چکے تھے۔ خاندان میں چرچا تھا اور اعزاز اس کے دل میں بڑے فخر و ناز سے براجمان تھا۔ آمین مستقبل کی خوشیوں میں گن۔

اچانک سنا کہ اعزاز شپ کی نوکری کر کے ملک سے باہر چلا گیا۔ ملے بغیر کوئی بات کہے بغیر۔ کراچی آ کر بغیر کسی سے ملے روانہ ہو گیا۔ یہ حیرت انگیز بلکہ افسوس ناک خبر تھی۔ جس نے آمین کو پریشان کر دیا تھا۔ حنا کو فون کر کے تصدیق چاہی۔

''بس آمین، یہاں تو سروس ملتی نہیں۔ اس لیے شپ پر چلے گئے۔''

''مگر حنا! وہ کراچی آتے تو ابا کہیں نہ کہیں.....''

''مگر یہاں تنخواہ کم ہوتی۔ بھائی کہہ رہے تھے، دو تین سال میں بہت رقم کما لیں گے۔''

''مگر حنا..... چچا ابا نے منع نہیں کیا؟''

''یہ بھائی کے مستقبل کا سوال تھا۔'' حنا بہت سنجیدہ تھی۔

اور یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک اعزاز کو رقم کی، دولت کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر کئی بار اس نے پشاور فون کیا مگر ادھر کی سرد مہری نے خون میں برف سی جما دی۔ پتا نہیں سب کیوں اس سے بے زار ہو گئے تھے اور اگر کوئی اعتراض ابا کی اس بات پر تھا۔ جو ان کے اور چچا ابا کے درمیان فون پر ہوئی تھی۔ چچا ابا شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے اور ابا نے اعزاز کی بے روزگاری کے حوالے سے اگر یہ کہہ دیا کہ جب تک آمین بی اے کر لے گی اور اعزاز بھی کام سے لگ جائے گا۔ تب دیکھا جائے گا۔ تو اس میں کوئی غلط تو نہ تھا۔ بالکل عام برادرانہ انداز میں بات ہوئی تھی۔ ابا نے انکار تو کیا نہ تھا۔ جیسا کہ بعد میں یہ افواہ عام ہوئی۔

اس کے بعد..... اس کے بعد ابا ہی نہ رہے اور بدحواسی میں وہ چچا ابا کی منتظر ہی رہی۔ ان کے سرد مہر رویے کو بھی بھول گئی۔ یہ بات تو عقل میں سماتی نہ تھی کہ رشتے سے انکار (اگر وہ انکار ہوتا تب بھی) سے رشتوں ناتوں..... اور تعلق پر کوئی ضرب لگی ہو، واسطے، خون کے تعلق کیا ختم ہو سکتے ہیں۔ موت جیسا ظالم عفریت بھی اخوت کے جذبوں کو جگا نہ سکے تو سچائی اور محبت کا تو وجود ہی نہیں رہا۔ رضیہ آپا ہی سچی تھی جو واقعات سے نتائج اخذ کرنے میں لاگ لپیٹ کر دور رکھتی تھیں اور جو جیسا ہے اسے ویسا ہی بتاتی تھیں۔

اور اب ان کے درمیان خود ساختہ فاصلوں کے پاٹنے میں آمین نے ہی پہل کی تھی اور اختلاف کی ٹھوس دیوار..... اب بھی حسب سابق موجود تھی۔ خواہ دیوار کے دوسری جانب کچھ بھی نہ تھا۔ اب بھی کسی نے چچا ابا، چچی اماں یا اعزاز سے اس کے باپ کی موت پر دو لفظ کہنے کی زحمت نہ کی تھی مگر وہ اسے بھی میٹھے گھونٹ کی طرح پی گئی۔ وہ فاصلوں کو بڑھانے کی قائل نہ تھی۔

''پھپھو! پھر آپ کا کیا خیال ہے۔ میرا کوئی چانس بنتا ہے؟''

''بیٹا! تمہاری ماں راضی نہیں ہوں گی۔''

''آپ ابا سے کہیے۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالتے۔''

''اچھا، کہوں گی مگر زور نہیں دے سکتی۔ بات خاصی خراب ہو چکی ہے۔ اگر رفیعہ، صفیہ کا معاملہ ہوتا تو میں اپنا حق استعمال کرتی مگر ناممکن کو ممکن بنانا۔''

''پھپھو..... اگر آپ چاہیں تو ایسا ہی کر لیں۔'' اعزاز نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا، تم..... اعزاز..... کیا تم.....''

''جی پھپھو! میں خاندان سے الگ رہ کر..... تھک گیا ہوں۔ آپ اپنا حق رفیعہ، صفیہ کسی کے لیے بھی استعمال کر سکتی ہیں۔''

اعزاز کی واپسی کی تیز آہٹ قریب سے گزری اس کو اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ اعزاز کیا کہہ گیا۔ کیا کر گیا۔

ہاں تو اب..... سب کچھ ظاہر ہو چکا۔ کوئی معمہ

نہیں۔ الجھن نہیں اور ثنا تم حیران ہوگی کہ میں نہ کسی کو چاہتی ہوں۔ نہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر بھی میں اپنی عزت نفس اپنے وقار کو داؤ پر لگائے رہی اور اپنے حق کے لیے کوئی آواز بھی بلند نہ کرسکی۔ مجھے کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ امید نہ تھی مگر زبان بند رہی اور آئندہ بھی یہ زبان بند رہے تو اچھا ہے ایک بھاری بوجھ ذہن سے اتر گیا تھا۔ کبھی اسے گہری نیند آ گئی۔

صبح حنا نے ہی اسے جگایا۔ روشی کا منگیتر آمین سے ملنے تھا بطور خاص۔

''مگر مجھ سے کیوں؟''

''ان کو تمہاری شخصیت میں بڑی کشش محسوس ہوئی ہے۔''

''تم ان کو بتا دیتیں۔ میں ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی مالک ہوں۔ حنا! وہ مجھ سے مل کر مایوس ہوں گے۔ میں ان سے کیسے ملوں گی۔''

حنا نے آمین کا ہاتھ اپنے رخسار پر رکھ کر پیار سے کہا۔

''مجھے پتا ہے، تم امی اور بھائی کی باتوں سے دل برداشتہ ہو۔ آمین..... میری بہن..... اس کے باوجود، عامر بھائی سے مل لو۔''

''تم نے مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ ان سے کہہ دیتیں میری طبیعت خراب ہے۔'' اٹھنا پڑا۔

''آمین! بھائی کی مذاق عادت ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو۔''

اور اب انہوں نے زندگی کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے مگر اب وہ کسی مذاق کا حصہ بننے کے لیے تیار نہ تھی کہ خود تماشا بن جائے۔

عامر سے وہ ملی ضرور مگر نہ اس کی باتوں میں دلچسپی لے سکی، نہ اس کی پرمزاح گفتگو کی داد ہی دے پائی۔ پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھی رہی۔ بے حرکت۔

عامر کے جانے کے بعد چچی اماں کے بڑبڑانے کی ابتدا ہوئی۔ کھانے کے وقت وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ اس نے بہت تھوڑا سالن نکالا تھا اور ابھی پہلا لقمہ بنایا تھا وہ بول پڑیں۔

''میں پوچھتی ہوں، تم آئی کس لیے ہو یہاں۔ ہمارا مذاق اڑانے؟''

وہ ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اچانک حملہ ہوا تھا۔ ''میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''ملنے آئی ہو کہ ہمیں ذلیل کرنے؟''

''چچی اماں! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''غلط فہمی تمہیں ہے۔ تم خود کو کیا سمجھتی ہو۔ سرخاب کے پر لگے ہیں تم میں کہ ہم تمہیں سر پر بٹھائیں۔ تمہاری خوشامد کریں۔ میری بیٹی کی منگنی میں تم بے دلی سے شریک ہوئیں۔ نہ کسی گانے میں، نہ کسی رسم میں شرکت کی۔ میرا داماد آیا، تم نے اس کو حقیر جان کر اس سے بات نہ کی۔ ارے کسی خوشی میں شریک ہوتیں، کبھی تو ہنستی بولتی نظر آتیں۔ یہ غلط فہمی ہے میری؟''

شدت ضبط، جوش جذبات نے اسے کھو دیا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ یہ زبان بند رہے گی مگر اب بھی زبان بند رہتی تو وہ اپنے مقام سے گر جاتی۔ اپنی انا اور عزت نفس کو بار ہا تو داؤ پر نہیں لگایا جاتا۔

''چچی اماں۔'' جب وہ بولی تو اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔ ''واقعی مجھے اپنی غلطی مان لینا چاہیے۔ مجھے سب کے ساتھ ہنسنا بولنا چاہیے بلکہ ناچنا بھی چاہیے۔ بہت زیادہ خوشی منانا چاہیے کیونکہ میرا باپ مر گیا ہے اور میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ میرے خاندان والوں نے مجھے اپنی لسٹ سے خارج کر دیا ہے۔ میں محتاج، بے آسرا اور یتیم ہوں۔ ضرور ہنسنا اور گانا چاہیے کہ آپ میں سے کسی نے آج تک میری یتیمی پر ہمدردی کے دو بول نہ کہے۔ میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا۔ کوئی میرا درد بانٹنے نہ آیا۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوگی کہ میں سب کچھ بھلا کر آئی تو آپ سمیت ہر شخص مجھے میری اوقات دکھانے میں پیش پیش ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں، آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے زبان نہیں۔''

آواز بند ہونے لگی، ہونٹ کانپنے لگے۔ ہاتھ کا لقمہ پلیٹ میں رکھ کر کسی کی طرف دیکھے بغیر اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں جا گھسی۔ سب سے پہلے اعزاز نے کرسی چھوڑ دی اور باہر نکل گیا۔ پھر حنا کھڑی ہوئی۔ رفیعہ، صفیہ، روٹی کھانا چھوڑ کر باہر آ گئیں۔ آمین کی طرف لپکیں مگر وہ کمرا بند کیے زور زور سے رو رہی تھی۔ چند منٹ دروازہ تھپتھپا کر وہ لوگ واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں اور اس تازہ ترین واقعے پر غور کرنے لگیں۔

دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ اس لیے سنبھلنے میں دیر بھی نہیں لگی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ چچا ابا کے کمرے میں چلی آئی۔ چچا ابا نے اسے پلنگ پر اپنے پاس بٹھایا۔

''چچا ابا! میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔'' وہ میز پر رکھی کتاب پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

چچا ابا نے بغور اسے دیکھا۔ ''کیوں بیٹا! اتنی جلدی کیا ہے؟''

''خالہ کافی بیمار ہیں، انہیں میری ضرورت ہے۔ جب مجھے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی تو خالہ ہی نے مجھے پناہ دی۔ اب ان کے احسان کے احترام میں مجھے ان کی خدمت کرنا چاہیے اور میں تو منگنی میں شرکت کے لیے آئی تھی، وہ تو ہو گئی۔ پھپھو تو شاید ابھی رکیں گی۔''

(ابھی انہیں اپنا حق استعمال کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہوگا)

''تو تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟'' چچا ابا نے رسماً بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

''آپ..... جہاز سے میری سیٹ کروا دیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کرائے کی رقم ان کے پاس رکھ دی۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔

''کب جانا چاہتی ہو؟''

''جی، جلد سے جلد۔ آج ہی رات تک سیٹ مل جائے تو بہتر ہے ورنہ صبح۔''

''اچھا، سکین خان آنے والے ہیں۔ ان سے کہوں گا ہو جائے گی اور.....''

''چچا ابا مجھے آپ سے، ایک بات پوچھنا تھی؟''

''ہاں، پوچھو۔''

''آپ کی اور ابا کی کوئی زمین تھی مشترکہ جائیداد جو شاید ابا نے فروخت کر دی۔''

''اوہو..... چھوڑو اس کا ذکر۔ بچوں کا اس سے کیا تعلق۔''

تعلق تو بہت گہرا تھا۔ رشتوں کا بھرم ہی جاتا رہا۔ نفرت نے محبت کی جگہ لے لی۔

''نہیں چچا ابا! مجھے معلوم تو ہو کہ زمین کی کیا قیمت تھی اور ابا کا کتنا حصہ تھا۔''

''اصل میں وہ بہت قیمتی زمین تھی۔ عابد کو کاروبار کے لیے رقم درکار تھی۔ میں نے منع بھی کیا۔ اس زمین کی آمدنی سے ہمارے گھر کا خرچ چلتا تھا مگر عابد نے فروخت کر دی۔ میں نے سوچا، چلو، اعزاز بے روزگار ہے اسے کاروبار کرا دوں گا اور پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ پیسہ تو آج کے زمانے میں دین ایمان سے بڑھ گیا ہے مگر ہوا یہ کہ اس نے ساری رقم کاروبار میں جھونک دی۔ مجھے ایک پیسہ نہیں دیا۔ صریحاً بد دیانتی تھی۔ میں منتظر ہی رہا۔ پھر..... اعزاز کو شپ کی نوکری کرنا پڑی۔''

آمین سر جھکائے بیٹھی سنتی رہی۔ چچا ابا نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''تم کیوں اداس ہو گئیں۔ یہ ہم بھائیوں کے درمیان معاملہ تھا اور ہونا تو چاہیے تھا کہ اگر میں نے کھویا تو اس نے پایا مگر ہوا نہیں۔ سنا ہے اس کی ساری رقم بھی ڈوب گئی اور اسی دھچکے نے اس کی جان لے لی۔''

آمین تو چچا ابا کے اس ہاتھ کو سر پر محسوس کر کے جیسے کسی انجانی نگری میں پہنچی ہوئی تھی۔ ہائے چچا ابا نے اس پر شفقت کا ہاتھ رکھا بھی تو کب؟

آنسو ضبط کرتے ہوئے جلدی سے باہر آ گئی کہ جذبات عریاں ہو گئے تو خود کو سنبھالنا مشکل

ہوجائے گا۔

کچھ دیر بعد جب روشی، حنا صفیہ، اس کے کمرے میں آئیں تو اس نے مسکرا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

''بھائی نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ ہم چاروں کا گروپ لے لیتے۔ پھر نہ جانے کب اکٹھا ہوں ہم۔''

روشی نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ اعزاز شام تک نہ آیا۔ اندھیرا ہوگیا۔ روشنیاں جل گئیں..... چچی اماں ہول رہی تھیں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ چچا ابا نے ٹکٹ اس کے ہاتھ پر لا کر رکھا۔

''وقت کم ہے بیٹا۔ ایک گھنٹے بعد ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔''

ایک بیگ ہی تو لائی تھی وہ..... جو تیار تھا۔ لڑکیاں اس کی روانگی کا سن کر اس کے گرد جمع ہوگئیں۔ سب اسے روک رہی تھیں۔ پھپھو بالکل خاموش تھیں۔ آمین، چچا ابا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے کون لے کر جائے گا ایئرپورٹ۔ کمرے میں چچی اماں بھی تھیں۔ وہ رک گئی۔ ان کی آواز حسب معمول اتنی بلند تھی کہ سننے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑی۔

''ارے واہ! اب میرا بیٹا کسی قابل ہوا تو سب کو نظر آنے لگا۔ یہ تمہاری بہن جب ٹبر لے کر آئی تھیں۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ ان کا کوئی مقصد ہوگا۔ میں تو سمجھی کہ آمین کی سفارش کے لیے آئی ہیں اور میں نے اسی وقت اعزاز سے کہہ دیا کہ اب آمین اس گھر میں بہو بن کر نہیں آئے گی۔ میں کیا جانتی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ہاتھ پھیلانے آئی ہیں۔ لو اور سنو۔ آمین جیسی حسین لڑکی کو چھوڑ کر میں اس کالی کلوٹی کو بہو بنالوں۔ سن لو میاں، آمین نہیں تو کوئی اور بھی نہیں۔ خاندان میں تو اب کرنا نہیں ہے۔ یہ فیصلہ ہے میرا۔''

''نہ وہ فیصلہ اچھا تھا نہ یہ قابل قبول ہے۔ اس لیے کہ اعزاز نے خود خواہش کی ہے۔''

''اچھا..... تو اعزاز کو آنے دو۔ میں آخری فیصلہ بھی اسے سنادوں گی۔''

''کیا کروگی۔ اگر اس نے آمین یا صفیہ کا نام لیا۔''

''وہ کروں گی جو کرنا چاہیے۔ یعنی اس گھر کو چھوڑ دوں گی۔ رہے یہاں آمین یا صفیہ۔''

وہ واپس آ گئی۔ کچھ دیر بعد حنا سے کہا۔ اس نے آ کر کہا۔

''ابا نے کہا ہے، بھائی آ گئے ہیں۔ وہی لے جائیں گے۔''

حنا اور روشی اس کے گلے سے لپٹ گئیں۔ آمین بھی آبدیدہ ہوگئی۔

اعزاز نے اندر آ کر کہا۔ ''تم لوگ ذرا باہر چلو مجھے آمین سے بات کرنا ہے۔''

روشی تو چلی گئی آمین نے حنا کو پکڑ لیا۔ ''یہ کہیں نہیں جائیں گی اور مجھے کوئی بات کرنا ہے نہ سننا ہے۔''

''تم نے کہا کہ خاندان نے تمہیں اپنی لسٹ سے خارج کردیا۔ میں اس کی صفائی دینا چاہتا ہوں۔ کم از کم میں ان لوگوں میں شامل نہیں۔ شاید مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو۔ خیر میں کراچی آ کر تم سے ملوں گا تب بات کریں گے۔''

''نہیں، اب گنجائش نہیں ہے۔'' وہ تیز سانسوں کے درمیان بولی۔ ''میں نے آپ کو البتہ اعزاز صاحب آپ کو اپنی زندگی سے خارج کردیا ہے اور اس فیصلے میں ترمیم کی گنجائش بھی نہیں۔''

کہہ کر وہ باہر نکلی۔ برآمدے سے بیگ اٹھایا اور گھر سے باہر آ گئی۔ چچی اماں اسے پکارتے ہوئے لپکی آ رہی تھیں۔ اعزاز پیچھے سے پکار رہا تھا مگر اب..... اس گھر سے..... اس گھر کے لوگوں سے ہر ناتا توڑ کر وہ باہر آئی تھی اور اب واپسی ممکن نہ تھی۔ اسے کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دیتا تھا۔ گزرتی ٹیکسی اس کے قریب آ کر رکی اور وہ عجلت میں اس میں بیٹھ گئی۔ ٹشو سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ایئرپور

پٹ کے راستے پر درختوں کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

خالہ اسے دیکھ کر حیران ہوگئیں۔ بلکہ پریشان بھی۔ حلیہ ہی ایسا تھا۔ راستے بھر رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ نقاہت تو تھی ہی، رنگ زرد تھا۔ ان کے سوالوں کے جواب دینا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ اکیلی کیوں آئی ہے بغیر اطلاع کے کیسے آ گئی۔ کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔ بیمار کیوں ہوئی۔ بیماری میں سفر کی کیا ضرورت تھی۔ علاج کیوں نہیں کیا۔ کیسے بتاتی۔ یہ بیماری جسمانی نہیں، روحانی ہے۔ خاندان کو چھوڑ دینا..... دل سے خارج کر دینا آسان نہیں۔ روح زخمی ہو جاتی ہے۔

''ثنا کہاں ہے خالہ؟'' کچھ دیر آرام کے بعد اسے خیال آیا۔

''ثنا تو چلی گئی۔ نہ جانے کس بات پر ماں بیٹے میں ٹھن گئی اور ابرار نے غصے میں آ کر دوسرا گھر کرائے کا لے لیا اور ثنا کو لے گئے۔ ثنا تو ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی ساس سے الگ ہونا منظور تھا۔ میں نے بھی ابرار کو بہت سمجھایا کہ اس حالت میں ثنا کو کسی بزرگ کے ساتھ ہونا چاہیے مگر ابرار نے ضد پکڑ لی اور سنو، ثنا کی نندوں نے گھر سیٹ کیا اور خود آ کر ثنا کو لے گئیں۔ ایسا اندھیر کہیں دیکھا نہ سنا۔ سب بھائی بہن ماں کے خلاف ہیں۔''

''اور..... ثنا کو آپ کا خیال نہیں آیا؟''

''ارے ہاں..... ایسا ہوا نا کہ حیدرآباد سے رفیقہ آپا کی بیٹی یہاں آ گئی۔ اسے یہاں اسکول میں سروس ملی ہے۔ روز حیدرآباد جانا اور صبح روز آنا مشکل تھا۔ میں نے کہا، میرے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔ اس لیے ثنا بھی چلی گئی۔ ہما اچھی لڑکی ہے۔''

''اکبر وغیرہ۔''

''وہ تو ٹی وی اسٹیشن گیا ہے، اس کو ڈرامے میں کوئی رول ملا ہے۔ اس کی ریکارڈنگ ہے۔''

''ٹیلی فون۔''

''ٹیلی فون بیمار ہے کمبخت اندھا، بہرا، گونگا ہوگیا ہے۔'' خالہ ٹیلی فون کی بیماری سے بیزار تھیں۔

آمین لیٹتے ہی سوگئی۔ بڑی گہری نیند آئی تھی۔

ثنا کے گھر اکبر نے پہنچایا..... ثنا ابھی بستر میں تھی۔ آمین نے اسے اٹھایا۔ ''افوہ..... آرام طلبی۔''

''آرام میرا حق ہے۔ اکبر چائے پیو گے۔''

''ضرور..... بلکہ ناشتا بھی۔ ان صاحبہ نے مجھے کچھ کھانے پینے نہیں دیا۔''

''ہما بنا رہی تھی ناشتا۔ تم کو ہی ترس آیا۔''

''ہاں تو بے چاری اتنی کم عمری میں گھر کا بوجھ اٹھا رہی ہے اور گھر سے دور ہے۔''

''ابرار بھائی اتنے سویرے آفس چلے گئے۔''

''آفس یہاں سے دور ہے۔ جلدی جانا پڑتا ہے۔'' ناشتا کر کے اکبر آفس چلا گیا۔

''یہ انقلاب، کیسے ممکن ہوا۔ تمہاری ساس تو بہت خفا ہوں گی۔'' آمین نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ حالاں کہ میرا تو اس گھر کے معاملے میں ذرا بھی تعلق نہیں مگر وہ مجھے ہی ذمے دار ٹھہراتی ہیں اور آنے والے پوتے کو..... کوستی ہیں کہ آنے سے پہلے ہی ماں بیٹے کو جدا کر دیا۔''

''اف..... کیا ذہن ہے مگر..... مجھے اب حیرت نہیں ہوتی۔''

''تم کچھ بیمار ہوگئی تھیں؟ کیسی ہو رہی ہو۔''

آمین کو اس ہمدردانہ سوال نے دکھی کر دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ ثنا موقعے کی مناسبت کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ خاموش رہی اور آمین کو رونے دیا۔ کچھ دیر بعد جگ بھر کر گلاس کو ملا پانی لائی۔ ایک گلاس خود لیا دوسرا آمین کو دیا۔

''جب کوئی آنکھ سے آنسو بہاتا ہے، تو اس کے جسم میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس لیے لوگ اسے پانی پینے پر مجبور کرتے ہیں۔''

''اور جب دل سے آنسو ٹپکیں تب؟'' آمین نے روتے روتے مسکرا کر گلاس منہ سے لگا لیا۔

''تب خون کی کمی ہوتی ہے مگر کوئی خون پینے پر

مجبور نہیں کرتا۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔ کیوں کہ مجھے اندازہ ہے تم آنکھ اور دل دونوں طرف سے آنسو بہا چکی ہو۔"

آمین ثنا سے کچھ چھپا ہی نہیں سکتی تھی۔ اول سے آخر ہر بات کہہ سنائی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔

"تو اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ نہایت ذہانت سے کام لیا ہے تم نے اور بہت اچھا کیا ہے۔ اس سے بہتر فیصلہ شاید اور کوئی نہ ہوتا۔ ساری زندگی معلق رہنے سے اس رسی کو کاٹ دینا اچھا ہے۔ چوٹ ہی لگے گی نا۔ زخم بھی بھر جاتے ہیں۔"

ثنا نے اسے جانے نہیں دیا۔ شام کو اکبر آ گیا۔ ابرار بھی آ گئے۔ سب نے بیٹھ کر چائے پی۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر وہ اکبر کے ہمراہ گھر جانے کے لیے نکلی تو خیال آیا۔ وکیل صاحب سے مل لینا چاہیے۔ وکیل صاحب آفس میں تنہا مل گئے۔ وہ اپنے باپ کی وارث تھی اور وراثت میں گھر کے سوا کوئی جائیداد نہ تھی۔ فروخت شدہ زمین کی بات ہوئی۔ اس کا قرض جو مرنے والے کی روح پر عذاب کی صورت ہوگا۔ ادائی کے بارے میں بھی بات کی۔

"میں اپنا گھر فروخت کر کے رقم حاصل کر سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں...... ویسے اس مکان کی بنیاد پر آپ کو بینک سے قرض مل سکتا ہے جو آپ قسطوں میں ادا کر سکتی ہیں۔"

"نہیں، یہ تو آسان نہیں ہے۔ ایک قرض سے نجات، دوسرا موجود۔ کیا قیمت ہوگی میرے گھر کی۔"

"کسی ڈیلر سے معلوم کروانا پڑے گا۔ لیکن ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ فروخت کے سلسلے میں آپ کو کسی بے حد ذہین، معاملہ فہم اور اعتبار والے آدمی کی مدد لینا پڑے گی۔"

آمین نے اکبر کی طرف دیکھا۔ "کم از کم میں اعتبار والا نہیں ہوں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"خالو جان۔"

"وہ بھی اناڑی ہیں اور ویسے بھی پیسہ دیکھ کر نیت خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آج کل کے دور میں باپ کو بیٹے، بیٹے کو باپ پر اعتماد نہیں اور ایمان بھی واقعتاً کمزور ہی۔" وکیل صاحب نے کہا۔

"ویسے...... میں انتظام کر سکتا ہوں ایک با اعتماد شخص کا مگر اس سے رشتہ کرنا پڑے گا۔" اکبر نے راستے میں کہا۔

"کیا کرنا پڑے گا؟"

"اعتبار کا رشتہ قائم کرنا ہوگا۔ تب وہ تمہارا کام کرے گا۔ ہے بہت ذہین۔"

"کیا...... ابھی دنیا میں اعتبار کے لائق لوگ ہیں؟"

"دنیا انہی لوگوں کے کندھوں پر چل رہی ہے سسٹر۔ یہ نہ ہوں تو دھڑام سے گر جائے۔"

"تو پھر...... ان کی کوئی شرائط۔"

"چلو پھر...... کل چائنیز میں ڈنر۔ اس شخص سے ملاقات اسی طرح ہوگی۔"

☆☆☆

ابرار اور ثنا کو بھی ڈنر پر بلایا گیا۔ ثنا خاصی تیاری کے ساتھ آئی اور اسے سادہ لباس میں دیکھ کر چلائی۔

"یہ کیا...... کسی کے سوگ میں جا رہی ہو؟ اپنا نیوی بلو سوٹ نکالو۔"

ثنا نے زبردستی اس کا لباس بدلوایا۔ چائنیز ریستوران میں ڈنر کافی دلچسپ رہا۔ اعتبار کے قابل، سخی سرور...... کچھ دیر سے آئے۔ موصوف پائلٹ آفیسر تھے۔

"یہ کیا...... یہ جہاز اڑائیں گے یا میری پراپرٹی لے اڑیں گے۔ شکل سے تو بے اعتبار ہیں۔"

آمین نے اکبر کو الگ لے جا کر خوب ڈانٹا مگر اکبر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

"سخی سرور نہ صرف برسر روزگار ہیں بلکہ نیت سیر بھی ہے۔ اس سے بہتر کوئی شخص نہیں۔"

سخی سرور کی رات ایک بجے فلائٹ تھی، اسی لیے وہ کھانا کھاتے ہی چلا گیا۔

ثنا اور ابرار نے سخی سرور کی تعریف کی۔ ''مگر وہ شکل سے مسخرے لگتے ہیں۔ بااعتبار ہرگز نہیں۔''

وہ اڑی رہی۔ اکبر نے میز پر مکا رسید کر کے کہا۔ ''جو شکل سے بااعتبار لگتے ہیں انہوں نے تم سے وفا کی؟''

آمین چپ کی چپ رہ گئی۔

''اور میں تو تمہارا رشتہ بھی کر چکا ہوں اس مسخرے سے۔'' اکبر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ک.....ک.....کیا، کیا کر چکے ہو۔''

''اعتبار کا رشتہ قائم کرنا ہمارا کام ہے اور مستحکم کرنا تمہاری ذمے داری۔''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تینوں کو دیکھ رہی تھی جو خوش نظر آ رہے تھے۔ راستے میں مکمل سکوت رہا۔ آمین ابھی تک دم بخود تھی۔ گھر آتے ہی اس نے وکیل صاحب کے گھر فون کھڑکا دیا۔ اکبر بغور دیکھتا رہا۔

''وکیل صاحب کسی اچھے پراپرٹی ڈیلر کا پتا بتائیں مجھے۔''

''آپ نے کسی قابل اعتبار شخص کی خدمات حاصل کر لیں کیا؟''

''جی نہیں میں سوچ رہی تھی کہ خالی بیٹھی رہتی ہوں۔ میں خود یہ کام کر سکتی ہوں۔''

''نہیں بی بی! اس کی اجازت میں نہیں دوں گا۔ آپ مختلف پارٹیوں سے ڈیلنگ نہیں کر پائیں گی۔ بہت عیار ہوتے ہیں لوگ۔''

''آپ.....مدد''

''دیکھیں آمین بی بی! مجھے تو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ یقین کریں۔'' وکیل نے صاف انکار کر دیا تھا اور اکبر نے مزے سے کہہ دیا کہ چوں کہ سخی سرور بہ آسانی سانس لیتا ہے اس لیے وہ عیار لوگوں سے نمٹ سکتا ہے۔''

دور دور کوئی اعتبار کے قابل شخص نظر نہ آیا۔

''یقین کرو، جتنا مسخرہ وہ نظر آتا ہے اسی قدر سنجیدہ ہے تمہارے معاملے میں۔''

''مگر میرا ان سے کیا واسطہ۔'' وہ جھلا گئی۔ ''جا ن نہ پہچان.....''

''ایک بار اور مل لو۔ جان پہچان ہو جائے گی۔'' اکبر نے مشورہ دیا۔

ادھر اس کے دل پر ابا کے قرض کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

ادھر کہیں کامیابی کے آثار نہ تھے۔ مجبور ہو کر اس نے سخی سرور کو فون کیا۔

(رشتہ قائم کرنا، اس کی اپنی مرضی پر تھا۔ اعتبار کیا جا سکتا تھا۔)

سخی سرور اس کے فون کا منتظر تھا۔ مکان کی فروخت کا مسئلہ بیان کر کے وہ اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''دیکھیں جی، بات یہ ہے کہ ان معاملات کا تجربہ تو رکھتا ہوں مگر میں غیروں کے لیے کام نہیں کرنا چاہتا یا پھر منہ مانگا کمیشن.....''

''جی.....جی یہ ممکن ہے۔'' وہ جلدی سے تیار ہو گئی۔ ''مگر میں آپ پر اعتبار کیوں کر کروں۔''

(اصول کی بات ہے)

''رشتہ کر کے۔'' جواب ملا۔

''کیسا رشتہ.....ذرا تشریح کریں۔'' اسے غصہ آ گیا۔

''رشتہ جیسا ہوتا ہے، ایک موسمی رشتہ ہوتا ہے۔ جیسے موسمی بخار، آج ہے کل نہیں۔ یہ عارضی رشتہ ہے۔ دوسرا ہوتا ہے اصلی رشتہ، اعتبار کا۔ یہ دیرپا ہوتا ہے۔ ابدی اور مستحکم۔ کیا خیال ہے۔ کون سا رشتہ قبول ہے آپ کو۔''

''آپ.....سنجیدہ ہیں؟'' آمین کو الجھن ہونے لگی۔

''بہت.....یاد رکھیں، موسمی رشتے میں اعتبار کا دخل نہیں ہوتا۔''

''آپ کمیشن کی بات کریں۔''

''ٹھیک.....منہ مانگا۔''

''چلیں بولیے۔''

''کام ہونے کے بعد۔''

''ٹھیک ہے۔''

''آپ مکان کی تفصیل اپنی ضرورت، قرض کا احوال سنائیں۔''

☆☆☆

دس گیارہ دن سخی سرور کی کوئی خبر نہیں ملی۔ مکان کے کاغذات وہ اکبر کے ذریعے بھجوا چکی تھی اور ایک ایک دن گن رہی تھی۔ پھر ایک دن اس کا فون آ گیا۔ ملاقات کا وقت مانگ رہا تھا جو اسے منظور نہ تھی۔

''دیکھیں، یہ ملاقات کاروباری نوعیت کی ہوگی۔ آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ ہے میں ہر طرح سے آپ کا خیال رکھوں گا؟''

''جی نہیں، مگر ضرورت کیا ہے؟''

''تو میں آپ کو رقم کیسے دوں۔ میرے پاس کیا ثبوت ہوگا کہ میں نے آپ کو رقم دے دی ہے، آپ مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتیں تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ انصاف کریں۔''

کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ اس رقم کے لیے خونی رشتے ٹوٹ گئے تھے۔

وہ اگلے دن رقم کا تھیلا لیے آ گیا۔ ساڑھے دس لاکھ میں سودا ہوا تھا۔

''صرف ساڑھے دس لاکھ، مکان تو، خاصا بڑا تھا۔''

''یہ سودا، صرف باغ کا ہوا ہے۔ آپ کا مکان، آپ کو مبارک۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ یہ پلاٹ میرے بھائی نے خریدا ہے جو آرمی سے ریٹائر ہو کر یہیں سکونت اختیار کریں گے۔''

''مکان نہیں صرف باغ؟'' یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جی، رقم گن لیں۔ بعد میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔'' یہ وہ رقم تھی جس کی وجہ سے خونی رشتے دشمنی میں بدل گئے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔

''آپ کا کمیشن.....'' رقم گن کر سوال کیا۔ سخی سرور شرما کر کرسی کی پشت پر منہ چھپانے لگے۔

''بولیے آپ کا کمیشن کتنا ہوا؟'' وہ انتہائی سنجیدہ تھی۔

''سچ سچ۔''

''بالکل سچ اور منہ مانگا۔ یہی طے ہوا تھا۔ کیا لیں گے آپ؟''

''رشتہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔'' سخی سرور کے چہرے پر چھائی سنجیدگی اس کے اٹل اور مضبوط ارادوں کی ضامن تھی۔ آمین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''رشتہ آپ سے رشتہ محبت۔ رشتہ رفاقت۔ جو آپ کہہ لیں۔''

آمین چپ تھی۔ وہ بھی گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''آپ کو کمیشن کچھ تو لینا ہوگا۔''

''ضرور لوں گا مگر وعدہ منہ مانگے کمیشن کا ہوا تھا۔''

پھر گہرا سکوت آخر سخی سرور نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''رخصت چاہتا ہوں۔ رات میری فلائٹ ہے۔'' شاید عادتاً مسکرا رہا تھا۔ بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرنا اب ممکن نہ تھا۔ آمین نے اپنا ہاتھ اس کے گرم ہاتھ میں دے دیا۔ ایک گہرا دل نشین تبسم جو اس کے چہرے کو جگمگا گیا اور پھر پھرتی سے دوسرے ہاتھ سے انگوٹھی جیب سے نکال کر آمین کی انگلی میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

''شکریہ..... رشتے کی منظوری کا۔''

سیلیوٹ مار کر وہ واپس چلا گیا۔ کتنی دیر تک آمین اس ہاتھ کو دیکھتی رہی جو اس نے گرم جوشی سے تھام لیا تھا اور جس کی ایک انگلی خوب صورت انگوٹھی سے مزین تھی۔ رشتہ، اعتبار قائم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خالہ کے سامنے ہاتھ تھا جس کی ایک انگلی میں سنہری انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اگلے دن رضیہ آپا آ

گئیں۔ وہ وکیل صاحب کی معرفت رقم کا ڈرافٹ بنوانے گئی ہوئی تھی۔ ڈرافٹ بنوا کر چچا ابا کے نام بھیج کر وہ گھر آئی۔

رضیہ آپا خوشی سے بے حال ملیں۔ ''سخی سرور بہت نیک اور شریف بندہ ہے۔ اس کے بھائی میجر ہیں۔ تمہارے بہنوئی کے لنگوٹیا یار ہیں۔''

''آپ جانتی ہیں؟''

''اور کیا..... میں نے ہی یہ رشتہ دیا تھا خالو کو۔ اصل میں جب تک اعزاز کا نام تمہارے ساتھ جڑا رہا میں چپ رہی جوں ہی تم نے جان چھڑائی میں نے سخی سرور سے کہا۔ سخی دوڑو..... وہ دوڑ گیا۔ اکبر سے دوستی کرلی۔ بعد میں بھید کھلا کہ یہ تو خالو کا رشتے دار بھی ہے۔ شکریہ ادا کرو میرا۔ ایسا سنجوگ کیا ہے کہ .....اور تمہیں احسان کے بوجھ سے بھی بچالیا۔''

''کیسا احسان؟''

''رفیعہ کا خط آیا تھا۔ لکھا ہے اعزاز نے اودھم مچا رکھا ہے۔ وہ آمین کے سوا کسی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ تنگ آ کر ماموں، ممانی اس پر راضی ہوئے ہیں کہ آمین کو بہو بنا کر اس پر احسان بھی کردیں اور بیٹے کی تمنا بھی پوری ہو جائے۔ آج کل میں آنے والے ہوں گے ماموں ممانی۔ اماں کو اسی لیے روکا ہوا ہے کہ ساتھ آ کر نہ زور لگائیں۔ ارے میں ان سے بھی تیز نکلی۔ سخی کو ٹیلی گرام بنا دیا۔''

''میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' رضیہ آپا کی زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''خالی چائے..... ہم تو مٹھائی کھائیں گے۔'' رضیہ آپا کا حق تھا۔

''ماموں کا قرض ادا کردیا؟ بس اب چین سے بیٹھو شکر ادا کرو اور سخی کی قدر کرنا۔ بہت ہی عمدہ آدمی ہے۔ خاص تمہارے لیے بنایا گیا ہے یہ نمونہ۔''

☆☆☆

ثنا ہانپتے ہوئے آئی۔ وہ اب اپنی سسرال چلی گئی تھی۔

ساس کو اس کی بہت زیادہ قدر ہوگئی تھی۔ بیٹے، بیٹیاں ان کے خلاف ہوگئے تھے۔ وہ خود آ کر اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور اب دونوں میں پکی دوستی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سخی سرور کا فون آیا تھا۔ اس کا دورہ کچھ طویل ہوگیا۔ ''پرسوں کراچی پہنچ کر فون کروں گا، شام چھ بجے، انتظار کرنا۔''

انتظار بھی طویل ہوگیا۔

ساڑھے چھ بجے پہلی گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔ سخی سرور نہیں اعزاز تھا۔ تھکی ہوئی پژمردہ آواز۔

''انا کی جنگ لڑتے لڑتے ہار گیا ہوں۔ میرا وجود زخمی ہے آمین۔ تمہاری توجہ ان زخموں کو مندمل کرسکتی ہے۔ سب کچھ بھول جاؤ۔''

''ڈرافٹ مل گیا؟'' وہ بھی پکی کاروباری بن گئی۔ یہ وہ رقم تھی جو.....

''ہاں مل گیا آمین تم سے مل کر گزرے ہوئے چار سالوں کی روداد سنانا چاہتا ہوں۔ خود پر بھی ظلم ڈھاتا رہا تم کو بھی۔''

''میں آپ کی دکھ بھری کہانی نہیں سن سکتی۔ اصل میں کسی کے فون کا انتظار ہے مجھے۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔''

''آمین، آمین سنو..... یہ رشتہ اب بھی استوار ہوسکتا ہے۔ ابا کہتے ہیں کہ فون بند نہ کرنا پلیز..... ابا نے اجازت دے دی ہے۔ اس گھر میں تم ہی آ سکتی ہو اور کسی کی گنجائش نہیں ہے۔'' دولت پھر سے رشتے استوار کررہی تھی۔

''اعزاز صاحب! آپ لوگ فیصلے تبدیل کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے اور اب میں کسی کے احسان کا بوجھ نہیں اٹھا سکوں گی اور میں نے آپ کی محبت کا جوا کندھے سے اتار پھینکا ہے اور یہی میرا صحیح فیصلہ تھا۔ جواب بھی قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اب میں..... اعتبار کا رشتہ قائم کرچکی ہوں۔ اسے نہیں توڑ سکتی۔''

فون بند کرکے وہ وہیں بیٹھ گئی۔ سخی سرور کے فون کے انتظار میں۔

☆☆

روشنی سفر میں ہے

خالدہ

ہمارے معاشرے میں قربانی ہمیشہ عورت دیتی ہے۔ وہ بھی سیاہ رات میں دہلیز کو پیچھے چھوڑ آئی تھی لیکن تاریک اندھیروں کے سوا اس کے مقدر میں کچھ نہ تھا۔

ایک لاچار وبے بس مامتا کی کتھا وہ اپنی اولاد کے لیے طعنہ سننے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی

چاند تو اس نے عید کا دیکھا تھا مگر دن محرم کے گزر رہے تھے اور ان گریہ وزاریوں میں ڈوبے دنوں میں گھبرا کر سوچ رہی تھی۔

بچھڑے ہوئے، گزرے ہوئے وہ آوارہ لمحے جو دور بہت دور جا چکے ہیں۔ ان کی خوش بو کا احساس مارے دے رہا ہے۔ اب یہاں کی فضائیں میرے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ اس نے لمحوں کو سمیٹنا چاہا مگر وہ ریشم کے لچھے کی طرح پھسل گئے۔

جتنا وہ سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اتنا ہی الجھ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔ کوئی سرا مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔

بیٹیاں چار تھیں مزید اور ایک بچے کا بوجھ اٹھائے حیران و پریشان فیصلے کی سنگین پر لٹکی سانس روکے دن گزار رہی تھی۔ دل کے اندر ہر وقت دھمک پیل ہو رہی تھی۔ حالات نے سراسیمہ کر دیا تھا۔ ان حالات کا اس کے اردوں سے دور کا واسطہ نہ تھا مگر سب کچھ ہو رہا تھا۔ اس پر اس کے گھر کے دروازے بند ہونے کے منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے اور وہ کتنی تہی دامن تھی کہ کسی طرح ان فیصلوں کو روکنے پر قادر نہ تھی بلکہ ان فیصلوں میں ملوث گردانی جا رہی تھی۔ اس گھر میں اس نے پندرہ برس گزارے تھے مگر آج اس کو کسی دن کا ایک حصہ بھی نہ بچا پا رہا تھا۔

اس گھر کے در و دیوار گواہ تھے کہ خلق ترشی، نرمی گرمی، وفاؤں اور قربانیوں کے بدلے پندرہ برس ان تھک جدوجہد میں گزرے برسوں کے بدلے یہ گھر اس کو کیا دے کر رخصت کر رہا تھا۔

جس دہلیز پر وہ آنکھیں بند کر کے قدم رکھ کر آئی تھی وہ دہلیز پھنکار رہی تھی۔ آگ کے شعلے اور دہکتے انگاروں سے گزرنے کا نظارہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔

وہ کیا کرتی سوائے پریشان ہونے کے اور وہ کیسا نکلا۔ ہر جائی، بے گانہ اور سدا کا بے پروا اور انجان ساری محنتوں پر پانی پھیر دیا۔ ذرا جو ر کا ہو۔ اس کی بے ترتیب سانسیں الجھنے لگیں۔

"ہائے۔" کی درد بھری سسکی لبوں پر آ ٹکی۔

عورت بھی کیا بے بس شے ہے، ہر موڑ پر لوٹ لی جاتی ہے۔ روپہلی ارمانوں بھری جوانی لوٹ کر بند گلی کی خوشبو اڑا کر کیسی بھنوروں جیسی بے ایمانی پر اتر آیا ہے۔

میٹھا شہد، تمناؤں کا رس چوس کر خالی خول پھینک رہا ہے۔ ذرا جو گزری زندگی کو دیکھ لے۔ پچھلے دس دن پہلے سے وہ خاموش تھی۔ جسم اور سانس کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے وہ گھر آئے مہمان کی طرح چند لقمے حلق سے اتارتی اور پھر اندر آ لیٹتی۔ اس کی چار بیٹیاں، اس فیصلے سے بے خبر تھیں۔

اور وہ ان کو بتانا بھی نہ چاہ رہی تھی۔ معصوم ذہن آلودہ نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔ اس کی بڑی بیٹی تابندہ چودہ برس کی تھی۔ اس کی شادی کے پورے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ شادی کے ایک سال بعد تابندہ اور پھر تین تین سال کے وقفے سے فرخندہ، رخشندہ اور نین تارہ پیدا ہوئی تھیں اور اب وہ پھر امید سے تھی اور اس امید کے پورا ہوتے ہی وہ اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔

اپنی چار بچیوں اور آنے والے جگر کے ٹکڑے سمیت وہ سب سے دست بردار ہو جائے گی۔ کیسے صبر آزما لمحات ہوں گے۔ اس کا دل بھر آیا۔

کیسا ہے یہ بندھن۔

چاہو تو زندگی بھر کے لیے ایک گرہ کافی۔ نہ چاہو تو پل بھر میں سب کچھ ختم۔

کتنا کچا، بے موت اور منافق رشتہ ہے۔

دل میں ہال آیا اور سب کچھ لٹ گیا۔ کتنا ناپائیدار اور ہرجائی پن ہے، عورت سب کچھ سونپ کر بھی خالی ہاتھ رہ جاتی ہے۔ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ عورت تو موت و زندگی کی کشمکش میں لٹکی رہتی ہے۔ نہ ادھر نہ ادھر، یہ بیوی کا رشتہ جو ٹوٹ جائے تو چند لمحوں میں خالی ہاتھ کر دیتا ہے۔ سہاگن کو ابھاگن بنا ڈالتا ہے۔

تین لفظ ساری زندگی کی ریاضتوں، عبادتوں کو مٹی میں ملا کر سارا مان، غرور اور زندگی چھین لیتے

ہیں۔

دم گھوٹ لیتے ہیں۔ کیسا پھندا ہے کہ نہ جان نکلتی ہے نہ باقی رہتی ہے۔

وہ شام سے چپ چاپ چھت پر کھڑی وسیع وعریض آسمان پر نظریں جمائے اس رب سے مخاطب تھی جس نے عورت کی تخلیق میں احساس تو دل کھول کر دیا لیکن دکھ دینے میں بھی کنجوسی سے کام نہ لیا اور ان دکھوں کا تماشا دیکھنے، عورت کا صبر پرکھنے کو بہت دور ساتویں آسمان پر جا بیٹھا۔

مرد کے منہ سے ایسے لفظوں کا بھالا اتارا کہ فقط تین بار منہ کھولنے سے وہ سارے دکھ سکھ، رشتے ناتے، پیار محبتیں کھٹ سے دور جا گرتی ہیں اور عورت کا دامن سدا کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔

''تو نے مردوں کے ہاتھ میں ان کے دائرہ اختیار میں عورت کا نصیب دے کر اچھا نہیں کیا ہے اے مالک! میرے سچے رب! تو ان بھیدوں سے واقف سہی لیکن مجھے کیوں انتظار کی سولی پہ لٹکا دیا ہے۔ کر دیتا ایک ہی وار میں ان گنجھنوں سے آزاد مگر اس میں بھی تیری ہی کوئی اداسی ہوگی۔ پھر بھی تماشا دیکھنے کے بجائے کوئی راہ بتا دے کہ میں یہ وقت کس طرح گزاروں۔ ہر لمحہ ہر گھڑی کس طرح آگ کے سمندر میں غوطہ زن رہوں یا مجھ سے میرا حافظہ چھین لے کر کوئی شکوہ نہ رہے۔''

چھت کے بیچوں بیچ کھڑی وہ تھک چکی تھی۔ ٹانگیں شل سی ہو کر جسم کا بوجھ سہارنے کی اہل نہ رہیں۔

وہ گرنے والی تھی لیکن سنبھل گئی۔ اس کے وجود میں ایک اور روح تھی جس کو کوئی گزند نہ پہنچانا چاہتی تھی۔ اس پر تو وہ بقیہ خوشیاں نثار کر کے سرخ رو ہونا چاہتی تھی۔ کیا کرتی۔ ایک ماں تھی۔ اس کی بڑی بیٹی تابندہ کتنی ہی دیر سے کھڑی اس محویت کے عالم میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''ممی!'' تابندہ نے اسے پکارا مگر وہ آنے والی روح کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے کچھ پتا نہ چلا۔

''ممی!'' تابندہ نے اسے پھر پکارا۔

''ایں۔'' وہ چونک پڑیں۔

''ممی نیچے چلیے، اوپر کافی ٹھنڈ ہے۔ آپ بہت سے یونہی کھڑی کیا سوچ رہی ہیں؟''

''ہاں بیٹی چلو میں آ رہی ہوں۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''ممی! آپ کچھ پریشان سی ہیں۔ پلیز ممی بتایئے نا، آپ اتنی پریشان اور اداس کیوں ہیں؟ ممی جان! ڈیڈی کی باتوں کا برا نہ منایا کریں۔ ان کی تو عادت ہی ایسے ہے اور دادی اماں تو بوڑھی ہیں۔ بوڑھے لوگ تو سدا زندہ نہیں رہتے ممی۔''

وہ اپنی ماں کو سمجھا رہی تھی۔ بڑے پیار، رسان اور محبت سے۔

''تابندہ، میری جان! میری بچی، تیری ممی ٹوٹ چکی ہے۔ اس میں اور حوصلہ نہیں میری جان۔ وہ کب سے حالات سے مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ انسان ہے پتھر تو نہیں۔ اس کے پاس ایک دل ہے جس میں حسرتیں ہی حسرتیں ہیں۔ تیرے باپ کے دیے ہوئے ان گنت دکھ ہیں۔ اس کے گھر رہنے والوں کے صدمے ہیں۔ وہ ساری دنیا سے چھپ کر تم سے چھپ کر اپنے غموں سے تنہائیوں میں ملتی ہے جان۔ اسے مت چھیڑو اور اب تو شاید وہ اپنے آپ سے بھی مل نہ پائے گی۔ کیسے جیے گی؟''

مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ بس خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ ایک قدم آگے بڑھی پھر سوچ کر رک گئی۔

''تم چلو میں آتی ہوں۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

کئی دن سے بڑے ڈبل بیڈ پر وہ جب چپ چاپ آ کر لیٹ جاتی، نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہوتی اور آنے والے لمحوں کے خوف سے زرد پڑ جاتی۔ اس کے پہلو میں اس کا کچھ دیر کا ہم سفر محو خواب ہوتا۔

کبھی کبھی وہ دعا کرتی۔

''یا اللہ! مجھے صبر دے یا یہ سوچیں چھین لے۔ میں کیسے جیوں گی اپنی زندگیوں کے بغیر۔ اے اللہ! آنے والے بچے اور اس گھر سے جانے والی گھڑیوں کے درمیان مسافت بڑھا دے۔ میں اپنی تابندہ کو اپنے ہاتھوں سے اس کے گھر پہنچادوں۔ میری رخشندہ، میری نین تارہ میرے بعد کیا کریں گی؟..... بیٹیاں تو بڑی نازک اور حساس ہوتی ہیں اور میری بیٹیاں تو میری بہنیں ہیں۔ میں نے تو ان کو ہول کی چھڑی کا بھی دکھ نہیں دیا۔ پھر میری جدائی میں یہ کتنا تڑپیں گی۔ کس طرح بلکیں گی؟..... میرے پاس تو ان کے سوا کچھ بھی نہیں، پھر میں کس طرح زندہ بچوں گی؟ کیا وہ ظالم و کٹھور یہ سب نہیں جانتا۔ اس کو علم ہے وہ مجھے دکھ دے کر بھی سکھ نہ پائے گا۔

اس کی راتیں سوچوں کی نذر ہو جاتیں۔ وہ پہلو میں لیٹا خواب خرگوش کے مزے لیتا اور اس کے اجالے اندھیرے میں گم ہو جاتے۔

قبر برساتی ظالم راتیں، ساون کی برساتیں لیے آنکھوں کی راستے من کی کیاریوں کو کھاری پانیوں سے بھر دیتیں..... وہ چپ چاپ یستور کے محو خواب سراپے کو گھورتی رہتی۔

پندرہ برس پیشتر وہ دلہن بنی تھی۔ بہت ساری دلہنوں کی طرح دل میں ہزاروں وسوسے، اندیشے، خوب صورت دل کش جذبات کے مدوجزر اور رنگین لمحوں کے تصورات لیے۔ اس کا دل بے حد بے چین تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ بے شمار شوخ اور چنچل سہاگ راتیں، اپنی رنگین یادیں چھوڑ کے دبے پاؤں اس کمرے سے نکل گئیں۔

اسے اپنے نصیبوں پہ رشک آتا۔ اپنی سدا بہار خوشیوں پہ پیار آتا۔ وہ کتنی مطمئن تھی۔ یستور کا والہانہ پن، چاہتیں، خواہشیں اور ارمانوں بھری باتیں ہر وقت مجسم بہار بن کر اس کو سواگت کرنا۔ کتنا خوب صورت اور نا کو ہا لگتا۔

بہت سارے لوگوں میں بھی جذبات بے تاب ہو کر پگھل جاتے اور وہ زندگی کی سچی مسرتیں پا کر سب کچھ بھول گئی۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ ایک لڑکی ہے اور اس کی زندگی میں بہت سارے مرحلے آنے والے ہیں۔ بہت سارا سفر بہت کم عرصے میں طے ہو گیا۔

اور جب زندگی کی گاڑی رکی، جذبات تھمے تو ناہید تو وہی تھی مگر یستور کا چہرہ بدل گیا تھا، نیت کی طرح جب ہم سفر کی نیت بدل جائے تو رہبر رہزن بن کر لوٹ لیتا ہے اور اردگرد کے لوگ تماش بین بن جاتے ہیں۔ آج سب تماش بین تھے مگر ناہید کو تماشا بننا مقصود نہ تھا۔ وہ اپنی نازک ہستی پر ہر وار سہنا چاہتی تھی مگر لغزش ہو گئی۔ ایک زمانہ جانتا تھا کہ یستور ناہید کا دیوانہ ہے۔ اس کے پور پور کا دیوانہ ہے۔ اس کی چاہتیں والہانہ پن اور مر مٹنے کا انداز سب پر عیاں تھا۔ یستور ناہید کا ایمان تھا اور اس ایمان کو متزلزل کرنے والی ناہید کی دوست لبنیٰ تھی۔

پیاسے ساگر میں شک کا پتھر تابندہ کی پہلی سالگرہ پر پھینکا گیا۔ یہ پتھر لبنیٰ نے پھینکا تھا۔ لبنیٰ نے ناہید کو اطلاع دی تھی کہ یستور نیلوفر کے ساتھ بہت آگے جا چکا ہے۔ نیلوفر کے نام پر ناہید چونکی ضرور تھی کیوں کہ دو تین بار کسی نیلوفر کا فون یستور کے نام آیا تھا لیکن ایمان کی طرح پختہ اعتماد کسی لڑکی کے نام پہ کہاں ٹوٹ سکتا ہے۔ ناہید اور لبنیٰ میں اس بات پر تلخی بھی ہو گئی۔

لیکن پھر ناہید کو ماننا ہی پڑا کہ لبنیٰ نے سچ کہا تھا کیوں کہ اپنے کزن کی شادی میں ناہید کو یقین کرنا پڑا۔ وہ ریاض کی شادی کا دن تھا۔ جب اس کی ملاقات نیلوفر سے ہوئی۔ بڑے بڑے سرخ پھولوں والی کالی ساری میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی اور ناہید کے پہلو میں بیٹھا یستور بے چینی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جانے کیا کیا تبادلے بولتی آنکھوں نے کیے کہ ادھر نیلوفر رخصت ہوئی ادھر اداسی آیا کہ کہہ

کر ستیو رہی رفو چکر ہو گیا۔ ناہید آوازیں دیتی رہ گئی مگر وہ آوازیں لوٹ کر خالی ہاتھ اس تک پہنچ آئیں۔

اور پھر ناہید کی کوئی آواز یستور کے کانوں تک نہ پہنچ پائی۔ وہ ساری رات ناہید نے کانٹوں کے بستر پر رو رو کر بسر کی مگر اس کے چہرے پر پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بروٹ بدل کر مسکراتا ہوا سو گیا۔ تین سال وہ سولی پر لٹکی رہی اور یستور کے دن رات نئی راہوں پہ رنگیاں بکھیرتے ہوئے گزر گئے۔ وہ اسے بیوی بنا کر بھول گیا۔

تابندہ کے بعد فرخندہ اور نین تارہ بھی اس کا غم غلط کرنے کو آگئیں مگر وہ دکھی ہی رہی۔ زیست کا سامان بوجھ بن گیا۔ ہم سفر ہمدم اپنا نہ رہا۔ بیٹیاں مظلوم ہستیاں یکے بعد دیگرے اس کے دکھ کا سبب بن گئیں مگر اس نے لب نہ کھولے۔

اس کی ساس اس کے دکھوں کی گہرائی سے واقف تھی۔ اس کی چپ سے واقف تھی۔ وہ بھی کبھی اسے سمجھاتی، ماں بن کر یستور کی نہیں اس کی اپنی ماں بن کر اسے حوصلے اور دلاسے دیتی۔

''بیٹی! غم نہ کرو۔ مرد ساری دنیا کا چکر کاٹ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹتا ہے۔ وہ تیرا ہے۔ ایک نہ دو۔ چار بیٹیوں کا باپ ہے۔ کب تک جھک مارے گا؟..... بس انتظار کر، وقت کا انتظار۔''

اور وہ مسکرا پڑتی۔ دل ہی دل میں سوچتی۔ ''کب تک ماں جی! کب تک؟..... کیا ساری زندگی؟ تب کیا ہوگا؟ جب وہ ٹوٹ کر بکھر کر، کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو کر میری طرف لوٹ آئے گا۔ تب نہ دل ہوگا نہ اس دل کے ارمان وہ تو آپ ہی بجھ چکا، راکھ ہو گیا، اس کی جلائی ہوئی آگ میں۔

یہ تو مجھے بھی علم ہے خالہ جان کہ بڑھاپا اسے میرے در پر جھکا دے گا لیکن کون جانے یہ سوختہ دل اس کا انتظار کرے نہ کرے۔ دل ہی تو ہے کوئی سنگ وخشت تو نہیں۔''

وہ ایک دم بدل گیا تھا اسے اس کی ضرورتوں کی پروا نہ تھی۔ وہ کچھ کماتا ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔

جانے کیا کماتا، کیا اڑاتا تھا۔ اس کو فقط بچوں کے نا
پر جو ملتا وہ صبر شکر کر کے لے لیتی پھر اس نے
گھالی۔

''یستور! تو میرا نہیں تو تیری کمائی مجھ پر حرا
ہے۔'' پھر اس نے ذہنی فرار کی راہیں تلاش کر لیں
لیکن ان ناچاقیوں کا فسانہ ان تک محدود رہا۔ اس
کسی کو بتا کر اپنے آپ کو ارزاں نہ کیا۔ نظروں سے
گرنا کسی صورت مقصود نہ تھا۔

وہ مرد تھا اور کبھی کبھی اچانک وہ اس
مہربان ہو جاتا تھا۔ اس سے انتہائی میٹھی میٹھی
باتیں کرتا، اسے شادی کے ابتدائی دنوں کی
باتیں سناتا، اسے ہنسانے کی کوشش کرتا تو وہ اند
ہی اندر روتی رہتی۔ جی چاہتا منہ پر کہہ دے
مطلبی، دھوکے باز، فریبی اور اٹھا کر اسے دو
پھینک دے مگر وہ ایسا نہ کر سکتی۔ اس لیے کہ بھر
حصار اونچا اور اونچا رہے اور وہ اپنے پیاروں کو
میں سلگتا نہ دیکھ سکتی تھی۔

اپنے اردگرد بکھرے دشمنوں کو اپنی ذات پ
ہنسنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ اس کی ذات
جانے کتنے حصوں میں بٹ چکی تھی، ہر ایک کا خیال
رکھنا پڑتا تھا۔ وہ سارے خاندان کی خدمتیں کرتی
یستور کے تنگ مزاج بھائیوں کے سو سو ناز اٹھاتی
اس کی بہنوں کے لیے جی جان سے حاضر تھی۔ اس
کی بھاوجوں کو اپنی ساری چیزیں بے دریغ دیتی۔
اس کی نظروں میں ان چیزوں کی کیا وقعت تھی۔
اپنی ساس کے سامنے بھی نظر نہ اٹھاتی وہ جو چاہتی
وہی کرتی مگر حیرت انگیز بات تھی کہ وہ ساس جو اس
کی خوبیوں کی معترف تھی۔ اس کو سراہتی تھی۔ اس
پر مان کرتی تھی اس کی ساس جو بے حد مصنف تھی۔
جو ساری بہوؤں کو ایک نظر سے دیکھتی تھی۔ جو
دوسروں کی بہوؤں کی غیر موجودگی میں اسے بہت
اہمیت دیتی تھی۔ اس پر بھروسا کرتی، اسے سب
سے افضل جانتی اپنے بیٹے کی کمزوریوں کا رونا
روتی، اسے تسلی اور دلاسے دیتی مگر جب بھی کوئی

مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا وہ ہمیشہ ہی اسے مورد الزام ٹھہراتی، سب کی موجودگی میں اسے سخت سست کہتی اور اس کی بنی بنائی عزت خاک میں ملا دیتی حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ناہید حق پر ہے۔ وہ محنت کر کے اس کی عزت بناتی ہے۔ اپنے شوہر کا بھرم رکھتی ہے اپنے گھر کی عزت کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ وہ اپنے بچوں، اپنے شوہر اور گھر کے بھرم کے لیے بڑے بڑے صدمات نازک دل پہ سہتی ہے..... کب سے؟ جانے کب سے؟ جب فیصلے کا وقت ہوتا تو بیٹے کا پلڑا بھاری ہوتا وہ بالکل ہلکی اور بے وزن، ایسے میں ناہید حد درجہ دل گرفتہ ہوجاتی۔ وہ سوچتی انصاف کہاں ہے؟

میں جو فنا ہوگئی، لٹ گئی، بکھر گئی، ریزہ ریزہ، منتشر ہوگئی تو میری تباہ شدہ زندگی کے ملبے کے ڈھیر پر کھڑے یہ سب میری حسرتوں کا مذاق اڑانے والے، میرے کعبے کی بے حرمتی کرنے والے، میری دل آزاری کرنے والے، میری دکھی زندگی کو نظر انداز کرنے والے میرے مجرم، یہ میرے حقوق سلب کرنے والے روز قیامت پکڑیں جائیں گے ضرور پکڑے جائیں گے۔

وہ سارے آنسو سینے کے اندر اتار کر سوچتی رہتی اور لبوں پر سربند مہریں لگائے رکھتی۔

دن گزر رہے تھے۔ سرعت کے ساتھ اور آنے والے خوف ناک لمحے اسے بری طرح سہمائے دے رہے تھے۔

وہ باوجود کمر درد اور ہلکے بخار کے ساری الماریوں کی صفائی میں مصروف تھی۔ گرم کپڑے، ٹھنڈے کپڑے، بیڈ شیٹ، تولیے اور بچیوں کے کپڑے الگ رکھتی جارہی تھی۔ کئی مرتبہ وہ اپنے خیالات میں کھوئے کھوئے تابندہ کو پکار بیٹھی۔

''تابی جان! یہ کپڑے الجھنے نہ پائیں، جہاں سے چیز نکالو، وہیں رکھ دیا کرو اور ہاں بچی! اپنی چھوٹی بہنوں کا بے حد خیال رکھنا، تو بڑی ہے نا، اپنے ابو کی ہر چیز کا خیال رکھنا دیکھ، ابو کی قمیص ان کی الماری میں ہینگروں پر ہوگی اور بیلٹ ڈراز میں۔ ایک خانے میں جراب، رومال، ازار بند ہیں۔ ان کی کئی چیزیں چاندی کی ڈبے میں کف لنک، لائٹر اور تائی پن اور دو سونے کی انگوٹھیاں، ہر چیز کا خیال رکھنا.....!''

''آپ کہیں جارہی ہیں امی جان؟'' تابندہ حیرانی سے پوچھتی۔

اور اس کی آنکھیں جھل تھل بن جاتیں۔ وہ منہ چھپا کر دم گھونٹ کر فریادی لہجے میں کہتی۔

''ہاں چندا! بس چند دنوں میں ہاسپٹل جانا ہے۔''

''امی جان! میں سب کرلوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

اور وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہتی۔ ''ہاں بیٹا! سر پر پڑے گی تو کرنا ہی پڑے گا۔'' لیکن اس کا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل ڈالتا۔ کیا میرے بعد تابندہ یہ سب کرلے گی؟..... اس میں اتنا حوصلہ، اعتماد، اتنی ہمت ہوگی؟

ہائے میری بچی کن دشواریوں میں پھنس جائے گی مگر اس کو تو جانا ہے اب اس گھر سے کیا ناتا؟

سارے ناتے تو اس رات ٹوٹ گئے تھے جب زندگی میں پہلی بار اس نے احتجاج کیا تھا، اپنے حقوق کے لیے چٹان بن گئی تھی اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کے لیے زبان کھولی تھی۔ یستور کو احساس دلاتے دلاتے تھک گئی تھی اور جب اس نے اس کے حقوق ماننے سے انکار کردیا تھا۔

اور ہزاروں بار کا دہرایا ہوا جملہ کہ اگر تمہیں اتنی ہی تکلیف ہے تو چلی جاؤ یہاں سے، جہاں سکھ ملتے ہیں۔

تو اس نے قسم اٹھالی تھی کہ وہ واقعی یہ گھر چھوڑ دے گی، اپنی بچیاں چھوڑ دے گی۔ پندرہ برس چھوڑ دے گی۔ اس نے پہلی دفعہ دل اور دماغ کی جنگ

میں دل کا فیصلہ قبول کرلیا تھا۔

رات کسی بیوہ کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی اور اس کے مقدر کی طرح تاریک تھی۔ ناہید شدت درد سے تڑپ رہی تھی۔ سانسیں اندر ہی اندر روکے وہ اٹھی پہلے سے تیار شدہ اٹیچی میں چند چیزیں مزید ڈالیں۔ چاروں، بیٹیوں پر دکھی نظریں ڈالتی وہ یستور کی پائنتی میں کھڑی ہوکر سوچنے لگی۔ کیا اب میں واقعی رخصت ہورہی ہوں؟..... کیا واقعی یہ سب کچھ میرا نہیں رہا؟..... درد کی ایک اور لہر نے اسے تڑپا دیا۔ اسے جگاؤں یا خود ہی چلی جاؤں.....؟ گھر سے اسپتال کا راستہ زیادہ دور نہ تھا مگر عورت کی ازلی کمزوری اور ڈر اس کمزور لمحے میں بھی غالب رہا۔ وہ کشمکش کے دوران پھر ایک بے قرار درد کی لہر سے گزری تو دو آنسو بے اختیار ٹپک پڑے۔

یستور گھبرا کر اٹھا۔

''کیا ہوا ناہید؟''

''مجھے ہاسپٹل چھوڑ آیے۔'' وہ سب کچھ چند لمحوں کے لیے بھول گئی۔ بس یاد رہا تو وہ لمحے بھر کا والہانہ پن، یستور نے سلیپر پہنی اور اماں کی جانب تیز تیز قدموں سے بڑھ گیا۔

''اماں! آپ بچیوں کے پاس چلیں، ناہید کو ہاسپٹل لے جانا ہے۔''

اماں بھی ہڑبڑا کر اٹھیں اور سورۃ یٰسین کا دم ہوا پانی بی بی فاطمہ کا پانی میں بھگویا پنجہ لیا اور ناہید کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ اس نے بچیوں کے کمرے پر آخری نظر ڈالی اور روتے دل کے ساتھ خدا حافظ کہتی باہر آگئی۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

قدرت نے اسے بیٹے کی خوشی سے نوازہ مگر سات دن کی چاہتوں اور والہانہ پن اور شفقتوں کے باوجود انتہائی پتھریلے لہجے میں کہہ دیا کہ وہ سسرال نہیں جائے گی۔ اگر یستور بضد ہے تو بچہ لے سکتا ہے۔

ماں اور بچے کا رشتہ بڑا نازک رشتہ ہے اور ان نزکتوں کو ہر ماں جانتی ہے۔ یستور کی ماں بھی جانتی تھی سو بچہ ناہید کے پاس رہا۔ سب نے سوچا کچھ دنوں کی بات ہے۔ غصہ کم ہوگا تو آجائے گی۔

اماں نے دہلیز پر مٹی اکھیڑ ڈالی۔ خاندان کے ہر فرد نے منت سماجت کرلی۔ یستور نے وعدوں پر وعدے کیے مگر ناہید کی ناں، ہاں میں نہ بدلی۔

اس نے سچ کر دکھایا کہ واقعی اتنی ارزاں نہیں تھی جتنی اس کو سمجھا گیا۔

پھر سب ناامید ہوکر تھک کر بیٹھ گئے۔

لیکن اچانک وہ واپس آچکی تھی۔

اسے کوئی واپس لینے نہیں گیا تھا۔

کسی نے اس کی منت سماجت نہیں کی تھی۔

سب اسے کھوکر صبر کرچکے تھے۔ انہیں یقین ہوچکا تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔

مگر وہ آچکی تھی۔

بالکل اس طرح..... جس طرح ایک دن کبھی نہ آنے کے لیے گئی تھی۔

مگر آج اس کے آنے کا ایک جواز تھا۔

اس کی بیٹیاں جنہوں نے اس کے جانے کے بعد سب کچھ خوش اسلوبی سے نبھا دیا تھا۔ بہنوں کو سنبھالا تھا باپ کی خدمت کی تھی گھر بنالیا تھا۔

لیکن

وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ اتنی اچھی لڑکیوں کی زندگی میں ایک خلا، ایک کمی رہ جائے، ایک طعنہ رہے، کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں۔ کسی نہ کسی موڑ پر سسرال والے انہیں کہہ سکتے تھے،

''جیسی ماں ویسی بیٹی۔''

''ایک جملے نے اس سے نیچی نگاہوں سے وہ دہلیز پار کرالی جو کبھی نہ آنے کے لیے چھوڑی تھی اس لیے کہ وہ ایک ماں تھی، اور ماں کبھی اولاد کے لیے طعنہ کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔

☆☆

خونی عفرت

ایم الیاس

ماہرین نفسیات کے مطابق انسان اپنی جبلتوں کے زیر اثر جیتے ہیں۔ ان جبلتوں میں جذبہ بقا، جسمانی تقاضے، مثلاً کھانا پینا، سونا جاگنا، جنسی تسکین اور حصول مسرت، ہر انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ بنیادی اور جبلی ضروریات کے حصول میں گھٹن، معاشرتی عدم توازن اور رسم ورواج رکاوٹ بن جاتے ہیں پھر افراد میں بغاوت جنم لیتی ہے کیونکہ جبلی تقاضوں کو اپنی تسکین چاہیے ہوتی ہے۔

ایم الیاس نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی بدصورتیوں کو اس قدر خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان کی بدنمائی کہیں چھپ گئی ہے۔ انہوں نے انسانوں کو انسان کے طور پر ہی لیا ہے جو غلطیوں کا پتلا ہے اور یہی ان کے قلم کا کمال ہے۔

ایک ایسے سراغ رساں کی مہم جوئی جسے بمبئی میں ایسی مہم پر روانہ کردیا گیا تھا۔ جو بے حد خطرناک بلکہ پراسرار اور بے اہم تھی اس مہم میں اسے سردھڑ کی بازی لگانی تھی۔ اس کا واسطہ بلیک ٹائیگر جیسے ظالم درندے سے تھا۔

ایک کہنہ مشق مجرم کی سرگرمیاں جو ہمیشہ شکست سے دور رہتا تھا۔ تیز، سنسنی اور ایکشن سے بھرپور کہانی

خوشی کسی نہ کسی غرض اور مقصد میں ضرور ایک عورت کی طرح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں کہیں کہ جذبات کی آغوش میں مرد عورت کی باہم پے وست ہوتی ہے۔

رتن کمار میرے دفتر میں آیا تو یوں لگا تھا کہ وہ کوئی ایسا سندر سا سپنا ہے۔ جانے میں کب سے دیکھ رہا ہوں۔ جب کوئی آتا ہے اور وہ کسی رنگین سپنے کی مانند لگتا ہے تو حیرت سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

اس سنسار میں آدمی بڑا خود غرض، مطلب پرست ہی نہیں بلکہ خود پرست واقع ہوا۔ وہ ہر بات میں اپنی غرض اور مفاد سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے بیوی کو کیا ماں اور بہن کا دان دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ نوجوان بیٹی کی آبرو کی پروا نہیں کرتا ہے اگر اس کا سودا کرنے سے تو چوکتا نہیں ہے۔

اب آج کی بات پر حیرت نہیں ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا مغرور سے مغرور اور توپ قسم کا شخص اپنی غرض اور مفاد کے لیے معمولی سے معمولی آدمی کے چرنوں کو چھو لیتا ہے۔ اس کی گرد سر سے لگا لیتا ہے۔ اس طرح ایک کال گرل، ماڈل گرل، اداکارہ اور نوجوان کنواری لڑکیاں اور تو اور شادی شدہ عورتیں بھی کتیا کی طرح چرنوں کو چاٹنے سے کوتاہی نہیں کرتی ہیں۔

رتن کمار میرے دفتر کے کمرے کا دروازہ کھول کر گھسا تو یوں لگا وہ کوئی سپنا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

میری مالی حالت بڑی خستہ ہو رہی تھی۔ میرے پاس جو جمع پونجی تھی وہ برف کی طرح تیزی سے پگھلتی جا رہی تھی۔ ہر جائی محبوبہ بن گئی تھی۔ میں اس لیے بہت پریشان اور متفکر تھا کہ فاقوں کی نوبت آنے والی تھی۔ برے اور کڑے دنوں میں کوئی دس روپے بھی دیتا تو دور کنار دور سے ہی شکل دیکھ کر اس طرح کترا تا اور چھپ جاتا جیسے میں کوئی عفریت ہوں۔

میں نے اتنا جان لیا اور سمجھ لیا تھا کہ اس کی ایسی کوئی غرض اور مفاد ہے جو اسے میرے ہاں کشاں کشاں لے آیا ہے۔ میں اس لیے اندر ہی اندر خوشی سے سرشار ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو میری سیوا کی صلہ منہ مانگا دیتے ہیں۔ دے سکتے ہیں بخل سے کام نہیں لیتے ہیں وہ قدر کرنے والوں میں سے ہے۔ میری صلاحیت کا معترف ہے۔ قدر دان ہے۔

میں لندن میں اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تین برس تک ایشیائی شعبے میں سراغ رساں رہا تھا۔ مجھے اس لیے ملازمت ترک کر کے وطن واپس آنا پڑا تھا میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا اور اس کی آنکھوں کا تارا تھا۔ مجھے بھی اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ میرے واپس آنے کے بعد وہ تین ماہ کے بعد سورگ باش ہو گئیں۔

میرے پاس اتنی پونجی نہیں تھی کہ واپس جاؤں۔ میں اپنے وطن کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ یہاں میرے دوست احباب اور رشتہ دار بھی تھے۔ گزر اوقات کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ جائداد تھی اور نہ بینک بیلنس میں ملازمت کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے کہ نوکری نوکری ہوتی ہے۔ ایک طرح سے غلامی جو مجھے سخت ناپسند تھی۔ جب میں نے بہت سوچ بچار کی تو میرے سامنے ذریعہ معاش کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ میں سراغ رساں بن جاؤں۔ میں اس پیشے کے علاوہ کوئی اور ذریعہ معاش نہیں بنا سکتا تھا۔ کیوں کہ میں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تین برس میں جو تجربہ حاصل کیا تھا وہ اپنے ملک میں پولیس کے محکمے میں تیس برس میں بھی ایسا تجربہ حاصل نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اتنی صلاحیت اور قابلیت پیدا ہو سکتی تھی۔

یہ پیشہ میرے لیے اس لیے بھی سود مند اور منافع بخش تھا کہ دنیا اور حالات تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ روز بہ روز جرائم میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سنسار اس سے کبھی بھی پوتر ہو سکے گا۔ اس لیے کہ اس لیے کہ یہ ساری دنیا جیسے پیسے اور عورت کے پیچھے پاگل ہو رہی تھی۔ سارے فساد کی جڑ زر، زمین اور زن تھے۔ فحاشی، بدکاری، عریانیت اور قتل و غارت گری سماج کے لیے تباہ کن ہو رہی تھی۔

میں نے سراغ رساں ایجنسی کی بنیاد رکھی۔ ان چار برسوں کے عرصے میں میں نے جو کارنامے انجام

دیئے اس نے مجھے دولت مند تو نہیں بنایا البتہ میری مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ میری شہرت نے دوسری سراغ رساں ایجنسیوں کو متاثر اور ماند کر دیا تھا۔ شہر میں میرا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ جب کبھی بھی میں کوئی کیس لیتا تو اتنی فیس ہاتھ لگتی تھی کہ وہ بہنوں کے لیے کافی ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لیے بھی میں نے شادی نہیں کی تھی جب بازار میں دودھ مل جائے تو گھر میں گائے بکری بھینس پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں ہر طبقے کی لڑکیوں عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں بہت سینے دیکھتی ہیں اور ہر وقت ان کی خوب صورت آنکھوں ان جانے سپنوں کا عکس نظر آتا ہے۔ لندن میں جس طرح لڑکی عورت کا حصول آسان نہیں تھا۔ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ لندن میں آپ کو کوئی لڑکی عورت پسند آئے اور آپ کو اس کے ساتھ وقت گزاری کی خواہش ہوئی تو آپ اس سے براہ راست مخاطب کر کے اگر کہیں کہ کیا تم میرے ساتھ وقت گزارنا پسند کرو گی؟ اتنی فیاضی سے مہربان ہوتی کہ جیسے بیوی بھی ہو۔ شاید بیوی بھی خوش نہ کرے..... وہ کسی خواہش اور حرکت پر تعرض نہیں کرتی تھی۔ اگر اس نے کسی کو وقت دیا ہوتا معذرت کر لیتی۔ وہ ہم بستر ہونے کی دعوت پر برا نہیں مانتی تھی۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا۔ جسم کی طلب اور خواہش ہوتی تو میں سفید فام لڑکی کو ترجیح دیتا تھا۔ بہت کم ایشیائی لڑکیاں عورتیں تیار ہو پاتی تھی۔ امریکی اور یورپی لڑکیاں عورتیں وقت کی بانہوں میں زندگی سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ وہاں ہم جنس پرستی بھی عام تھی۔ ان لڑکیوں عورتوں کا نظریہ یہ تھا کہ میرا جسم میری ملکیت ہے میری مرضی جو میں کسی کے بھی سپرد کر دوں۔

میرے اس ملک کے اس شہر میں نہ صرف دفاتر کی ملازمت والی لڑکیاں عورتیں بلکہ ہائی اسکول اور کالج اور یونی ورسٹی کی وہ لڑکیاں جو اپنی شام اور زندگی رنگین کرنا چاہتی تھیں۔ جو اندرون ملک سے آ کر بورڈنگ اور ڈومن ہوسٹلز انہیں اخراجات پورے کرنے ہوتے تھے وہ تیار ہو جایا کرتی تھیں۔ میں ہندوستان آ کر کبھی کبھی اپنی جوانی کے جذبات کی تسکین کر لیا کرتا تھا۔ مجھے بازار حسن جانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ کیونکہ بلیو فلموں نے انہیں اپنا کردار ادا کرنا سکھا دیا تھا۔ کسی لڑکی عورت سے میں موبائل رابطہ کرتا تو وہ اپنی سیلفی دکھا کے معاملہ طے کرتی تھی۔ معاشرہ ایسا آلودہ ہو رہا تھا کہ یقین نہیں آتا تھا۔ رتن کمار کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جس نے میری خوشی دوبالا کر دی۔ یہ سوچ کر اس میں نوٹ بھرے ہوں گے۔

رتن کمار نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بڑی خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''مسٹر ونود کھنہ! آپ کیسے ہیں سر!''

''میں آپ کی دیا سے بہت ہی اچھا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''حکم کریں میں آپ کی کیا سیوا کروں؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے بریف کیس کو میز پر رکھ دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ شاید وہ اپنا مدعا اور غرض بیان کرے گا۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس نے کوڈ نمبر ملا کے بریف کیس کھولا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس میں جو نوٹوں کی گڈیاں وہ ہندوستانی کرنسی کی نہیں تھیں۔ وہ امریکی ڈالر تھے۔ اس نے گڈیاں میرے سامنے رکھنے کے بعد بریف کیس بند کیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''یہ ڈالر ہندوستانی کرنسی میں تین لاکھ چالیس ہزار بنتے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''باقی دو لاکھ ہندوستانی مہم سر ہونے کے بعد..... یعنی کل پانچ لاکھ روپے۔ اس کے علاوہ جو اخراجات سفر، ہوٹل میں رہائش اور شراب اور شباب پر خرچ ہوں گے۔ وہ میرے ذمے تم جس ہوٹل میں کمرا لینا چاہو میری طرف اس کی پوری پوری اجازت ہے کال گرل، شو بزنس کی مہ پارہ ماؤں اور فلمی دنیا کی اداکارہ یہ سب جسم فروشی کرتی ہیں۔ ان کا معاوضہ ایسا نہیں ہے جیسے کہا جاتا اور سنا جاتا ہے۔ یہ کتنائیں ہوتی ہیں۔ سودا کر کے انہیں بستر کی زینت بنانا۔ ویسے میں نے اس مہم کا تخمینہ دس لاکھ ڈالر بنایا ہے۔ میں رقم پانی کی طرح

بہانے سے دریغ نہیں کروں گا۔ کیا تمہیں اس مشن پر جانا منظور ہے؟‘‘

’’آپ نے جانے کیا کیا بتا دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ مشن کیا ہے؟ مجھے کیا مہم سرانجام دینی ہے؟‘‘ میں نے خوش دلی سے کہا ’’ایسا لگ رہا ہے کہ یہ حسین عورتوں لڑکیوں کے حسن وشباب اور جسموں کے خزانے لوٹنے کی مہم ہے جس کے لیے آپ دریا دلی کرنا چاہ رہے ہیں۔‘‘

میں ابھی اندھیرے میں تھا مجھے یہ سب کچھ کسی ان جانے اور رنگین سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ مجھے راجہ اندر بنا رہا تھا۔ آج تک کسی موکل نے اس دریا دلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا یہ کوئی پراسرار اور سنسنی خیز مہم لگ رہی تھی پھر دل کے کسی کونے میں شک کے زہریلے سانپ نے اپنا پھن اٹھا کے جیسے پھنکارا، کہیں دال میں کالا تو نہیں ہے؟ یا پھر ایسی کوئی خوف ناک مہم ہوگی جس میں جان جوکھوں ڈالنا ہوگی۔‘‘

اس نے ایک لاکھ امریکی ڈالر کی کرنسی میرے سامنے رکھ دی۔

’’یہ رقم ہوٹل، شراب اور شباب پر خرچ کرنے کے لیے ہے۔ اگر مزید رقم کی ضرورت ہو تو طلب کرنا ، میں صرف اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم کسی بھی صورت سے ناکام اور نامراد نہ آؤ۔ مجھے امید ہے کہ تم کامیاب اور بامراد رہو گے۔‘‘

’’لیکن آپ مجھے اس مشن کے بارے میں تو بتائیں؟‘‘ میں نے قدرے بے چینی سے کہا۔ ’’آپ کی باتیں بڑی پراسرار لگ رہی ہیں۔‘‘

’’میں تمہیں جس مہم پر روانہ کر رہا ہوں وہ نہ صرف بے حد خطرناک بلکہ پراسرار اور بے حد اہم نوعیت کی بھی ہے۔ جسے تمہیں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انجام دینا ہے۔ یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ کوئی بھی پراسرار اور خطرناک مہم درپیش ہو تو جان خطرے میں ڈالنا پڑتی ہے۔ سر دھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے اور ہر لمحہ موت سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ میں تمہیں اتنی بڑی رقم اسی لیے دے رہا ہوں کہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی بڑی رقم کو لے کر روپوش نہیں ہو جاؤ گے۔‘‘

پھر اس نے مجھے بتا دیا کہ مہم کیا ہے؟ میں نے اس کی پیش کش قبول کر لی۔ اتنی بڑی رقم اس کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆☆

جب میں ممبئی کے ہوائی اڈے پر اترا تو ایسا لگا کہ مجھے کسی ٹھنڈے پانی کے آبشار کے نیچے سے نکال کر تنور میں ڈال دیا گیا ہو۔ جب میں بنگلور میں آیا تھا تو اس شہر کا موسم نہ صرف بڑا خوش گوار بلکہ فرحت بخش بھی تھا۔ اس کا خوش گوار اس شہر کی طرح پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ جب آدمی کسی کام اور مہم پر نکلتا ہے تو وہ موسم وغیرہ نہیں نکلتا ہے۔ میں کوئی پہلی بار تو ممبئی نہیں آیا تھا ۔اس شہر سے میری بڑی سہانی اور رنگین یاد وابستہ تھیں۔ میں خوابیدہ سپنے دیکھ کر اس شہر کو یاد کرتا رہتا تھا اور پھر ہندوستان کے ہر صوبے کی لڑکیوں عورتوں سے جس طرح بخوبی واقف تھا اسی طرح موسم سے بھی واقف تھا۔

میں نے ممبئی کی بندرگاہ پر فائیو اسٹارز ہوٹل اشوکا میں کمرا لے لیا۔ یہ جتنا مہنگا ریسٹورنٹ اور ہوٹل تھا اتنا ہی خوب صورت اور اس کے کھانے بہت اچھے، عمدہ اور مزے دار ہوتے تھے۔ اس کے کانوں میں جو لذت اور ذائقہ اور مزا تھا وہ ممبئی کے کسی ہوٹل کے کھانوں میں نہیں تھا۔ اس لیے غیر ملکی سیاح اس ہوٹل میں قیام کرنے ترجیح دیتے تھے۔ ایک دو مرتبہ کسی وجہ سے ٹھہرنا نہیں ہوا تھا لیکن کھانا میں نے ہر صورت میں یہیں کھایا تھا۔

میں اس پراسرار اور خطرناک مہم کے آغاز کرنے میں عجلت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دو دن بعد اسے سر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے جو منصوبہ بنایا ہوا تھا وہ یکسوئی سے جہاز میں سفر کے دوران بنا لیا تھا۔ اس لیے میرے پاس دو دن وقت گزاری کے لیے تھے۔

اس بڑے شہر میں تفریح اور دل بستگی اور تفریحات کے لوازمات کی کوئی کمی نہ تھی۔ بڑی فراوانی تھی۔ یہاں کی لڑکیاں عورتیں امریکہ یورپ

کی سفید فام کی طرح آزاد خیال اور خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی تھیں۔ بارہ برس کی لڑکی بھی بستر کی زینت بن جاتی تھی۔ بس جیب میں مال ہونا چاہیے۔ اکیلا آدمی وقت کیسے کاٹے؟ شراب اور شباب کے بغیر وقت صدی کی طرح بھاری ہوتا جاتا ہے..... اور پھر میری طبیعت اور مزاج اور جذبات ایسے تھے کہ مجھ سے نچلا نہیں بیٹھا جا سکتا۔ اس لیے میں کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اور یہ وقت جو گزرنے کا نام نہیں لے رہا ہے کہاں اور کیسے گزاروں؟ جب تک کوئی تراشیدہ پیکر میری آغوش میں خود کو سونپ نہ دیا۔ فیاضی سے مہربان نہ ہوا اور میری کسی خواہش اور ارمان پر تعرض نہ کرے وقت نہیں کٹتا تھا۔ اس وقت میری حالت ایک ایسے پیاسے کی ہو رہی تھی جو کسی تپتے ریگستان میں پیاس بجھانے کے لیے چشمہ کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔

معاً میری نگاہ ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی پیراکی کے تالاب کی طرف اٹھ گئی جو عین میری نظروں کے سامنے تھا۔

اس تالاب پر امریکہ اور یورپ کے کسی سوئمنگ پول کا گمان ہوتا تھا۔ کیوں کہ یہاں غیر ملکی سفید فام لڑکیوں عورتوں کے علاوہ ہندوستانی لڑکیاں عورتیں بھی تھیں۔ ان میں اور مقامی لڑکیوں عورتوں اس لیے کوئی فرق نہیں تھا کہ وہ بھی پیراکی کے مختصر لباس میں ملبوس تھیں اور ان کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی تھیں۔ فرق تو رنگ کا تھا۔ سانولی، گندمی اور سیاہ چمکتی دمکتی اور روغنی رنگت کے مقابلے میں سفید فام رنگت ماند پڑ رہی تھی۔

تالاب میں اور اس کے کنارے مرد اور جل پریاں، آڑھی، ترچھی اور قہری موجود تھیں۔ ان کے بیٹھنے کے انداز اور زاویئے ایسے سنسنی خیز، دل کش اور دل کو برما دینے والے ہیجان خیز تھے کہ میں ان کے سحر میں ایسا جکڑ گیا تھا کہ خود کو فراموش کر گیا۔ عورت صرف خلوت گاہ میں ہی نہیں بلکہ بر سر عام بھی ایسے جلوے دکھا کر خوشی اور ناز اور تکبر کرتی تھی۔ ان جل پریوں میں ہر عمر، ہر قامت اور ہر رنگ و نسل کی تھیں۔ ممبئی چوں کہ انٹرنیشنل سٹی تھا۔ ہر قوم، نسل اور مذہب کے لوگوں کی صدیوں سے ہی بہتات تھی۔ وہ سب مجھ غریب پر حسن کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ انہیں اس بات کا کوئی خیال، فکر اور احساس نہیں تھا کہ کتنے انہیں نظروں میں جذب کر کے محظوظ ہو رہے ہیں۔ مردوں کے لیے وہ سب ایک کھلی کتاب کی مانند ہیں جس کا ایک جملہ، سطر اور صفحہ پڑھ رہے ہیں۔

میں نہانے اور بوریت دور کرنے اور محظوظ ہونے کی غرض سے ہوٹل کے پیراکی کے تالاب کی طرف چل تو رہا تھا۔ لیکن مجھے دکھ اور حیرت اس بات سے ہو رہی تھی کہ ہندوستانی معاشرہ مغرب کی اندھی تعلیم میں اتنی دور چلا گیا تھا اب ان کی واپسی ناممکن سی ہو گئی تھی۔ وہ اس قدر تیز رفتاری سے اندھا دھند دوڑ رہا تھا کہ اسے رک کر دم لینے کی فرصت تک نہیں رہی تھی۔ اسے روکنے ٹوکنے والا بھی تو نہیں رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی منزل کون سی ہے اور کہاں ہے؟

یہاں جو ماحول تھا اسے دیکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ قوم تہذیب کے اس ابتدائی دور میں پہنچ چکی ہے۔ جب انسانیت نے تہذیب کو چھوا نہیں تھا پہلے ستر پوشی بڑے بڑے پتوں سے کی جاتی تھی لیکن اب یہاں چند گرہ سے ہو رہی تھیں۔ بے حجابی کے جو نظارے تھے ان سے آنکھیں چرانا میرے کیا کسی کے بھی بس اور اختیار کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا میں ان کے رنگین شباب اور ہیجان خیز سراپا کو دیکھ کر دل میں اش اش کیے گزرتا جا رہا ہے تھا۔ ان بت کافروں نے مجھے اپنی طرف والہانہ نظروں سے دیکھتے پا کر وہ خوشی ہو رہی تھی کہ میں ان کے ہوش ربا پیکر کی قدر دانی کر رہا ہوں۔

میری نگاہ ایک ایسی ہستی پر مرکوز تھی جو کسی ایسی آتش فشاں پر مرکوز تھی جو کسی بھی لمحے یک لخت پلٹ سکتا ہے اور اس کا ابلتا ہوا لاوا اپنی لپیٹ میں لے کر جھلسا کر رکھ دے گا۔ اس کے بدن پر پیراکی کا مختصر لباس تھا جس نے اسے اور قیامت بنا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے رسمی طور پر پہن رکھا ہو۔ اگر اسے کھلی چھٹی دے دی

جاتی تو وہ شاید اس کا تکلف نہ کرتی۔ تالاب پر جو سماں اور نظارہ تھا وہ کسی نائٹ کلب کا سا تھا۔ جس کی رنگینی نے ماحول کو پراگندہ بنا رکھا تھا۔

اس عالم میں صرف وہ ایک ہی نہیں تھی جو جلوے بکھیر رہی تھی اور بھی نو خیز عمر کی لڑکیاں اور جواں سال عورتیں ہی نہیں ساٹھ ستر برس کی عورتیں بھی جنہوں نے خود کو سلمنگ پارلر کی مدد سے خود کو بے حد حسین اور طرح دار اور جسمانی طور پر پرکشش بنا رکھا تھا۔ یہ ایک طرح سے شکاری عورتیں جو نوجوان مردوں کو جسم اور دولت کا چارہ ڈال کر جال میں پھانستی پھرتی تھیں۔ وہ چونکہ چھریرے اور تناسب بدن کی ہوتی تھیں اس لیے شکار ان کے جال میں پھنس جاتا تھا۔ وہ پچیس تیس برس کی عمر کی لگتی تھیں اس لیے شکار دھوکا کھا جاتا تھا۔ لیکن اس شعلہ مجسم میں جو انفرادیت، حسن و شباب کی کرشمہ سازیاں اور رعنائیاں تھیں وہ کسی اور میں دکھائی نہ دیتی

اس قاتلہ نے دیکھ کر محسوس کر لیا تھا کہ میں بڑی دیر سے ہی اسے بڑی محویت کے عالم میں اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں اور اس کا رنگین، دیدہ زیب اور سنسنی خیز سرورق دیکھ رہا ہوں۔ اسے شاید میری یہ حرکت بدمعیوب، عامیانہ اور ناگوار لگتی رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اس طرح کھڑی ہوئی جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ ایک عجیب دوطرفہ سی بات ہوئی۔ عورت بھڑکیلے اور بے حجابی کی سی حالت میں اس لیے لگتی ہے کہ مرد اس کی طرف متوجہ ہو۔ اسے گھورا کریں۔ جب ایک مرد پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اسے غصہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ تضاد عورت کی فطرت کا خاصا ہوتا ہے۔ اسے غصہ آتا ہے۔ لیکن دل میں تو جیسے لڈو پھوٹنے لگتے ہیں۔ میں تو اسے گرسنہ نظروں سے نہیں بلکہ سراہنے کے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے میری طرف پیش قدمی کی تو انداز بڑا جارحانہ سا تھا۔ میں اس فریب میں مبتلا نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے قریب آ کر اپنی عریاں، مرمریں اور گداز بانہیں مجھے دان میں میرے گلے میں حمائل کر کے میرے چہرے پر جھک جائے گی۔ یہ لمحات بہت طویل ہوں گے۔ میرا یہ خیال اور اندازہ یکسر غلط محسوس ہوا۔ میں نے سر اسیمہ ہو کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آسمان پر پریاں تو ہونے سے رہیں۔ البتہ چیلیں، کوے اور دو گدھ اپنے شکار کی تلاش میں محو پرواز تھے۔ انتہائی مکروہ اور بھیانک نظارہ تھا۔ ان پرندوں کے لیے زمینی نظارہ ہیجان خیز تھا۔ اس لیے ان کی پرواز محدود تھی۔ وہ ایک دائرے میں تیر رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ میرے قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے میں نے دل کو مضبوط اور اس کی ہر حرکت اور کارروائی کے لیے ذہن اور جسم کو تیار کر لیا تھا۔ اس لیے انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی جا رہی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ ہوا میں خنکی تھی جو جسم میں فرحت بن کر اتر رہی تھی۔ پھر بھی میری پیشانی عریاں ہو رہی تھی۔ اگر وہ خود سپردگی اور پیار بھرے انداز سے آتی تو میں اس کی سواگت ایسی گرم جوشی سے کرتا کہ اسے یقین نہ آتا۔ ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے۔ کچھ جوڑے ایسی حالت میں جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ وقت کی بانہوں میں جھول رہے تھے۔

''ہیلو.....!'' اس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے رسیلی آواز میں مخاطب کیا تو مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ ''کیسے مزاج ہیں؟'' اس کا لہجہ نہ تو چبھتا ہوا تھا اور نہ ہی اس میں طنز پوشیدہ تھا۔ اس نے جو پوچھا تھا کہ مزاج کیسے ہیں۔ میں نے ایک ساعت میں یہ سوچا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میرا مزاج درست کر دینا چاہتی ہو لیکن ایسی کوئی پیشی نہیں آئی تھی۔

میں بھی ہیلو کہہ کر دل پر جبر کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جس انداز اور زاویہ سے کھڑی ہوئی تھی وہ میرے وجود کو خاکستر کیے دے رہا تھا۔ اس کے شیریں لہجے اور تیکھی نظروں اور قرب مجھے ورغلا رہا تھا کہ اس مرمریں، عریاں اور لچکیلی کرسیاں ہاتھ ڈال کر فاصلہ مٹا دوں۔ شاید وہ تعرض نہ کرے۔ لیکن میں کوئی خطرہ

مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ جب اس نے مصافحہ کے لیے اپنا خوب صورت اور نرم و نازک ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے تھام لیا۔ میں نے اسی انداز سے کہا۔

''کیا آپ یہاں بیٹھنا پسند فرمائیں گی آپ کچھ خیال تو نہیں کریں گی؟'' اس کے ہاتھ کا حسن تپش دینے لگا۔

مجھے توقع نہ تھی کہ میری دعوت خندہ پیشانی سے قبول کرلے گی۔ کیوں کہ وہ بہرحال ایک ہندوستانی عورت تھی۔ ہندوستانی عورت لاکھ ماڈرن سہی بہرحال وہ ہندوستانی عورت ٹھہری میں نے کہا تھا کہ اب مشرق مغرب کا لبادہ اوڑھ چکا تھا اور مشرق اس کی آغوش میں سما چکا تھا۔ اس کا ایک غیر اور اجنبی مرد کے پاس اس بے حجابی کے عالم میں بیٹھنا نا مناسب سا تھا۔ جب وہ شکریہ کہہ کر میرے قریب فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تو یقین نہ آیا۔

یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی کہ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ میں کوئی چاکلیٹی نوجوان نہیں تھا اور نہ کسی فلم کا کوئی بولڈ منظر عکس بند کیا جارہا تھا۔ میری عمر چالیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اسے کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ جو مجھے لفٹ دے اور کسی پکے کی طرح میری جھولی میں ٹپک پڑے۔ اس کے ایک اشارے پر جوان لڑکے تو کیا بڑے بڑے دولت منداس کے چرنوں میں اپنا سر رکھ سکتے تھے۔ اس نے مجھے بڑی بڑی آنکھوں میں جذب کیا تو ان کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہی ہے۔

میں اس کے دہکتے ہوئے قرب اور نشیلی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس سے رسمی انداز سے پوچھا۔

''کیا آپ کا یہاں آنا کسی فلم کام کرنے کے لیے یا کسی فلم ساز سے رابطہ کرنا یا پھر کسی اور کام یا تفریح کی غرض سے آنا ہوا ہے؟''

''یہ خیال آپ کے دل میں کیوں اور کیسے آیا کہ میں کسی فلم کا منظر فلمانے یا کسی فلم ساز سے رابطہ کرنے کی غرض سے آئی ہوں؟'' اس نے اپنی لامبی لامبی پلکیں جھپکائیں۔

''اس لیے کہ آپ اتنی حسین اور سیکسی ہیں کہ آپ کو کسی بھی فلم میں ہیروئن کا چانس باآسانی مل سکتا ہے۔ آپ کے فگر اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو فلم کے ہیروئن اور اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔'' میں نے اس کے چہرے اور سراپا پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ میری ضدی نگاہیں تھیں کہ اس پر سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ''ہندوستان کی ہر حسین، نوجوان، سیکسی لڑکیاں بس ایک ہی خواب دیکھتی ہیں کہ کسی فلم میں چانس مل جائے۔ وہ ایشوریا رائے، رانی مکرجی اور کترینہ کیف بن جائے۔''

''میں نے سنا ہے کہ صرف حسین اور پرکشش ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ قسمت کی دیوی کا مہربان ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب سے میں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تب سے ہی میرے نصیب اچھے نہیں رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جس لڑکی عورت کو فلمی دنیا میں چانس ملتا ہے وہ ایک طوائف سے بھی بدتر ہو۔ حیوان ہو۔ عورت کی ذات پر کلنک ٹیکہ ہو۔ اوپر سے نیچے تک وہ کھلونا بن کر خوش کرتی رہے۔ اس سے بہتر ہے کہ کال گرل بن جائے۔ اس میں شہرت نہیں دولت ملتی ہے۔ وہ اس لیے گر جاتی ہے کہ دولت ملتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ اداکارائیں عزت کے لیے غلاظت کے دلدل میں گر جاتی ہیں۔ فلمی دنیا میں جا کر پیسہ کمانا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ بازارِ حسن کی زینت بن جائے۔ جب یہ سب کچھ میرے علم میں آیا تو میں نے بھولے سے بھی فلمی دنیا میں جانے کے بارے میں سوچا نہیں اور نہ ہی ہیروئن بننے کے بارے میں کبھی خواب دیکھا۔ جب کہ میری سہیلیاں کہتی تھیں کہ میں نہ صرف نہایت حسین ہوں بلکہ خطرناک حد تک سیکسی ہوں۔ پھر بھی میرے دل کے کسی کونے میں کوئی خواہش اور امنگ پیدا نہیں ہوئی۔ میری دو ایک سہیلیاں جو نہایت حسین

ہیں اور سیکسی بھی ہیں قسمت آزمائی کے لیے گئی تھیں۔ لیکن وہ آلودہ ہو کر ناکام اور نامراد آئیں۔ لیکن میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اگر کوئی فلم ساز متوجہ اور غیر مشروط ہیروئن بنانے کی پیش کش کی تو سوچوں گی۔ یہاں میری آمد تفریح تک محدود رہے گی۔ اچھا آپ یہ بتائیں کہ یہاں کیسے آئے ہیں؟''

''ہوائی جہاز سے......'' میں نے شوخی سے کہا۔ پھر سنجیدہ ہو گیا ''مجھ جیسے آوارہ گرد کے لیے یہ شہر ہر قسم کی تفریح کے لیے امریکہ یورپ کے شہر سے کم نہیں ہے اور ملک کے بڑے بڑے شہروں کے مقابلے میں نہایت موزوں ہے۔ اس لیے میں چلا آیا اور کبھی کبھار آجاتا بھی ہوں۔ اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر کسی کو یہ شہر راس آجاتا ہے اور کسی بدنصیب کو نہیں۔ جب کسی کو راس آتا ہے تو وہ آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ جو نامراد ہو جاتا ہے وہ فٹ پاتھوں پر سوتا اور بھیک مانگ کر گزارہ کرتا ہے۔''

میری یہ بات سن کر اس کی خوب صورت اور بڑی آنکھوں میں گہری سوچ بھر گئی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے یکسر عاری ہو گیا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اگلے لمحے اس کے چہرے پر کرب اور فکرمندی کی لکیر ابھر آئی تو اس نے بے حد افسردہ اور پریشان کر دیا تھا۔ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ بھی اشوکا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی نہیں ہوں۔''

''پھر آپ یہاں کس لیے آئی ہیں؟'' میں نے متعجب ہو کر اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا۔ ''کیا آپ کو یہ ہوٹل اور تالاب بہت پسند ہے۔ یہاں نہانے کی اجازت یہاں کے مقیم گاہکوں کو ہے۔''

''میں یہاں صرف آج نہیں ہوں بلکہ روز ہی اپنے شوہر سے ملنے آتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا آپ کے شوہر ساتھ نہیں رہتے ہیں جو یہاں آپ ان سے ملنے روز روز آتی ہیں؟'' میری حیرت دوچند ہو گئی۔ ''کیا کسی وجہ سے آپ دونوں میں بنتی نہیں ہے؟''

''وہ ساتھ رہتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ چوں کہ سارا دن اس قدر مصروف رہتا ہے کہ اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں رہتی ہے اس لیے مجھے دن کاٹنا تنہائی میں اذیت ناک بن جاتا ہے۔ اس وقت مجھے اس کا قرب ملتا ہے جب اسے اپنی غرض ہوتی ہے۔ یہ بڑا رسمی سا انداز ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو گرم جوشی ہوتی ہے اور نہ جذباتیت۔ ایک ایسی سرد مہری کہ باہم پیوست ہو کر بھی میں بے کیفی محسوس کرتی ہوں۔ لہٰذا میں اسے ایک سرد لاش کی طرح اپنے آپ کو حوالے کر دیتی ہوں۔ اس لیے میں اپنی بوریت دور کرنے اور خوش و خرم رہنے کے لیے یہاں اکیلی تفریح اور خود غرضی کے لیے آجاتی ہوں۔''

مجھے اس کا جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی اور اس پر رحم بھی آیا کہ یہ رنگین تتلی روتی پھرتی ہے۔ وقت گزاری کے لیے اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ ایک اشارے پر اس کے کتنے قدردان پروانوں کی نثار ہو جائیں۔ اس کی یہ بات مجھے نہ صرف بے حد عجیب و غریب بلکہ بڑی پراسرار سی لگی۔ تاہم میں نے اسے خوش کرنے کے ارادے سے کہا۔

''حالانکہ آپ شادی شدہ ہیں مگر آپ تو کسی کنواری لڑکی کی طرح دکھائی دیتی ہیں...... سولہ برس کی ہوں جیسے۔''

''میں اس شادی کو جو جرم و زیادتی کا نام دیتی ہوں جو مرضی کے خلاف کی جائے مسٹر رتن کمار! جبر و زیادتی سے شادی کر کے مرد جسم تو جیت سکتا ہے لیکن دل نہیں شادی جسم کا ملاپ نہیں بلکہ دو آتماؤں کا سنگم ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس شادی سے بالکل بھی خوش نہیں ہوں۔ مسٹر ونود کھنہ......!''

میں اپنے دل میں بڑے زور سے چونکا۔ اس

رنگین تتلی کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ یہ مجھے کیسے جانتی ہے؟ کب سے، کس طرح سے واقف ہے۔ جب کہ میں اسے آج ابھی اور اسی وقت سے جانتا ہوں۔ اگر میں نے اسے اس سے پہلے بھی دیکھا ہوتا تو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ ایسی نادر چیزیں لاکھوں میں ایک ہوتی تھیں۔ آخر میں نے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔

''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی آپ مجھے کب سے اور کیسے جانتی ہیں؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری آپ سے کہیں بھی ایک بار بھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی ہے اگر ہو جاتی تو آخری سانس تک نہیں بھول سکتا۔'' آپ ایسی نہیں ہیں کہ ایک بار دیکھنے اور ملنے کے بعد دل و دماغ بھلا دے آپ سینکڑوں اور ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہیں۔'' میں نے شاعرانہ انداز سے اس کی تعریف کر دی۔

اس کے رس بھرے گداز ہونٹوں پر جو تپش دے رہے تھے اس پر دعوتی مسکراہٹ ابھر آئی۔ عورت جس کی کم زور اس کے حسن و شباب کی تعریف ہوتی ہے اور اندر ہی اندر مسکراتی اور پھولی نہیں سماتی ہے۔ اس نے مجھے خمار آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کے بارے میں جیسا سنا تھا آپ کو ویسا ہی پایا۔ آپ واقعی بے حد دل چسپ اور زندہ دل شخص ہیں آپ شاعرانہ ذوق اور مزاج رکھتے ہیں۔'' پھر اس نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تو میں نے اپنا دل تھام لیا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ لا کر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ کو خوش فہمی ہو رہی ہے کہ میں آپ کے دراز قد جسم اور چوڑے چکلے اور ان فولادی بازوؤں کی گرفت میں جکڑ جانے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ جو کشاں کشاں چلی آئی ہوں۔''

''یہ آپ کا اندازہ اور خیال ہے۔ میں ایک حقیقت پسند شخص ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میری یہ عمر خواب دیکھنے کی نہیں رہی ہے۔

''مگر میں اس بات کا کھل کر ضرور اقرار کروں گی اور بخل سے کام نہیں لوں گی کہ آپ کے کسرتی جسم کی خوب صورتی، مضبوطی اور دراز قد نے کیا جولاکھوں میں صرف ایک مرد ہی میں ہوتی ہے مگر میں آپ کی وجاہت کی تعریف کرنے نہیں آئی ہوں۔ اپنی غرض سے آئی ہوں۔ میں آپ سے ایک سودا کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بڑے پراسرار انداز سے سرگوشی کی جیسے کوئی سن نہ لے۔

''سودا.....؟ آپ مجھ سے کیا سودا کرنا چاہتی ہیں؟ میں جسموں کا سوداگر نہیں ہوں بلکہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ آپ مجھے کھل کر بتائیں آپ کو کس نے میرے متعلق بتایا۔ جب تک آپ نہیں بتائیں گی اس وقت تک بات نہیں بڑھے گی۔ یہ میرا اصول ہے۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''میں بہت ہی اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کون ہیں اور کیا شخصیت ہیں۔ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں اس لیے مجھے ہر قیمت پر آپ کی خدمات درکار ہیں۔ یوں تو کل شام ہی مجھے آپ کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ لیکن آپ کے کارناموں کے بارے میں سن چکی ہوں۔ پڑھتی بھی رہی ہوں ہفت روزہ کرائم ٹائمز میگزین میں آپ کی تصویر دیکھی تھی لیکن آپ کی وہ تصویروں پر نقش نہ تھی لیکن کل شام آپ کی جو تصویر دیکھی وہ اس طرح دل پر نقش ہوئی کہ شام کے وقت میں ساؤتھ انڈین ریسٹورنٹ میں بیٹھی مسالہ دوسا کھا رہی تھی۔ اس وقت ایک ہاکر لڑکا شام کا اخبار بیچتا ہوا آیا تو میں نے اس لڑکی کی مدد کے لیے اخبار خرید لیا۔ اس اخبار کے پہلے صفحے پر آپ کی تصویر دیکھ کر میرا شوہر اس طرح اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ لہو کی بوند بھی نہ رہی۔ میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر بھوچکی سی ہو کر رہ گئی۔ اس لیے کہ وہ شخص دنیا میں کسی سے بھی ڈرتا نہیں ہے۔ اس نے خود ہی آپ کی تصویر کی طرف مدعہ کر کے کہا کہ یہ رتن

کمار ہے۔ جن کے کارناموں کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی یہ حرام زادہ جتنا بہادر ہے اتنا ذہین بھی..... لیکن یہ مردود یہاں کر کیا رہا ہے؟ اس کے یہی الفاظ تھے۔ اس کی تشویش اور پریشانی اور خوف زدگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی لمحے غش کھانے والا ہے۔''

''جرائم پیشہ افراد کے میرے متعلق اس قسم کے ریمارکس ہوتے ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور میں اس قسم کے نازیبا اور ناشائستہ الفاظ اس طرح سنتا رہا ہوں۔ اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ آپ میری خدمات کیوں اور کس لیے حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ بائی دے وے۔ مجھے آپ کی سیوا کر کے بڑی دلی خوشی ہوگی۔''

''دراصل میں اپنے خبیث اور جلاد قسم کے ظالم شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بڑی حقارت سے بولی۔ اس کے حسین چہرے پر سنجیدگی کی گھٹا چھا گئی اور آنکھوں میں سے غم جھانکنے لگا۔ میں اس سے اس قدر تنگ اور عاجز آچکی ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔

''اس کام کے لیے میری خدمات کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''آپ خود ہی تنہا اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی ہیں۔''

''وہ کس طرح.....؟'' اس نے چونک استعجاب بھری نظروں سے دیکھا۔

''اس طرح کے کسی دن گدھے کے سینگ کی طرح پراسرار کسی بڑے صوبے میں روپوش ہو جائیں۔ اس ملک میں بائیس صوبے ہیں۔ کروڑوں کی آبادی ہے۔'' میں نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔ ''چالیس کروڑ کی آبادی میں وہ آپ کو تلاش کرنے سے رہا۔ اگر اس نے تلاش کرنے کی کوشش کی تو چالیس برس کا عرصہ لگ جائے گا۔ ان برسوں میں وہ آپ کو پہچانے سے رہا۔ خود اتنا بوڑھا ہو جائے گا معذور ہو کر رہ جائے گا۔

''مجھ میں اتنی ہمت اور جرات نہیں رہی۔'' اس نے پست لہجے میں کہا۔ ''اگر میں دھر لی گئی تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔''

''آپ نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟'' میں نے موضوع بدلا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟ کس نام سے پکاروں؟ کہیں آپ بے نامی تو نہیں ہیں؟''

وہ ایک دم سے کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی سات سر کا ایک سر تھی۔ وہ شوخی سے بولی۔

''کیا کوئی بے نام بھی ہوتا ہے؟ میرا نام پونم ہے۔''

''سنیں..... مس پونم صاحبہ! آپ میری کسی بھی بات کا برا نہ مانیں، میں یہاں چھٹیاں گزارنے اور تفریح کے لیے آیا ہوا ہوں۔ میں کسی ایسی عورت کا کیس لینے تیار نہیں ہوں جس کا شوہر ناراض ہو۔''

''پلیز بھگوان کے لیے آپ سے ناراضی اور نفرت کا نام نہ دیں۔ میں اس سے کس قدر سخت نفرت کرتی ہوں آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں اس سے ایک عورت ہونے کے ناتے کس قدر بے زار اور متنفر ہوں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' اس کے لہجے میں سارے جہاں کا دکھ بھر آیا اور چہرے پر کرب ابھر آیا۔ ایسا لگا جیسے وہ ابھی پھوٹ کر رو دے گی۔ ''وہ درندہ صفت ہے۔ عورت کو جوان سمجھتا ہے۔ مجھ سے ایسا پیش آتا ہے کہ اس میں ایک بھیڑیے میں فرق ہی نہیں رہتا ہے۔''

''اس قدر نفرت اور حقارت کی یہ وجہ تو نہیں کہ وہ آپ کو گھناؤنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنا رہا ہے؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''اس لیے بھی کہ آپ غیر معمولی طور پر حسین اور کسی ساحرہ سے کم نہیں ہیں؟''

''آپ نے بہت ٹھیک اندازہ کیا ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کے خبیث اور بے تکلف دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر کٹھ پتلی بن جاؤں۔ ان کی بے ہودہ گفتگو سنتی اور ان کی بھوکی اور غلیظ نظروں کو سہتی رہوں۔ یہ تو ایک حد تک قابل برداشت ہے لیکن یہ کہ ان کی گود میں

بیٹھ کے نہ صرف ساتی بن جاؤں بلکہ ان کی ناشائستہ معیوب حرکات کا اور کسی قسم کی من مانیوں کا برا نہ مانوں بلکہ اسے ذاق کیوں وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ میرے تن پر دھجی تک نہ ہو اور اس کے دوست اس حالت میں مجھے دیکھ کر محظوظ ہوتے رہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ ایک عورت کے ناتے یہ میرے لیے کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ میں اس کی کسی بات سے انکار نہیں کرتی ہوں تو وہ تشدد پر اتر آتا ہے۔ میرا لباس پھاڑ دیتا ہے تھپڑوں سے چہرہ بگاڑ دیتا ہے۔ یہ سب کچھ میرے لیے سوہان روح ہوتا ہے۔ میں کوئی فاحشہ یا طوائف نہیں ہوں۔ شاید طوائف بھی برداشت نہ کر پائے۔ میں بہت دیر ان کے ہاتھوں کھلونا بنی رہتی ہوں۔ کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں دل کرتا ہے کہ کہیں سے پستول لے آؤں۔ ان سب کو بھون کر رکھ دوں۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں۔ اپنی جوانی اور زندگی کے ہر لطف اٹھاؤں۔ جیل جانے سے مرنا بہتر اس لیے سمجھتی ہوں کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ جو جوان لڑکیاں عورتیں، ملزم اور مجرم ہوتی ہیں جیل میں ان سے سپاہی، پہرے دار اور جیل خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔''

تیز تیز بولنے کی وجہ سے اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ اگر تنہائی ہوتی تو شاید میں خود پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ تاہم میں نے اس کے دھڑکتے سینے سے نگاہیں ہٹا کے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

''آپ وہم کا شکار نہ ہوں کہ یہ سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے سمجھایا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ ہم دردی ہے۔ آپ کو میری کسی قسم کی مدد اور حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی مدد آپ با آسانی کر سکتی ہیں۔''

''آخر آپ کو اس قدر پس و پیش کیوں ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک غیرت مند شوہر کیا اپنے دوستوں کی اس کی بیوی کے ساتھ بے ہودہ باتیں معیوب حرکات برداشت کر سکتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک نادر تدبیر ہے۔ آپ اس وقت تک میرے محافظ بنے رہیں کہ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں فرار ہو کر بنگال یا آسام چلی جاؤں۔''

''میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی کیس لینے تیار نہیں ہوں۔ اس لیے بھی میری ساری تفریح اور چھٹیاں غارت ہو کر خاک کی نذر ہو جائیں گی۔ اگر آپ کیا میری جگہ ہوتیں تو اپنی تفریح غارت کر دیتیں؟''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ فق سا ہو گیا۔ اس کی میری پشت پر کسی کو دیکھتے ہی یہ کیفیت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی مخالف سمت دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''ہیلو گوپال! آج تم نے بڑی دیر کر دی۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا ناقدانہ انداز سے جائزہ لیا۔ وہ ایک خوب صورت، وجیہہ اور تنومند جوان مرد تھا۔ دراز قد نے اسے پرکشش بنا دیا تھا۔ وہ ہماری طرف مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پونم اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے بھی پہل کی۔ پونم نے فوراً ہی تعارفی رسم ادا کی۔

''گوپال! آپ ہیں مسٹر ونود کھنہ۔'' پونم نے رسیلی آواز میں کہا۔

''ہیلو گوپال.....!'' میں نے دوستانہ انداز سے اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے نظر انداز کر دیا جس سے مجھے خفت ہوئی۔

''اچھا تو تم احمق ہو جس کا دفتر بنگلور میں ہے اور جو وہاں مکھیاں مارتا ہے۔'' وہ تمسخر سے بولا۔

''میں صرف ونود کھنہ ہوں۔ میں نے دانستہ لفظ سراغ رساں کا استعمال نہیں کیا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ کیوں کہ اس کا رویہ توہین آمیز تھا۔ میرے سخت لہجے میں جواب دینے سے ایک لمحے کے لیے ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ کھلنے لگی۔ وہ اپنی بتیسی کی

استہزائیہ انداز میں نمائش کرنے لگا۔ میں نے اپنا غصہ ضبط کیا ہوا نہ ہوتا تو اس کی بتیسی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔

دوسرے لمحے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے قدرے تمسخرانہ انداز سے کہا۔

''مسٹر ونود کھنہ! مجھے تم جیسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی گرفت میرے ہاتھ پر مضبوط کر کے میری انگلیوں کو پوروں سمیت دبانے لگا تو انگلیاں چٹخنے لگیں اور درد کی لہر پھیلنے لگی۔

''مسٹر گوپال! پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بدتمیزی بالکل بھی پسند نہیں ہے۔''

اس نے میرا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے پوری قوت سے میری انگلیوں کو دبانا شروع کر دیا تھا کہ میری انگلیوں کو گاجر مولی کی طرح توڑ کر رکھ دے گا تاکہ وہ کسی قابل نہ رہیں۔ ناکارہ ہو جائیں۔ میرے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں بھی مقابلے کے لیے میدان میں اتر آؤں۔ اسے ایسا سبق دوں کہ یاد رہے۔

میں نے برقی سرعت سے اپنا سر اس کے بغل میں دے کر اسے چاروں شانے چت کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ کی قلائی پکڑ کے اسے بل دینا شروع کر دیا۔ جب اسے کھڑا کیا تو وہ کراہ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی تشریف پر لات رسید کی تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑاتا ہوا سیدھا پیراکی کے تالاب میں جا گرا۔

تالاب کے کنارے پر جو لوگ موجود تھے انہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کیوں کہ وہ لوگ اپنی تفریح، رنگینی اور باتوں میں مشغول تھے۔ ورنہ گوپال ایک تماشا بن جاتا۔ وہ ایک غوطہ کھانے کے بعد ابھر آیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے تیرنے کا کام لے رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر اس کا دوسرا ہاتھ اس قابل رہنے نہیں دیا تھا کہ وہ اس سے تیرنے کا کام لے سکے۔ اس کا ہاتھ ٹھیک ہونے میں خاصی دیر یا دو ایک دن بھی لگ سکتے تھے۔ موچ آ گئی تھی۔

گوپال پانی میں سے منہ نکال کر میری شان میں قصیدے پڑھنے لگا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے کمند پر جا کر اسے بری طرح ڈانٹا۔

''اگر تم نے اپنی چونچ بند نہ کی تمہارے چہرے کا جغرافیہ بدل دوں گا۔ تم خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ سکو گے۔''

اس نے میری دھمکی کا کوئی اثر نہ لیا۔ شاید اس نے محض گیدڑ بھبکی سمجھا تھا پھر میں وہاں سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں ایسے یہاں تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ تفریحی جگہ تھی۔ ماحول بدل جاتا۔ رنگ میں بھنگ پڑ جاتا۔

چند لمحوں کے بعد وہ تالاب سے نکل کر بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو سہلانے لگا اور پھر وہ اپنی جیبوں اور بازوؤں میں کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ وہ یہ تاثر دے رہا تھا کہ پستول تلاش کر رہا ہے۔ جو برآمد نہ ہو سکا۔ شاید تھا، ہوگا۔ لیکن جب تالاب میں غوطہ زن ہوا تو پستول نکل گیا ہوگا۔ البتہ اس کے چہرے پر نفرت اور غصہ تھا اور ذلت کا احساس بھی پھر وہ مجھے خوں خوار نظروں سے گھورتا ہوا ایک سمت چل دیا لیکن وہ مسلسل بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے انتہائی فحش گالیاں بک رہا تھا۔ کیوں کہ میں نے اس کا حشر نشر کر کے اسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ کسی گیدڑ کی طرح دم دبا کے بھاگے جا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ میں اس کی درگت بنا سکتا ہوں۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میرے دل میں ہنسی کی لہر اٹھی لیکن میں نے ہونٹوں پر نمودار ہونے نہیں دیا۔

جب وہ کچھ فاصلے پر جا کر رکا تو اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھ سے ہاتھا پائی کرنا آسان نہیں ہے۔ میں جوڈو کراٹے میں ماہر معلوم ہوتا ہوں۔ اس کے ساتھیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جو قدرے فاصلے پر اشارہ کرنے لگے۔ وہ اس بہانے

مجھے جیسے دھمکا رہے تھے۔

''یہ ہے میرا پتی اور اس کے وہ یہ دوست جن کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا۔ ان کے نازیبا کلمات سننا اور ناشائستہ حرکات کو دل پر جبر کر کے سہنا پڑتا ہے۔ ان کمینوں میں سے کون ایسا ہے جس نے مجھے چومانہ ہو۔ بس چلتا تو حد سے تجاوز بھی کر جاتے۔ اسے اپنے ان پالتو کتوں پر بڑا ناز ہے۔ اندھا بھروسا کرتا ہے۔'' وہ ایک لمبا سانس لے کر بولی۔ ''کاش میرے نصیب خراب نہ ہوتے۔''

''آپ کے شوہر کا پورا نام کیا ہے؟'' میں نے ہم دردانہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''گوپال ڈینجر.....'' پونم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا یہ وہی کمینہ گوپال ہے جسے عرف عام مرگ ناگہاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ اس خبیث کے بارے میں جانتے ہیں؟'' پونم نے حیرت سے یہ بات کہتے ہوئے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''اس کے بارے میں اور اس کے گھناؤنے جرائم کے بارے میں کون نہیں جانتا ہے؟ اس نے تین چار برس کی چار معصوم پھول جیسی اور نازک کلیوں کو اس بری طرح مسلا تھا کہ وہ کئی دنوں کے بعد ہوش میں آئی تھیں کیوں کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت اور چشم دید گواہ نہیں تھے اور پولیس اس کے پالتو کتے تھے اس لیے وہ قانون کے ہتھے نہیں چڑھ سکا۔ میں نے زیر زمین دنیا کے بدمعاشوں سے اس کا نام سنا ہوا تھا اس نے اپنا نام ڈینجر اس لیے رکھ لیا تھا کہ بدمعاش اور پولیس بھی اس خوف کھائیں۔ لیکن آج اتفاق سے ایک حادثاتی لمحہ سے شرف ملاقات بھی ہو گئی اور اس سے دو دو ہاتھ بھی ہو گئے۔ لیکن یہ جتنا خوفناک ہے اس سے کہیں خطرناک ترین شخص بھی ہے۔ اب مجھے آپ کا محافظ بننے سے پہلے فوری طور پر اپنے لیے ایک مسلح محافظ کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ورنہ میری خیر نہ ہوگی۔ میں زندہ سلامت ایک دن بھی نہیں رہوں گا۔''

اس کے بارے میں، میں جو کچھ جانتا تھا، سنا تھا وہ یہ تھا کہ نوجوانی سے اس کا شمار خون آشامی سے درندہ صفت کوشر مندہ کر دینے والوں میں سے تھا۔ اس نے کتنی لڑکیوں، بچیوں اور عورتوں سے درندگی، زیادتی اور بے حرمتی اور ایذا رسانی کر کے تاراج کیا اس کی تعداد اسے خود بھی یاد نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جرائم کی دنیا میں اس کے مقابلے کا کوئی نشانہ باز نہیں تھا۔ وہ جس حالت میں بھی نشانہ لیتا تھا وہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو ڈینجر ہر کوئی کہنے لگا تھا۔ ایک طرف وہ بے حد سرد و سفاک اور شقی القلب مزاج کا تھا۔ زیر زمین دنیا میں اسے ہر کوئی ڈینجر کے نام سے ہی جانتا تھا۔ دوسری طرف اس کی کھوپڑی میں عقل نام کی چیز بھی نہیں تھی۔ اس کے اندر کسی درندہ کی طرح انسانی ہم دردی کی رمق بھی نہیں تھی۔ وہ پتھر دل تھا۔ شاید اس نے اپنے ماتا پتا، بہن اور ماں سے بھی محبت اور ہم دردی کا برتاؤ نہیں کیا ہوگا۔ انہیں بھی اپنا دشمن ہی سمجھتا رہا ہوگا۔

اس خطرناک شخص سے ان جانے میں واسطہ پڑ گیا تھا اور پہلی ملاقات میں میں نے اسے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اس سے دشمنی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اس سے دشمنی کا خیال کر کے مجھ جیسے شخص کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ میں اس شخص سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ پونم جس حالت میں میرے سامنے کھڑی تھی وہ مشکوک ہو رہا ہوگا۔ میں نے اس طرح کا لطف اٹھایا ہوگا۔ آس پاس ایسے گوشے تھے جہاں تنہائی میسر تھی۔ دو ایک جوڑے ہم آغوش دکھائی دیتے تھے۔

''اچھا.....!'' میں نے پونم سے کہا۔ ''اچھا اب آپ مجھے اجازت دیں۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔''

''مسٹر رتن کمار.....؟'' اس نے اپنے شوہر کی موجودگی کی پروانہ کرتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا

۔ ''کیا اب بھی آپ میری کوئی مدد اور چنتا نہ کریں۔ بیچ منجدھار میں چھوڑ دیں گے؟''

پونم نے مجھے عجیب الجھن اور تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ میرے ذہن میں کش مکش ہونے لگی۔

حسین عورت میری بہت بڑی کم زوری تھی۔ میرا شادی نہ کرنا اور تجرد کی زندگی اس لیے بھی تھا کہ بہتی گنگا تھی۔ اس میں ہر عمر، جسامت، قد و قامت اور رنگت کی مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ پیسوں کا جال ڈال کر جس عمر اور جیسی بھی مچھلی چاہے شکار کرلو۔

میں نے اپنی پولیس کی ملازمت جو خفیہ محکمے میں کی تھی اس دوران اور ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد جب سے سراغ رسانی کا پیشہ اپنایا تب سے اپنی زندگی میں نازک اندام حسیناؤں کی خاطر بڑے بڑے سنگین خطرات مول لیے تھے لیکن فرض اور قانون پر آنچ آنے نہیں دی۔ جب کہ وہ بڑی مہربان اور فیاض عورتیں تھیں۔ کسی بھی خواہش کو رد کرنے والیاں نہ تھیں۔

میں ایک عجیب سے دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شیاما جیسی حسینہ کی درخواست کیسے رد کردوں۔ جولاکھوں میں ایک اور بے مثال تھی۔ میرے صرف ایک اشارے وہ ان جانے راستے پر جانے کے لیے تیار ہوجاتی۔ اس کے لیے مجھ پر مہربان اور فیاض ہوتا کوئی معیوب بات نہ ہوتی۔ اس لیے بھی کہ اب وہ نوخیز کلی نہیں مہکتا پھول تھی۔

میرے موکل کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا تھا جس نے یہ مہم میرے سپرد کی تھی۔ اگر میں اس کا نام کسی پر بھی ظاہر کردوں تو نہ صرف جان جائیں گے بلکہ میری طرح چونک جائیں گے۔ میں نے اس نام کو راز میں رکھا ہوا تھا۔ کسی کو نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کسی کو بتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کیوں کہ وہ ایک سیاسی لیڈر بھی تھا۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔

میں پونم کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک بہت اہم کیس ہے۔ اگر اسے بتاتا تو وہ اچھل پڑتی۔ ویسے میں نے اسے یہ تاثر دیا ہوا تھا کہ میں ہیرے جواہرات کی چوری کے سلسلے میں آیا ہوا تھا تاکہ ان مسروقہ زیورات کا کھوج لگاؤں۔ جو اس شہر میں زیورات سمیت موجود ہے جو فلمی اداکاراؤں سے رابطہ کرکے انہیں فروخت کرنا چاہتا ہے۔ یہ زیورات بڑے نادر اور خاندانی ہیں۔ چوں کہ ان اداکاراؤں کے پاس کالی راتوں کی آمدنی ہوتی ہے وہ منہ مانگی قیمت دے سکتی ہیں۔ دوسری طرف میں اسے نا امید کرنا اور اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا جو شیشے کی طرح تھا اور ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا۔ ایسی حسینہ کا دل کیا توڑتا جو مہربان ہونے تیار تھی۔ اس کی فیاضی سے کون انکار کرسکتا تھا۔ میں نے اس رنگین تتلی کو دلاسا دیا۔

''آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔ میں پوری طرح اپنی کوشش کروں گا کہ اس بھیڑیے سے آپ کو نجات دلا دوں۔''

یہ سنتے ہی اس کا پژمردہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ اگر اس کا شوہر یہاں موجود نہ ہوتا اور تنہائی میں یہ بات کہتا تو وہ جذباتی ہوکر میرے گلے میں اپنی مرمریں، اور سڈول بانہوں کے خنجر حمائل کردیتی۔

''اس کے دفع ہوتے ہی آپ میرے ہوٹل چلیں تاکہ میں آپ کی خاطر مدارت کروں؟''

''میں آپ پر یہ بات واضح کردوں کہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ جاتا ہوا اس کا کوئی آدمی دیکھ کر اسے خبر کردے گا۔ پھر آپ جانتی ہوں گی کلائمکس کیا ہوگا؟''

''میں صرف اور صرف اتنا چاہتی ہوں کہ جیسے ہی اسے موقع ملے مجھے یہاں سے نکال دیں۔ میں اس کا معاوضہ آپ کو کول کتا پہنچ کردے سکوں گی۔ آپ اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر دے دیں۔''

''میں حسیناؤں سے معاوضہ ادھار نہیں کرتا بلکہ کسی اور شکل میں وصول کرتا ہوں۔'' میں نے اس کے جسم کا ناقدانہ انداز سے احاطہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا جس نے اسے اور حسین بنا دیا۔ اس کی آنکھوں سے خود سپردگی اور مستی جھانکنے لگی۔ اچھا ہوا کہ ہم کسی کمرے میں تنہا نہیں تھے۔ میں نے فوراً ہی محسوس کرلیا کہ وہ میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہے۔ اس میں قصور سراسر میرا اپنا تھا جو میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تم میری اس بات کا کوئی غلط مطلب نہیں لینا اس کی ادائیگی کی کئی صورتیں ہیں جس کی وضاحت میں بعد میں کروں گا۔ اس کا یہ وقت نہیں ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنے خوب صورت اور مرمریں ہاتھوں سے میرے سینے پر دو تھپڑ مارو اور مجھے پوری طاقت سے تالاب میں زور سے دھکا دے دو۔''

''وہ کس لیے؟'' اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ ''نہیں نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتی؟''

میں اس کی وجہ پونم کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عورت تھی۔ عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ اس میں کون سا جذبہ کارفرما تھا وہ سمجھ نہ سکی۔ بات صرف اتنی سی تھی اور میں گوپال کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں اس کی بیوی پر ڈورے ڈال رہا تھا تاکہ دل بہلاؤں جس پر اس نے نفرت اور غصے سے بے قابو ہوکر میرے تھپڑ مارے اور تالاب میں دھکا دے کر گرا دیا۔ یہ ڈراما کرنا تھا۔

''میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے ملنے آرہا ہے۔ پہلے میں اس سے بات کرلوں۔ پھر تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے سامنے یہ بات نہ کرنا۔ زبان بند رکھنا۔'' میں نے اسے تاکید کی۔

جگدیپ کا پورا نام جگدیپ راجہ تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا لیکن وہ اپنی جسامت کے باعث اتنا لمبا دکھائی نہ دیتا تھا جتنا تھا۔ کیوں کہ اس کا جسم کسی بھینسے کی مانند تھا۔ بے حد تنومند تھا۔ اس کے اعضاء بہت مضبوط اور پتھر کی طرح سخت تھے۔ وہ چل رہا تھا تو زمین دہل رہی تھی۔ وہ میرے مقابل آکر رک گیا۔

''تمہیں بہت دنوں کے بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ونود کھنہ!'' اس نے اپنا فولادی پنجہ میری طرف بڑھایا۔ ''دیکھو میرے ساتھ گوپال والی حرکت نہ کرنا کیوں کہ مجھے اپنے بازوؤں کی ضرورت ہے۔'' اس نے توقف کرکے بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا۔

''اگر اس گدھے کو علم ہوتا کہ تم جوڈو کراٹے میں خصوصی مہارت رکھتے ہو۔ بلیک بیلٹ اور بلیو بیلٹ بھی حاصل کرچکے ہو۔ جو یہ اعزاز بہت کم لوگ رکھتے ہیں تو تم سے نہیں الجھتا۔''

اس نے اپنی بات ختم کرکے پونم کی طرف دیکھا اور مہربانہ انداز سے ہیلو کہا۔

پونم نے بھی جواباً اس انداز سے ہیلو کہا۔

میں نے جگدیپ راجہ سے کہا۔ ''وہ خود ہی الجھا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجبوراً اس سے الجھنا پڑا تھا۔

جگدیپ راجہ پہلے تو بڑے زور سے ہنسا۔ پھر اس نے فضاء ہنسی کا بم چھوڑ دیا۔

''اچھا دوست! یہ تو بتاؤ کہ ممبئی کی یاترا کیسے؟ خیریت تو تھی نا؟''

''خیریت ہی خیریت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اکتا سا گیا تھا۔ اس لیے یہاں تفریح کی غرض سے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ یہاں تفریح نہیں بلکہ ہر قسم کی تفریحات موجود ہیں۔ جو ہندوستان کے کسی صوبے اور شہر میں میسر نہیں ہے۔''

''کیا تم ان تفریحات کا وضاحت سے بتا سکو گے تاکہ میری معلومات میں اضافہ ہوسکے۔'' وہ دوستانہ انداز سے مسکرا دیا۔

''ایک ہو تو بتاؤں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ایک تفریح جس کا نام شباب ہے دوسرا نام شراب۔

''گوپال کا کہنا ہے کہ وہ بھی یہاں تفریح کی غرض سے آیا ہوا ہے۔'' جگدیپ راجہ نے موضوع بدلا۔ ''شاید تمہیں علم ہو کہ گوپال کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ وہ زیر زمین کا مافیا ہے؟''

''معصوم اور شریف لوگوں کا خون بہا کر وہ لہو فروش ہے لیکن جگدیپ راجہ! تم یہاں کیسے؟ کیا کسی مہم پر آئے ہو؟ یہ ذاتی سا سوال ہے یار! کچھ خیال مت کرنا؟''

جگدیپ راجہ کے چہرے پر سنجیدگی ابھر آئی۔ اس نے میرے قریب ہو کر سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

''میں یہاں یہ سوال کسی سے بھی نہیں کرتا کہ وہ یہاں یعنی ممبئی کس لیے اور کیوں آیا ہے؟ یہاں سب ہی تفریح اور عیش کرنے کے لیے آتے ہیں کسی کی آمد کے بارے میں فکر کرنے اور سوچنے سے صحت پر اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح سے بیٹھے بٹھائے ٹینشن پالنا ہوا۔''

''مجھے تمہاری اس بات سے ایک سو ایک فیصد اتفاق ہے۔'' میں نے پھر اس کا شانہ تھپ تھپایا۔ ''تمہارے اس مخلصانہ مشورہ کا شکریہ۔''

''اچھا اب تم مجھے اجازت دو۔ آج شام چوپاٹی کلب میں سیکس پارٹی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تیس برس کی حسین اور پرکشش پتنی تلاش کر کے جعلی شناختی ممبر شپ کارڈ بنانا ہے۔ شاید ایک دوست کی بیوی تیار ہو جائے۔ اس کا شوہر آج کل دبئی میں ہے۔''

''یار! ایک بات تو بتاؤ کہ یہ سیکس پارٹی کیوں اور کس لیے ہوتی ہے؟ شوہر کی غیرت کیسے اور کیوں برداشت کر لیتی ہے۔''

''اس لیے کہ ان مردوں کا خیال ہے کہ غیر مرد کی بیوی جس فیاضی سے مہربان ہوتی ہے اپنی بیوی نہیں اس کی مثال ایسی ڈش کی ہے جسے کھا کھا کر جی بھر جاتا ہے اور وہ بے لذت ہو جاتی ہے۔ مرد کو ہمیشہ سے غیر کی بیوی ہی پیاری لگتی ہے۔''

''اچھا اب اجازت دو۔'' اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ''تمہیں دیکھا تو تم سے ملنے چلا آیا۔ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو بلا تکلف یاد کر لینا۔ مجھے تمہاری سیوا کر کے بڑی خوشی ہوگی۔''

وہ میرے گال کا بوسہ لے کر مخالف سمت بڑھ گیا تو میں نے پونم کو پریشان اور متفکر پایا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔

''تم کسی قسم کی چنتا نہ کرو۔ میں ہر قیمت پر اور ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ اس درندے نے تمہیں کیسے پھانس لیا۔'' پونم نے مختصر الفاظ میں اپنی رام کہانی سنائی۔

وہ دہلی میں کناٹ پیلس کے ایک کافی ہاؤس میں ویٹرس تھی۔

گوپال نے اس کے حسن و شباب اور جنسی کشش سے متاثر ہو کر اسے اپنے جال میں پھانس لیا۔ اس نے اپنے آپ کو ممبئی شہر کا بزنس مین ظاہر کیا۔ پھر اسے بڑے سبز باغ دکھا کر شادی کر لی۔ اس پر گوپال کی اصلیت اس وقت آشکار ہوئی جب وہ دہلی سے ممبئی آئی۔ جب اس نے گوپال کو لعن طعن کیا کہ اس نے جرائم پیشہ ہوتے ہوئے ایک شریف لڑکی کو کیوں پھنسایا۔ دہلی میں نوجوان نا بدکار و بدچلن لڑکیوں عورتوں کی کیا کمی تھی۔ اب وہ اس سے جی بھر کے کھیل چکا ہے لہٰذا اسے طلاق دے دے۔ ممبئی میں ایسی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو فلموں میں کام کرنے کے جنون اپنے گھروں سے بھاگ کر آتی ہیں۔ ان سے شادی کر لے۔ گوپال نے اس کی بری طرح درگت بنا دی۔ پھر اسے دھمکی دی گئی کہ فرار ہونے کی صورت میں اس پر تیزاب چھڑک کر ایسا بدصورت اور بھیانک بنا دیا جائے گا کہ وہ بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھی لیکن اسے تیزاب سے جھلس کر بدصورت بننا کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ بازار حسن کی جیسی طوائف بن جائے یا کسی سفید فام امریکی یورپی لڑکی کی طرح ماڈرن بن جائے۔ شرم و حیا اور عورت پن بالائے طاق رکھ دے۔ ایسے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ اس کے گروہ کے کسی ساتھی کی کسی بات سے وہ انکار نہیں کرے گی۔ دہلی

سے ممبئی آنے کے بعد سے اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے کہ کہیں یہ پنچھی اڑ جائے۔ جب بھی گوپال کی کوئی ضرورت ہوتی اور کوئی کام نکالنا ہوتا تو اسے متعلقہ آدمی کے پاس وقت گزاری کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ اسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی بنا رکھا ہے۔ جب کبھی بھی اسے کسی بڑے اعلیٰ افسر کے پاس شب بسری کے لیے بھیجا جاتا تھا سخت تاکید کی جاتی تھی اسے ہر طرح اور فیاض سے خوش کر کے آئے۔ سرد مہری سے پیش نہ آئے۔ ایک افسر نے گوپال شکایت کی کہ وہ سرد لاش کی طرح پیش آئی تھی۔ یہ سن کر گوپال نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اس کی اجتماعی درندگی کی جائے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ وہ ایک ہفتہ تک اسپتال میں زیر علاج رہی تھی۔ پونم کی یہ دردناک کہانی سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے جی میں آیا کہ میں اسے قتل کر دوں۔ لیکن بعض مصلحت کی بنا پر میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ اس نے گوپال کی سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا شاید میرے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے تحمل اور ضبط کی ضرورت بھی تھی۔

میں جس مجرم کی تلاش اور تعاقب میں یہاں آیا تھا۔ اسے اس شخص نے قتل کر دیا جس کی بہن کو بلیک میل کر کے اس شہر میں لایا تھا اور وقت گزاری کر رہا تھا۔ جب وہ دونوں غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے بھائی بہن نے مل کر قتل کر دیا اور فرار ہو کر اندرون ملک چلے گئے۔ اس کی لاش تین دن بعد دادو پل کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ نہ صرف اس کی کھوپڑی بلکہ اس کا جسم بھی چھلنی تھا۔ مقتول نہ صرف منشیات کا اسمگلر بلکہ بلیک میلر بھی تھا۔ وہ اپنے حلقے میں ہیرو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ فلمی دنیا کا ہیرو تو نہ تھا لیکن حقیقی دنیا میں کسی ہیرو سے کم نہ تھا۔ اپنی وجاہت اور خوب صورتی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف نوجوان لڑکیوں بلکہ شادی شدہ عورتوں کو بھی بلیک میل کرتا، نہ صرف ان کے قرب سے فائدہ اٹھاتا بلکہ مال بھی وصول کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس ان کی نہ صرف نامناسب تصویریں بلکہ بلیو پرنٹ بھی تھے۔ اس کی تصویر جب اخبارات میں شائع ہوئیں تو ان لڑکیوں عورتوں نے خوش اور سکھ کا سانس لیا ہوگا جو بلیک میل ہوتی آ رہی تھیں۔

اس کی اچانک اور غیر متوقع موت نے میری مہم مشکل بنا دی تھی اور مجھے ہونے والے نفع کو خسارے میں ڈال دیا تھا۔

''پونم.....!'' میں نے اس سے کہا۔ ''تمہارا شوہر مجھے اتنی دیر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مشتعل ہو رہا ہے اور اس کی صورت چقندر کی سی لگ رہی ہے۔ وہ میری موت کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔ اس لیے بھی کہ میں نے اس کی بے عزتی کی ہے اور مرمت بھی کر دی ہے۔ اس کی تلافی یوں ہو سکتی ہے کہ میرے دو تین ہاتھ جڑ دینا اور میرے بالوں کو پکڑ کے کھینچ کر تالاب کے کنارے لے جا کر تالاب میں دھکا دے دینا۔ وہ کمینہ بعد میں اس حرکت کی وجہ پوچھے تو کہہ دینا میں نے نہ صرف اس کی بے عزتی کی اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ چلو میرے کمرے میں تاکہ جشن عیش و نشاط منائیں۔''

''ٹھیک ہے اس ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''میں تمہارے کہنے پر یہ عمل کروں گی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ مجھے اپنے دل پر کتنا جبر کرنا ہوگا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کا رسیلا بدن شاخ گل کی طرح لچک گیا۔ جس نے اس کے حسن و شباب کی حشر سامانیاں واضح کر دی تھیں۔ وہ نیم عریاں حالت میں جو تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے گوپال کو دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی ہماری طرف متوجہ ہیں۔ گوپال کی آنکھیں بھٹی کی طرح دہک رہی تھیں۔

''شبھ کام میں دیر نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ اسے تذبذب سا ہو رہا تھا۔ ''میرے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر کے مجھے تالاب میں گرا دو۔'' اب ہم دونوں

ایک دوسرے کو بے تکلف رستوں کی طرح تم سے تخاطب کررہے تھے۔

''جانے کیوں میرا دل تم پر ہاتھ اٹھانے کو نہیں چاہ رہا ہے۔ میرے ہاتھ منوں بھاری ہورہے ہیں ایسا تو نفرت اور غصے کی حالت میں کیا جاتا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''کوئی اور تدبیر سوچو۔''

''مجھے عورتوں کو مشتعل اور جذباتی کرنے کے فن میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ میں تمہارے ساتھ جو حرکت کروں گا وہ صرف اس ذلیل اور کمینے کو دکھانے کے لیے ہوگی۔ تم کچھ خیال مت کرنا۔'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے کہنے پر تمہیں غصہ دلا رہا ہوں۔ پلیز! کچھ خیال مت کرنا۔''

پھر میں نے یونم سے جو کچھ کہا اسے دائرہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ پہلے وہ بھوچکی سی ہوگئی۔ پھر وہ شرم سے سرخ ہوگئی۔ عورت کو حیا کس قدر حسین بنا دیتی ہے۔ پھر اس نے میرے گال پر زوردار تھپڑ دے مارے۔ اس کی بازگشت پٹاخے کی طرح دور تک سنائی دی ہوگی۔ میری پشت تالاب کی طرف تھی۔ میں دانستہ لڑکھڑاتا ہوا تالاب میں جا گرا تھا۔ ایک سفید فام عورت پر گرتے گرتے بچا۔ اس عورت نے مجھے تھام لیا۔ وہ بغیر پیراکی کے لباس سے مچھلی کی طرح تیر رہی تھی۔ اس نے برا منانے کی بجائے پانی میں مجھے چوم لیا۔ پھر میں نے پانی کی سطح پر ابھرا۔ پھر تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ میں نے ان لمحات میں خود کو سنبھال لیا تھا۔ اگر میں نہانے کے لباس میں ملبوس ہوتا تو اس سفید فام عورت کا گرم جوشی سے جواب دیتا۔ وہ چالیس برس کی بھرپور عورت تھی۔ اس کی گرم جوشی سے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بڑی گرم جوش عورت ہے۔

جب میں پانی کی سطح پر ابھرا تھا تو میں نے فضا میں گوپال اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کے بے ہنگم قہقہوں کی گونج ہورہی تھی۔ یونم کی اداکاری بڑے غضب کی تھی۔ وہ ہنسی سے دہری ہورہی تھی اور گوپال کے بازوؤں میں اس کی مرمریں عریاں کمر تھرک رہی تھی۔ پھر اس نے گوپال کو خوش کرنے کے لیے ایک بوسہ بھی لیا۔ یہ ظاہر کررہی تھی کہ مجھے جیسے چڑا رہی ہو۔

میں نے اپنے ہوٹل کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز سے اچھی طرح سے دیکھ کر اطمینان کرلیا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں تھا۔ گوپال پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ یہ آستین بار تھا۔

ہوٹل اشوکا کو ممبئی کی بندرگاہ کا سب سے خوب صورت ہوٹل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ پرفضا سا مقام ہے۔ ہوٹل کی وسیع و عریض اور پرشکوہ عمارت کے علاوہ اس سے ملحقہ بہت ساری کوٹھیاں اور بنگلے ہیں جو جدید فن تعمیر کا اعلا نمونہ ہیں۔ میں نے جو کمرا لیا ہوا تھا وہ ایک سو تین نمبر تھا۔ میں نے نہانے کے لیے جاتے سمے اپنا کمرا مقفل کرنا بھول گیا تھا۔ اس لیے میرے کمرے کی چابی بورڈ پر لٹک رہی تھی۔ مجھے یاد آیا تو میں نے اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر جمع کرادی تھی۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے دانستہ نہیں لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہوگیا تھا۔

میں بڑی تیزی سے اپنے کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک ایک کرکے ساری کڑیاں ذہن میں چلی آرہی تھیں۔ میرے موکل نے مجھے جس مشن پر بھیجا تھا کامیابی کی صورت میں اس کا معاوضہ تصور سے کہیں زیادہ ملنے والا تھا۔ اس کے ہر قسم کے تمام اخراجات الگ تھے جسے خرچ کرنے کی چھوٹ دی گئی تھی۔ یعنی اگر میں کسی کال گرل، اداکارہ اور ماڈل گرل سے راتیں کالی کروں تو مجھے اس کی کھلی چھوٹ تھی۔

میں سوچتے سوچتے گہری نیند کی آغوش میں ڈوب گیا۔ بیدار ہوا تو خیال آیا کہ فکر اور سوچوں کی دنیا میں گم ہونے کے باعث میں لباس تبدیل نہیں کرسکا جو نہ صرف حیرت بلکہ عجیب سی بات

تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو سات بج چکے تھے۔ گہری نیند کے باعث میری ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ میں نے نہایا تو کسل مندی ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے لباس دوسرا پہنا اور بے مقصد ہی ہوٹل سے نکل آیا۔

میں جس کمرے میں مقیم تھا اسے راج کمار نے بک کرایا ہوا تھا لیکن اس کی موت کی خبر سننے کے بعد میں نے ڈسک کلرک کی مٹھی پر سو کا نوٹ رکھ کر جو رشوت تھی اسے حاصل کیا تھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا تھا اور اس نے بڑی پراسراریت محسوس کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہوٹل کے کسی کمرے میں کوئی طبعی یا حادثاتی موت کا شکار ہو جاتا ہے اسے اس لیے کوئی کرایہ پر نہیں لیتا ہے کہ مرنے والے کی روح بسیرا کر لیتی ہے۔ لہٰذا انتظامیہ یہ بات چھپا دیتی ہے۔ راج کمار نے یہ کمرا فرضی نام سے لیا ہوا تھا۔ جب کہ میں نے اصلی نام سے لیا ہوا تھا۔ میں توہم پرست نہ تھا اور نہ ہی بدروحوں اور چڑیلوں کے وجود کا قائل تھا۔

میرے موکل رتن کمار کو راج کمار ہی بلیک میل کر رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس کچھ ایسی اہم دستاویزات تھیں جن کی بدولت وہ ہر قسم کے مطالبات منوا اور گھٹ پتلی کی طرح نچا سکتا تھا۔ رنگا سوامی اس کی کسی بھی بات کو رد اور حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ لیکن راج کمار نے ایسا نہیں کیا۔ چوں کہ کانگریس کی حکومت تھی اور رتن کمار کا بڑا گہرا اثر و رسوخ تھا۔ اس لیے راج کمار اپنی ایک داشتہ کو حکومت میں ایک اہم عہدہ دلوانا چاہتا تھا جو رتن کمار کو کسی بھی قیمت پر قبول نہ تھا کہ ایک فاحشہ اعلیٰ عہدیدار بن جائے۔ رتن کمار نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ جب کہ وہ فاحشہ رتن کمار کو ہر طرح سے خوش کرنے تیار تھی۔ اس سے کہیں حسین اور جسمانی پرکشش لڑکیوں عورتوں کی رتن کمار کو کیا کمی تھی۔ ان کے لیے بھی جن کی جیب بھاری ہوتی ہے۔

ان دستاویزات کے اندر فوٹو اسٹیٹ، ٹیپ ریکارڈ کیسٹ اور کچھ تصویریں بھی ایسی تھیں جو رتن کمار کی نجی زندگی کے گھناؤنے کردار کا ثبوت تھا۔ اس نے نہ صرف بارہ برس کے لڑکوں ان لڑکیوں کے ساتھ وقت گزاری کی ہوئی تھی جو پندرہ سولہ برس کی دوشیزائیں تھیں۔ اس کے ایسی شادی شدہ جواں سال عورتیں جو سیاسی لیڈروں کی بہوئیں، بیویاں اور بیٹیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ غیر ملکی اسلحہ مافیا کی مجلس عاملہ کا اہم اور سرگرم رکن بھی تھا۔

ان دستاویزات میں سب سے اہم اور خطرناک دستاویزات وہ تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا امریکی حکومت کسی مخصوص ملک کے خلاف ایٹمی جنگ شروع کرنے والی تھی۔ یہ سب کچھ ایک عام قسم کے لیدر بکس میں محفوظ تھا جو راج کمار کے پاس تھا۔

اب میرے پاس صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان دستاویزات کو حاصل کر کے فوراً ہی ضائع کر دوں تاکہ وہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اس صورت میں امریکی حکومت کو پوری دنیا میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یوں بھی ٹرمپ کے برسر اقتدار آنے کے بعد ساری دنیا میں ذلیل و رسوائی ہو رہی تھی۔ کیوں کہ امریکی حکومت بے حس اور بے ضمیر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ جن لڑکیوں عورتوں کی تصویریں وہ با آسانی بلیک میل ہو سکتی تھیں۔ کیوں کہ وہ ان تصویروں میں باہم پیوست تھیں۔ میں نیچے آیا تو گوپال اور اس کا کوئی ساتھی نظر نہ آیا۔ البتہ بہت ساری رنگین تتلیاں اور نوخیز کلیاں شرمناک بے حجابی کی حالت میں دعوت گناہ دیتی ہوئیں شکار تلاش کر رہی تھیں۔ پھر میں دو ایک لڑکیوں کی دعوت گناہ کو مسترد کرتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔ جانے کیوں دل کسی لڑکی کو چومنے کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے ناشتا ڈائننگ ہال میں کیا۔ استقبالیہ کے کلرک سے دریافت کیا کہ کسی نے مجھ سے رابطہ تو نہیں کیا؟ ڈیسک کلرک ایک جوان سال مرہٹہ عورت تھی۔ مرہٹہ قوم سیاہ فام سے مشابہہ ہوتے ہیں۔ ان کے جسم

گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ روغنی سیاہ رنگت کے ہوتے ہیں۔ ان کی صحت قابل رشک ہوتی ہے۔ ان کے چہروں اور جسموں میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے۔ اس قوم کی عورتیں لڑکیاں گھروں اور دفاتر میں نوکرانیوں کا کام کرتی ہیں۔ مجھے نروپا یاد آ گئی جس نے رات بستر رفیق سفر رہی تھی اور دماغ پر وہ چھائی ہوئی تھی۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر میں لابی میں آ کر بیٹھ گیا اور تین گھنٹے انتظار کی جو کیفیت میں کاٹے وہ بڑے اذیت ناک تھے۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ البتہ میں نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جو چہرے مہرے اور وضع قطع سے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ ان میں شیوانات تھا۔ شیوا جی پر میں نے کسی زمانے میں ایک بہت بڑی افتاد سے نجات دلائی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اسے میرا احسان مانتا اور بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ کسی بھی مشکل میں وہ میرے کام آ سکتا تھا۔ وہ احسان فراموش نہ تھا۔

میں بے زار ہو کر اور اکتا کے اپنے کمرے میں چلا آیا تا کہ یک سوئی سے کچھ سکوں میں بستر پر دراز ہو گیا تو نروپا جو اپنے جسم کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک چھوڑ گئی وہ ابھی تک چادر میں بسی ہوئی تھی۔ دماغ معطر کر رہی تھی۔ میں خیالات کے بھنور میں چکرانے لگا۔ میں گوں ناگوں سوچوں میں غرق تھا کہ دروازہ بڑی آہستگی اور غیر محسوس انداز سے کھلا۔ دوسرے لمحے میری نظروں کے سامنے ہوٹل کا ایک ویٹر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نگاہ پڑتے ہی میرے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ وہ لمبے چوڑے قد کا تھا۔ اس کے بدصورت چہرے پر بہت ساری خراشیں پڑی ہوئی تھیں جس نے اس کے بدصورت چہرے کو اور بھیانک بنا دیا۔ دیکھنے میں کسی گینڈے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے چپٹے سر نے اسے اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ ایسے بدصورت شخص کو ہوٹل کی انتظامیہ نے ویٹر کیوں رکھا؟ آخر ایسی کیا مجبوری پیش آ گئی تھی۔ یہاں شرفا ٹھہرتے تھے۔ مجھے

پچھتاوا سا ہوا کہ میں نے اپنا اسپیشل کوٹ ریوالور جیب میں کیوں نہیں رکھا۔

اس نے مجھ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور چند لمحوں تک اوپر سے نیچے تک گھورتا رہا اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم راج کمار ہو.....؟''

''کیا؟ راج کمار؟'' میں نے انجان بن کر پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں تمہیں تیار ہونے کے لیے پندرہ منٹ دے رہا ہوں۔'' اس نے قدرے سرد مہری سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ چہرے پر ناگواری لیے اس طرح کمرے میں گھس کر آیا تھا اس طرح باہر نکل گیا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ اس قسم کے اچانک اور غیر متوقع حالات کا مجھے سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم مجھے اپنی حفاظت کے لیے اب اپنا ریوالور ہر وقت جیب میں رکھنے کی ضرورت تھی۔ یہ ایک طرح سے میرا محافظ تھا جو ہر مشکل میں میری زندگی کی سلامتی کا ضامن تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر میری جان بچائی تھی۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں آہٹ سنائی دی تو میں بری طرح چونک پڑا اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ فوری خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ کہیں غسل خانے میں کوئی مجھے قتل کرنے کے ارادے سے چھپا ہوا تو نہیں تھا۔ شاید گوپال کا کوئی بدمعاش ساتھی۔ ایک تو اس لیے کہ میں نے بونم کو آغوش میں لے کر چوما اور دست درازی کی اور دوسری بات یہ کہ گوپال نے اپنی بے عزتی اور ذلالت کا بدلہ لینے کے لیے بھیجا ہو۔ مجھے قتل کرنے کے لیے یہ وقت اور کمرا نہایت موزوں تھا۔

وہ مجھے موت کی نیند سلا کر باآسانی فرار ہوجائے۔ وہ قانون کی گرفت میں اس لیے نہیں آسکتا تھا کہ کوئی ثبوت اور عینی گواہ نہیں ہوتا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔

میں سوچ ہی رہا تھا اور ایک عجیب سی کش مکش میں مبتلا تھا کہ چند ساعتوں کے بعد اپنے کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں ایک آہٹ سی سنائی دی تو میں چونک گیا اور میرے سارے بدن کا لہو رگوں میں خشک ہونے لگا۔ میری نگاہیں فوراً غسل خانے کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازہ آہستہ آہستہ، بے آواز اور غیر محسوس انداز سے کھل رہا تھا۔ ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں کسی نیزے کی طرح اترنے لگی۔ جب دروازہ قدرے کھلا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کی اوٹ سے پہلے ایک مرمریں، سڈول اور ایسا خوب صورت ہاتھ نمودار ہوا جس نے میرے دل پر قیامت ڈھادی۔ میں نے شاید ہی کبھی کسی لڑکی عورت کا ایسا دل کش ہاتھ اور مخروطی لمبی لمبی انگلیاں دیکھی ہوں۔ بڑی موہنی اور سندر تھیں۔ دل میں آیا کہ کسی نہ کسی اپنی ساری طاقت جمع کرکے اٹھوں اور اس ہاتھ کی سڈول، گداز اور نازک سی کلائی کو تھام لوں اور ان انگلیوں کو بے تحاشا چوم لوں۔ اگر اس ہاتھ میں کوئی خنجر ہوا تو اس کی پروا نہ کروں۔ گو اس ہاتھ میں خنجر نہ تھا لیکن وہ خنجر سے کہیں تیز دھار اور خطرناک اور مہلک بھی تھا جو میرے سینے کو شق کرتا ہوا دل میں اترنے لگا تھا۔ میں گھائل ہوتا جارہا تھا۔

چند ساعتوں کے بعد دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کے عقب سے جیسے ایک چاند نمودار ہوا۔ میں بھوچکا سا ہوگیا۔ اس کے جسم پر ایک ریشمی گاؤن تھا جس کشمیری کڑھائی کا بڑا عمدہ اور نفیس دستی کام کیا ہوا تھا۔ اس میں سے اس کا شاداب بدن اور اس کی رعنائیاں چھلک رہی تھیں۔

''ہیلو راج کمار جی!'' اس نے بصد و ناز کمرے میں قدم رکھنے کے بعد شوخی سے کہا۔'' تمہیں میرے آنے کی اطلاع تو مل گئی ہوگی۔''

میں نے دانستہ تردید نہیں کی۔ میں چوں کہ راج کمار کے کمرے میں ٹھہرا تھا۔ استقبالیہ کے کی بورڈ پر سے ابھی تک اس کا نام ہٹایا نہیں گیا تھا۔ نہ جانے کیوں، یہ عجیب سی پراسرار اور حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے ڈیسک کلرک کو توجہ نہیں دلائی تھی۔ اس لیے ہر شخص مجھے راج کمار ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ کمرا بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی رشوت دے کر حاصل کیا ہوا تھا۔

میں نے دانستہ تردید نہیں کی اور نہ ہی خیال آیا تھا کہ کیوں کہ اس کے حسن کے سحر نے مجھے مبہوت کردیا تھا میں چوں کہ راج کمار کے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اس لیے ہر شخص مجھے کسی دیس کے راج کمار کی طرح ہی سمجھ رہا تھا۔ ایسا میں خود بھی چاہتا تھا۔ اس لیے کہ یہ کمرا سودمند ثابت ہورہا تھا۔ لیکن چودھویں کا چاند پورے جوبن پر تھا اپنی آب و تاب سے طلوع ہوجائے گا یہ خواب و خیال میں نہ تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ غنودگی کی کیفیت میں کوئی رنگین سندر سپنا دیکھ رہا ہوں لیکن سپنوں میں کسی چیز اور عورت کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک کہاں محسوس ہوتی ہے؟

میں نے اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سیاہ بکس دیکھا جسے اس نے اس طرح مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور سنبھالا ہوا تھا جیسے وہ ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا پھر اس نے بڑی بے پروائی سے اس بکس کو بستر پر رکھا۔ یہ بکس اس قسم کا تھا جس میں لڑکیاں عورتیں اپنا میک اپ کی لوازمات یا ایک آدھ جوڑا سفر کے دوران رکھتی ہیں۔

اگلے لمحے اس نے اپنا ریشمی گون نکال کر اس بکس پر ڈال کر اسے ڈھک دیا تو ایسا لگا جیسے دودھیا چاندنی بادلوں کی آغوش سے نکل کر بے حجاب ہوگئی ہو۔ اب وہ شب خوابی کے سیاہ حسین لباس میں ملبوس تھی جس سے اس کی بے حجابی فطری حالت میں ڈھل گئی تھی۔ وہ شعلہ مجسم نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بلیک ٹائیگر باس نے تمہارا دل بہلانے اور ہر طرح کی سیوا کرنے کا حکم دے کر بھیجا ہے۔''

اس کے چہرے پر حیا سرخی بن کر بکھر گئی۔

''بلیک ٹائیگر باس؟'' میں نے چونک کر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے دانستہ دریافت نہیں کیا کہ یہ کون بلا ہے۔

''جی ہاں بلیک ٹائیگر باس نے.....'' اس نے اپنی رسیلی آواز میں جواب دیا۔ ''اس لیے کہ وہ جب تک آپ کو ملاقات کا وقت نہ دیں ہر وقت ہر طرح سے تمہارا خیال رکھتی رہوں۔ دل بہلاتی رہوں۔ کوئی تعرض نہ کروں اور نہ ہی کسی شکایت کا موقع دوں۔ تمہیں بور ہونے اور تنہائی کا احساس نہ ہونے دوں۔''

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں دل میں آیا کہ اسے چوم لوں۔ وہ کسی پھل کی طرح تھی جو جھولی میں ٹپکنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی ادھر میرے جذبات میں ایک طوفان آیا ہوا تھا لیکن میں نے اسے قابو میں کیا۔ اسے بہکنے نہیں دیا کہ ایسی بھی کیا جلدی؟ لیکن میں کسی جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو مہربان کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔

میں نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا اور سوچا کہ یہ محترم کون مہربان ہیں۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں آیا کہ کون مہربان ہیں۔ زیرزمین دنیا کی کوئی شخصیت اس نام کی نہیں تھی۔ البتہ میں نے جوانگریزی کی جاسوسی کہانیاں اور ناول پڑھے اس میں پروفیسر اور ڈاکٹر کے بارے میں خوف ناک اور سنسنی خیز واقعات پڑھے تھے۔ یہاں کی زیرزمین دنیا میں بھی بڑے عجیب عجیب نام تھے لیکن ایسا کوئی نام نہیں تھا۔ ''جب ایسا کوئی نام ذہن میں نہیں آیا تو میں نے مغز پاشی بند کردی۔ کیوں کہ لاحاصل تھا اور پھر مجھے آم کھانے سے مطلب تھا۔ پیڑ گن کر کرتا بھی کیا۔ پھر میں اس کے ہیجان خیز سراپا میں ڈوب گیا۔

''آخر تم مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو جو اخلاقاً اور رسمی طور پر مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہے ہو؟'' وہ تیزی سے شکایتی لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے کب تک کھڑا رکھنا چاہتے ہو؟''

''آئی ایم سوری.....'' میں نے چونک کر اس کے طلسم سے نکل کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''اس میں میرا نہیں تمہارا قصور ہے؟''

''میرا قصور؟'' اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ''کیا میں کسی چڑیل کی طرح بدصورت اور خوفناک ہوں؟ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک بہکتا جانے کتنی دور نکل چکا ہوتا۔ مجھے نچوڑ کے رکھ چکا ہوتا کسی گیلے کپڑے کی طرح۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ میرا کیا قصور ہے، میں نے کیا کیا؟'' وہ ایک ہی سانس میں بول گئی تو اس کے سینے میں سانسوں کا زیروبم کا طوفان سا آ گیا جو مجھے متزلزل کرنے لگا۔

''میری بلبل! تمہارا ایک تصور ہو تو بتاؤں؟'' میں نے اس کے قریب ہو کر اس کی شاخ گل جبیں کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرلیا۔ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''تمہارا پہلا قصور یہ ہے کہ تمہارا حسن و شباب اور گداز بدن جس میں ایسا جادو ہے کہ اس نے مجھے مبہوت کردیا۔ تم بلا کی جنسی کشش کی مالک ہو۔ دوسرا قصور جو کسی سنگین جرم سے کم نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کردیا تھا۔ میں خود فراموشی کی کیفیت میں تمہیں دیکھتا کسی کتاب کی طرح پڑھتا رہ گیا۔ ایک ایک لفظ، سطر اور جملہ اف بھگوان! تم نے کیا حسن پایا ہے۔ اگر تم مقابلہ حسن میں حصہ لو تو ملکہ عالمی حسن بن سکتی ہو۔ مس ورلڈ اچھا چلو اب بیٹھو۔ میں اس بدتہذیبی پر دل و جان سے معذرت خواہ ہوں۔ میں ابھی اس کی تلافی کیے دیتا ہوں۔''

میری زبان سے اپنی اس قدر تعریف سن کر پھولی نہیں سمائی۔ میں نے اسے آغوش میں لے لیا تاکہ جذباتی انداز سے اس کے چہرے پر جو زبانی انداز سے دیر تک جھکا رہوں لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ اس اپنی مرمریں، عریاں بانہیں جو خنجروں کی طرح بے نیام تھیں میرے گلے میں حمائل کرکے میرے چہرے پر خاصی دیر تک جو زبانی اور خود پردگی سے جھکی رہی۔ بڑی گرم جوشی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مٹھاس سے میرے ہونٹ بندھ گئے۔

جب وہ الگ ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس سے

دریافت کروں کہ اس بلیک ٹائیگر باس کا جغرافیہ کیا ہے۔ کیا وہ کوئی ہندوستانی مافیا ہے۔ جس نے اپنا نام رکھا ہے۔ اس کا حسب نسب کیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے اس سوال پر وہ مشکوک ہو جائے گی۔ پھر میرے کمرے سے نکل جائے گی۔ میں اس بت خانہ کو کسی پنچھی کی طرح اڑ کے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ غیر محسوس انداز سے مجھے اس سے معلومات حاصل کرنی تھیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا میرے شاعرانہ انداز سے تعریف کرنے اور ہم بستری سے بہت کچھ معلوم کر سکتا ہوں اور نشاط انگیز لمحات میں ہر بات اگل دے گی۔ اس لیے مجھے احتیاط اور پیار و محبت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

''سچ سچ بتاؤ میری جان بلبل! کیا واقعی بلیک ٹائیگر باس نے تمہیں میری ہر طرح کی سیوا کرنے بھیجا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے اپنا خوش نما سر ہلا دیا۔ ''اس نے جو کچھ بھی کہا تھا۔ حکم دیا تھا۔ میں نے اس کا ایک ایک لفظ سنا دیا۔

''اسے مجھ سے کتنی محبت اور خیال ہے میرا اس کا جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے کیوں میری بلبل!'' میں نے اسے نظروں کی گرفت میں لے کر اس کے بالوں کو سہلایا۔

وہ زیر لب مسکرا دی۔ میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ لیکن اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

''آ میری بلبل! مستقبل کی مس ورلڈ.....! تم کیا پینا پسند کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''مجھ پر تمہاری سیوا کرنا لازمی بھی تو ہے؟''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' وہ شگفتگی سے بولی۔ ''میں تمہاری داسی ہوں تم جو بھی پلاؤ گے۔''

''اگر زہر پیش کروں؟'' میں نے شوخی سے کہا۔ ''انکار تو نہیں کرو گی؟''

''وہ بھی پی لوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''سوچ لو..... زہر زہر ہوتا ہے؟''

''میں اس لیے پی لوں گی کہ وہ زہر تمہارے ہاتھوں امرت پانی بن جائے گا۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر اسے چوم لیا۔

میرے جی میں تو آیا کہ اسے گود میں اٹھا کے بستر پر لے جاؤں۔ لیکن کسی خیال کے زیر اثر میں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ میں جواباً اسے بھی چوم کر بڑھا۔ میں اپنے ساتھ شمپین کی دو بوتلیں لایا ہوا تھا جو رتن کمار نے دی تھیں۔ میں نے انہیں فریج میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے شمپین کی بوتل اور گلاس میز پر رکھ دیے۔ شمپین دیکھ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ میں نے دو پیگ تیار کیے۔ ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔

جس وقت اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیا میری نگاہ اس کی انگلی پر پڑی جس میں ایک بڑی سی انگوٹھی تھی جس پر انگریزی لفظ N کھدا ہوا تھا۔ میں نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت اور بیش قیمت بھی لگی تھی میں نے پوچھا۔

''سویٹ بے بی.....! کیا تم مجھے اپنا نام بتانا پسند کرو گی؟'' میں اس کی شربتی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''میرا نام نیلما سا گر ہے۔'' اس نے مجھے دعوت دیتی نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں نے اپنا نام نیلو رکھ لیا۔ یہ پاکستانی اداکارہ کا نام ہے جو مجھے وہ اور اس کا نام پسند آیا۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ میں نیلو کی جڑواں بہن لگتی ہوں۔ تم بھی مجھے نیلو ہی سمجھو۔''

''لیکن مجھے نام نیلما ہی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس طرح جس طرح تم لگ رہی ہو۔'' میں نے اس کے گال پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں نیلما ہی کہوں گا۔''

جس وقت وہ اپنا نام بتا رہی تھی۔ میں نے اپنا گلاس خالی کر دیا تھا۔ پھر اسے دوبارہ بھر کے حلق سے اتار لیا۔ اس نے دو تین گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔

''کیا تم بستر کی تعریف کے علاوہ کسی اور تفریح کا محور ہو۔ موسیقی تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ تم خود کسی ساز سے کم نہیں ہو۔ جس کے تار کی طرح تمہارا انگ انگ کسا ہوا ہے۔ بس چھیڑنے کی

دیر ہے کہ تم مدہوشکن سر کی طرح بجنے لگو گی۔''

اس نے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔

میرے لیے تو وہ خود موسیقی، نغمہ اور آہنگ تھی۔

کمرے کی خاموش فضا میں موسیقی کی مدھر دھنیں بکھرنے لگیں۔ اس نے جھومتے اور تھرکتے ہوئے میری طرف مستی بھری نظروں سے دیکھا۔ ''رقص کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''بہت ہی سندر خیال ہے۔'' میں نے اپنا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس کے ہیجان خیز سراپا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا تھرکتا، لچکتا اور لہراتا بدن بجلیاں گرا رہا تھا۔

''میری بلبل! بلیک ٹائیگر باس بڑا دوراندیش اور باذوق ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ آج کی مانگ اور ذوق کیا ہے۔ اس نے تمہارا جو انتخاب کیا ہے اس کی داد نہ دینا بدذوقی ہوگی اور تمہاری بھی کہ تم جانتی ہو کہ مرد کو کس طرح خاموش کیا جاتا ہے۔ میری بلبل! اب میں کبھی بھی تمہیں بھول نہ سکوں گا۔''

ہم سپنوں کی سی انجانی رنگین وادیوں میں بھٹکتے ہوئے محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ نشاط انگیز لمحات میں اس نے مجھے بتایا کہ جب اس نے تیرہ برس کی عمر میں نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ ماں باپ کی محبت اور شفقت کے سائے سے محروم تھی۔ جب وہ سات برس کی تھی اس کے ماں باپ جس کشتی میں سفر کر رہے تھے سیلاب کی نذر ہوگئی۔ تب اس کے باپ کے بچپن کے ایک دوست نے اسے لے پالک بیٹی بنالیا۔ اس کی شادی کو بیس برس ہوگئے تھے وہ باپ نہ بن سکا تھا۔ اسے اولاد کی تمنا اور ضرورت تھی۔ جب وہ گیارہ برس کی ہوئی تو اس کی منہ بولی ماں سنسار سے اٹھ گئی۔ جب اس نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی اٹھان اور جسمانی نشوونما سترہ اٹھارہ برس کی پرشباب لڑکی سے کم نہیں تھی۔ جو دیکھتا اسے دیکھتا رہ جاتا۔ جب میں سیانی ہوگئی تو پڑوس میں جو سرسوتی بھابھی رہتی تھی وہ مجھے سمجھاتی تھی تیرا حسن اور جوانی بہت خطرناک ہے۔ تیرا پرشباب بدن کشش کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔ تو ہشیار اور چوکنا رہنا۔ کسی کی محبت بھری باتوں کے فریب میں آ کر یہ خزانہ لٹانا نہیں۔ میں تیرے باپ سے کہوں گی کہ وہ تیری شادی جتنا جلد ہوسکے کردے۔ لیکن اس کی نوبت نہ آپائی۔ ایک رات طوفان آیا ہوا تھا۔ بلیاں کڑک رہی تھیں موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ بجلی چلی گئی تھی۔ کمرے میں ایسا گھپ اندھیرا ہوگیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ حبس ہوگیا تھا۔ اس دم بجلی کڑکی تو میرا تن بے لباس تھا۔ میں سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے آہٹ سنائی دی جو قدموں کی تھی۔ اگلے لمحے میں کسی مرد کے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اس کے منہ سے زعفرانی تمباکو کے پانی کی خوشبو آ رہی تھی۔ پتا جی! اک دم سے میرے منہ سے نکلا۔ میں نیلما ہوں۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ پتا جی نے جواب دیا۔ میں اس وقت تیرا پتا جی نہیں ہوں۔ نہ ہی تو میری بیٹی ہے۔ نہ تو میرا خون ہے۔ میں صرف مرد ہوں اور تو عورت ہے۔ میں نے تجھے پالا پوسا۔ سات برس تک تیرے جوان ہونے کا انتظار کیا۔ میں نے اس کی گرفت میں کسمساتے ہوئے کہا۔ پتا جی! بھگوان کے لیے ایسا پاپ تو نہ کریں لیکن وہ شیطان بنا ہوا تھا۔ اس نے نہ تو میری کوئی التجا سنی۔ میرا گڑگڑانا بھی بیکار گیا۔ وہ مرد تھا۔ چھ فٹ کا توانا جسم کا مالک تھا۔ اس نے مجھے کلی سے پھول بن دیا۔ دوشیزہ سے عورت بنا دیا۔ ایک برس تک وہ مجھ سے منہ کالا کرتا رہا۔ پھر ایک روز جب وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ الماری میں دس ہزار کی رقم تھی۔ پھر میں نے ایک دستی بیگ میں رقم اور دو تین جوڑے رکھے۔ وہاں سے بس میں آکر سوار ہوگئی دہلی جانے کے لیے۔ دہلی میں میری ایک پھوپھی رہتی تھی۔ اس کا اتا پتا میرے پاس تھا۔ سفر میں میرے برابر ایک چالیس برس کی عمر کی ایک عورت ہم سفر تھی۔ وہ بھی دہلی جا رہی تھی۔ اس نے میری باتوں سے تاڑ لیا تھا کہ میں گھر سے فرار ہوکر جا رہی ہوں۔ وہ ایک شکاری عورت تھی جو مجھ جیسے لڑکیوں کی تلاش میں رہتی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ہاں لے آئی۔ اس کی میں ڈیفنس کوٹھی تھی۔ وہ چھ سات لڑکیاں......''

نیلما نے اتنی اپنی کہانی سنائی تھی کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ وہ خبیث بغیر دستک اور اطلاع دیے دندناتا کمرے میں گھس آیا۔ میرے جی میں آیا کہ ریوالور نکال کر اس کی کھوپڑی میں سوراخ کردوں۔ اس کمینے کو کہانی کے کلائمکس موڑ پر بھی آنا ہی تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ''حیرت ہے راج کمار! تم نے میرے کہنے کے باوجود دوسرا لباس نہیں پہنا۔ اس کے ساتھ بے لباس ہو۔''

''میں نے لباس نہیں پہنا اور جس حالت میں ہوں اسی حالت میں رہوں گا۔'' میں نے بگڑتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ''کباب میں ہڈی مت بنو یہاں سے دفع ہوجاؤ سنا تم نے۔ میں تمہاری بہن کے ساتھ نہیں اپنی محبوبہ کے ساتھ ہوں۔''

''یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟'' اس کا خوف ناک چہرہ اور مکروہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔ وہ ترش روئی سے بولا راج کمار! میں تمہیں صرف پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ مہلت نہیں دوں گا۔ اگر تم نے کپڑے نہیں پہنے تو میں تمہیں اسی حالت میں لے جاؤں گا۔ بلیک ٹائیگر باس کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی کہ تم اس ہیت میں اس سے ملنے آئے ہو یہ بات اچھی طرح سوچ لو۔''

ویٹر کی یہ بات سن کر نیلما بڑے زور سے چونکی اور سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''تمہیں فوراً تیار ہوکر اس کے ساتھ چل دینا چاہیے۔ بلیک ٹائیگر باس کو اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بہت مصروف رہتا ہے۔ اس کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔''

میں غصے کی حالت میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ اس نے پھر دوسرے لمحے پھر سے مجھے پیار بھرے اور جذباتی انداز سے سمجھا کر میرے غصے کو رد کیا۔ پھر میں نے بستر کے سرہانے سے اس کا گون اٹھایا تھا کہ اسے پہننے میں مدد کرسکوں۔ جانے کیسے بستر سے پھسل کے بکس فرش پر گر گیا۔ نیلما سے رہا نہیں گیا۔ اسے جیسے سخت غصہ آ گیا۔ اس نے بذیانی لہجے میں چیختے ہوئے کہا۔

''تم کیسے بے پروا ہو راج کمار! تم نے میرے بکس کا ستیاناس کردیا۔''

''آئی ایم ساری میری جان بلبل!'' میں نے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ''پلیز تم ناراض نہ ہونا۔''

نیلما کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔ اسے یکا یک نہ جانے کیا ہوگیا میرے ہاتھ سے گون جھپٹ لیا۔ اور فرش سے بکس اٹھایا اور اس حالت میں تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس ویٹر کے آنے سے پہلے وہ کتنی خوشی اور سرشاری جیسے اس نے کوئی انمول دولت پالی ہو۔ لیکن اس کا ایک دم سے اچانک اور غیر متوقع بدلا ہوا رویہ میرے لیے معمہ بن گیا تھا۔

ویٹر کمرے سے باہر نہیں گیا تھا۔ اس نے مجھے جیسے وارننگ دی۔

''راج کمار صرف تیس سیکنڈ باقی ہیں۔ کیا میں تمہیں گود میں اٹھا کر لے جاؤں؟''

میں نے فوراً ہی کپڑے پہنے بغیر جرابوں کے جوتے اس نے پہننے بھی نہیں دیے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے سے باہر لے آیا اور پھر زور سے لات مار کر دروازہ بند کردیا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

''راج کمار! مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس قدر احمق ہو۔ گدھے ہو۔ تم نے ایک عورت کے ساتھ ہم بستر ہوکر اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔''

ویٹر مجھے کشاں کشاں اس سمت لے جارہا تھا جہاں ہوٹل شنگریلا آف پیرس تھا۔ یہ ہوٹل بھی ساحل سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہ ہوٹل بھی مہنگے ترین اور پرتعیش ہوٹلوں میں سے ایک ہے لیکن اس میں جو آسائشیں عیاشی کی ہیں وہ شاید کسی ہوٹل میں ہو۔

میری نظر سمندر میں کھڑے ہوئے ایک غیر ملکی بحری مسافر جہاز پر پڑی جس پر گولڈن اسٹار لکھا ہوا تھا۔ وہ نام دور ہی سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا مجھے یہ نام مانوس سا لگا۔

وہ مجھے ہوٹل کے اندر لے کر گھس گیا۔ پھر وہ ایک ہال کے دروازے کے سامنے جا کر رک گیا۔ پھر اس نے مخصوص انداز سے دروازے پر وقفہ وقفہ سے تین مرتبہ دستک دی۔ چند لمحے انتظار کرنا پڑا۔ پھر دروازہ کھلا۔ ہمارے اندر گھستے ہی دروازے کو بند کر کے اندر سے مقفل کر دیا گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا اور اس کے اندر بہت سارے لوگ موجود جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کانفرنس ہو رہی ہو۔

مگر جب میری نگاہ اس شخص کی جانب اٹھی تھی جو کرسی صدارت پر بڑے پروقار انداز اور رعب سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر مجھے اس شخص کو پہچاننے میں لمحے بھر کی دیر بھی نہیں لگی۔ یہ شخص بلیک ٹائیگر باس تھا۔ لوگ اسے غائبانہ طور پر کالا ناگ کے نام سے موسوم کرتے تھے لیکن کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے اسے کوئی کالا ناگ کہہ کر مخاطب کر سکے۔ اس لیے اسے کالا ناگ کہا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر مردہ دل میں غم و غصے اور نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ کیوں کہ یہ جرائم کی دنیا کا سب سے ظالم، سفاک، درندہ صفت اور اونچا بدمعاش تھا۔ سرغنہ تھا۔ کون سا ایسا ملک تھا جہاں وہ اوپر سے نیچے تک اپنا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے ہر کسی کو دولت، شراب اور شباب سے خرید رکھا تھا اور وہ ان کی ہر قسم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ادا کارائیں تک اس کے کسی حکم کی عدولی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ جس ادا کارہ کو جس کے پاس جا کر خوش کرنے کا حکم دے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح سے ہیروؤں کو جس بوڑھی عورت کو بھی جا کر وقت گزاری کا کہا جائے تو اس کی کیا مجال کہ وہ انکار کر دے۔ اس نے ان کی وڈیوز بنائی ہوئی تھیں جن سے وہ بلیک میل کرتا تھا۔ ایک ادا کارہ مونا نام کی تھی۔ اس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ یہ بات غلط ہے کہ جو لڑکی فلمی دنیا میں آتی ہے اسے اپنا سب کچھ سونپ دینا پڑتا ہے جس کی مثال میں ہوں۔ مجھے کسی ہدایت کار، فلم ساز اور کیمرہ مین کو اپنے بدن آلودہ کرنے نہیں دیا اور نہ ہی مجھ پر کوئی آنچ آئی۔ میں آج اب بھی پوتر ہوں۔ دوشیزہ ہوں۔ کلی ہوں۔ لڑکی ہوں عورت نہیں میں اپنی صلاحیت سے چوٹی کی ادا کارہ بنی ہوں۔ کالا ناگ نے میرے خلاف جو بکواس کی ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔

دوسرے دن بازار میں اس ادا کارہ مونا کی ایک وڈیو آ گئی جس میں وہ کئی مردوں اور فلمی دنیا کی ممتاز شخصیتوں کی ساتھ ہم بستر تھی۔ اس نے دوسرے دن خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ وہ جس ادا کارہ کو جس کے پاس بھی بھیجے انکار نہیں کر سکتی۔ انکار کا انجام موت ہوتا تھا۔ کالا ناگ کا نام سن کر بڑے بڑے خطرناک مافیا بھی کانپ اٹھتے تھے۔

میں اسے خواب کی سی حالت میں دیکھے جا رہا تھا۔ میری نظروں کو یقین نہیں آیا کہ یہ شخص میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں اس کے یہاں آنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ امریکہ کبھی کا روپوش ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں یہ افواہ بازگشت کر رہی تھی کہ وہ اٹلی کے کسی دور دراز مقام پر روپوش ہے۔

مجھے اپنی نظروں کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا نظر آیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھ پر ہنس رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میرے اپنے بیٹے رتن کمار بکرے کی ماں نے اب تک بڑی خیر منالی۔ پھر میری نظروں نے ہال میں موجود لوگوں کا سرسری سا جائزہ لیا۔ ایک گوشے میں ایک میز پر پانچ عورتیں بیٹھی ہوئیں سرگوشیاں اور کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ستر برس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہوں گی۔ اس عمر میں بھی وہ جتنی خوب صورت لگ رہی تھیں اس سے کہیں زیادہ جنسی طور پر پرکشش لیکن ان کا لباس جو نہ ہونے کے برابر تھا وہ دعوت عام دے رہا تھا۔

دوسری طرف دنیا کے جرائم پیشہ اور پیشہ ور قاتلوں کے تنظیموں کے سرغنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ان کی تصویریں تھیں۔ میں نے البم بنائی ہوئی تھی۔ انٹرنیٹ سے دنیا کسی سوتی کپڑے کی طرح سکڑ سمٹ گئی تھی۔ ان سب کا ممبئی کے اس شہر میں یکجا ہونا تعجب خیز اور ناقابل یقین لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ساری دنیا میں انتشار، افراتفری اور دہشت گردی سے فائدہ

اٹھانا چاہتے ہوں۔ بہرحال یہ جگہ کسی بھی سراغ رساں کے لیے پھانسی کا گھاٹ تھی۔ میں کسی بھی بہانے اور کسی بھی طرح یہاں سے کھسک نہیں سکتا تھا۔ میری مثال اس وقت ایک ایسی مکھی کی طرح تھی جو مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی ہے۔

میرے ہال میں داخل ہوتے ہی ایک دم سنسناہٹ اور سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ انہیں جیسے یہاں میری موجودگی کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ جتنے حیران تھے اس سے کہیں زیادہ ششدر بھی تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سبھی مجھے اچھی طرح جانتے بھی ہوں۔ پہچانتے تھے اور شاید اپنی اولاد کو اتنا نہیں کچھ بدمعاش ایک جھٹکے سے اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے انہیں زبردست برقی جھٹکا لگا ہو۔ دو ایک بدمعاش میری طرف جارحانہ انداز سے بڑھنے لگے۔

کالا ناگ یہ سب کچھ بڑے سکون واطمینان سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں سے اس کے دلی تاثرات ظاہر نہ تھا۔ چند لمحوں تک شور شرابا ہوتا رہا۔ کالا ناگ نے جس فضا میں اپنا ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو شور اک دم سے دم توڑ گیا۔ پورا ہال ایک بیکراں سکوت کی آغوش میں ڈوب گیا۔

''تم راج کمار تو نہیں ہو؟'' کالا ناگ کی گمبھیر آواز گہرے سکوت کو توڑ گئی۔

''راج کمار؟'' میں نے انجان بن کر اپنی پلکیں حیرت سے جھپکائیں۔ ''یہ راج کمار کون ہے اور آپ کون ہیں؟'' میری زبان سے بلاارادہ نکل گیا۔

''سنو...... مسٹر!'' کالا ناگ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم راج کمار کے کمرے میں کیا کر رہے تھے۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔''

مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ میں موت کے دہانے پر کھڑا ہوا ہوں۔ میں اپنی بدحواسی اور ذرا سی حماقت سے موت کے منہ میں جا سکتا تھا۔ میری لاش کا بھی پتا نہیں چلتا۔ تاہم میں نے بڑے مضبوط لہجے میں بے خوفی سے کہا۔

''رج کمار کی ' میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں جس کا نام میں پہلی بار سن رہا ہوں سچ پوچھیے کہ اس کی شکل میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہے۔''

میں بیرونی دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میں اپنی بات ختم کر کے بے خوفی اور اطمینان سے اس کی طرف بڑھا تو حاضرین میں سے کئی بدمعاشوں کے ہاتھوں کو سرعت سے جیبوں میں گھستے دیکھا۔ انہوں نے ریوالور نکال لیے تھے۔ دو ایک نے میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو بلیک ٹائیگر باس نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''آپ کو یہ بات پوچھنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں ہے کہ تم کون سے اور کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

بلیک ٹائیگر باس کو میری بات سخت ناگوار لگی تھی۔ شاید آج تک کس نے اس سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کی تھی اور نہ ہی جرات کر سکتا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا لیکن اس نے خود پر قابو پا کر میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا۔ میں نے فوراً ہی گھوم کر دیکھا تو میری نگاہ جگ دیپ راجہ پر پڑی۔ میں نے اس سے کہا۔

''راجہ یار! یہ صاحب کون ہیں؟ مجھ سے کس لیے بے سروپا سوالات کیے جارہے ہیں؟ یہ کیا تماشا ہے دوست؟''

راجہ کو میں نے پہلی بار بے حد سنجیدہ پایا تھا۔ اسے حالات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھ سے بات کرنے کی بجائے باس سے کہا۔

''میں آپ کو اس شخص کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس کا نام رتن کمار ہے۔ یہ بنگلور شہر کا پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔ میں آج صبح ہی اس سے مل چکا ہوں۔ یہ یہاں اکثر تفریح کی غرض سے آتا رہتا ہے اور اس بار بھی آیا ہوا ہے۔'' پھر اس نے توقف کر کے

مجھ سے کہا۔ ''دیکھو باس تم سے جو کچھ بھی دریافت کریں اس کا صحیح جواب دینا تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔''

راجہ جیسے مجرم نے میری حمایت میں بے خوفی سے جو کچھ کہا اس نے میرا دل جیت لیا تھا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس بات نے میرے دل میں جگہ بنالی تھی۔

''مجھے سچ کہنے میں کوئی عار اور خوف نہیں ہے۔'

'میں نے راجہ کو جواب دے کر اس کے باس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کیا تسلی کرنا چاہتے ہیں؟''

بلیک ٹائیگر باس مجھے گہری خاموشی اور تنقیدی دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے جو اپنا سوال دہراتے نہیں ہیں۔ میں نے خود ہی اسے بتانا شروع کیا۔

''مجھ سے جس کمرے کے بارے میں دریافت کیا جا رہا ہے وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر اس میں کیا اسرار اور راز ہے۔ میں کل ہی اس شہر میں آیا ہوں۔ میں نے اس خیال سے کمرا بک نہیں کیا تھا کہ بہت سارے ہوٹل ہیں کسی نہ کسی ہوٹل میں کمرا تو مل ہی جائے گا۔ لیکن اتفاق سے دو تین ہوٹلوں میں کمرا خالی نہیں تھا۔ میں رات کے وقت کہاں بھٹکتا پھرتا۔ البتہ اس ہوٹل میں کسی شخص نے کمرا بک کیا ہوا تھا کچھ دنوں سے، وہ کسی وجہ سے نہیں آیا تو ڈیسک کلرک نے سو روپے رشوت لے کر وہ کمرا مجھے دے دیا تھا اس شرط پر کہ اگر وہ آجاتا ہے تو میں دوسرا کمرا لے لوں گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

میری یہ بات سنتے ہی ایک بدمعاش فوراً ہی ہال سے نکل گیا۔ باس نے شاید غیر محسوس انداز سے اسے اشارہ کیا ہوگا۔ وہ میری بات کی تصدیق کرنے چلا گیا تھا۔ باس کو میری بات پر جیسے یقین آ گیا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں مجھ سے کہا۔

''لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم ویٹر کے ہمراہ بحیثیت راج کمار کے یہاں کیوں آئے ہو؟''

میں نے جواب دینے سے پہلے ویٹر کی طرف دیکھا جو ایک طرف مودب انداز سے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے باس سے کہا۔

''آپ کے اس سوال کا جواب تو ویٹر ہی دے سکتا ہے۔''

''ایک تو یہ شخص میرے کمرے میں میری اجازت کے بغیر میرے کمرے میں دندناتا ہوا گھس آیا۔ میں اس وقت عام سے لباس میں تھا۔ وہ مجھے لباس تبدیل کرنے کا حکم دیتا ہوا چلا گیا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے کہاں اور کیوں لے جانا چاہتا ہے۔ پھر یہ شخص جبر و زبردستی سے یہاں لے آیا۔ میرے بوٹوں پر ایک نظر ڈالیں۔ اس نے مجھے تسمے باندھنے کی مہلت تک نہیں دی۔''

میں نے اپنا بیان موقوف کر کے گہرا سانس لیا۔ پھر حاظرین کو اپنے بوٹ دکھائے۔ پھر میں نے پوچھا۔

''میں اب یہ جان نہیں سکا ہوں کہ مجھ پر اب تک اس طرح جرح کیوں کی جا رہی ہے جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔''

میرا بیان غور اور توجہ سے سننے کے بعد باس نے ویٹر کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''مسٹر ونود کھنہ! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط فہمی کی وجہ سے تکلیف پہنچی ہے۔ بات یہ ہے کہ الیکشن کے لیے ایک کنونشن بلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پارٹی سیکرٹ کو دوسروں سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کنونشن کی ہر کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے۔''

''میں نے جو آداب محفل کا خیال نہیں رکھا اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

میں نے اسے یہ تاثر دیا کہ میں نے اس بات کو سچ تسلیم کر لیا ہے۔

جو بدمعاش ہال سے باہر گیا تھا وہ اسی وقت اندر داخل ہوا اور اس نے اپنے باس کو مخصوص انداز سے اشارہ کیا جس کے جواب میں باس نے سر ہلا دیا۔ جیسے اس بدمعاش نے میرے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ پھر باس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''آپ کو جس تکلیف اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ سے

ایک گزارش ہے کہ جب تک ہمارا کنونشن ختم نہیں ہوجاتا آپ اپنے کمرے سے نہیں نکلیں گے۔''

''یوں بھی میرے پاس کہیں جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مصروفیت ہے۔ میں سونے اور آرام کرنے کے موڈ میں ہوں۔ اس لیے ذہن یک سوئی اور ٹینشن سے نجات پانے کے لیے اتنی دور سے آیا ہوں۔ یہاں جو تفریحات ہیں میرے شہر میں کہاں ہیں ایک حسین اور پرجوش ہم بستر کی رفاقت ملی تھی۔ ہم دونوں نے تین چار دن کمرے میں بند رہنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ آپ کے آدمی نے رنگ میں بھنگ میں ڈالا تو وہ روٹھ کے چلی گئی۔ خیر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔''

میں اس کی بات جواب دے کر اور اسے مطمئن کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جس وقت میں دروازے کے پاس پہنچا میری نگاہیں گوپال سے چار ہوئیں۔ وہ مجھے غضب ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا جاتا۔

یہ بات میرے علم میں آئی ہوئی تھی کہ ممبئی ایک کنونشن منعقد ہو رہا ہے۔ میں تو یہ سمجھا ہوا تھا کہ شاید کوئی تعلیمی، علمی اور سائنسی کنونشن ہوگا لیکن آج اب یہ عقدہ کھلا تھا کہ یہ کنونشن سیاسی نوعیت اور سماجی لیڈروں کا نہیں ہے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے جرائم پیشہ سرغنوں کا ہے۔ میں اس کانفرنس کی غرض وغایت کی تہ میں پہنچ چکا تھا۔

اور پھر چوں کہ مجھے اپنے شبہات کی تصدیق کرنا بھی لازمی تھا۔ میں ان جرائم پیشہ کے ہجوم میں شیوا ناتھ کو بھی دیکھا تھا۔ مجھے اس سے بڑی مدد مل سکتی تھی۔ جرائم پیشہ لوگوں میں میں نے ایک خوبی ہمیشہ نوٹ کی تھی کہ کوئی بھی جرائم پیشہ اپنے محسن کو بھلاتا نہیں تھا اور احسان کا بدلا اتارنے کے لیے بے چین رہتا تھا اسے کسی صلہ کی تمنا بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے فوراً ہی شیوا جی کی تلاش شروع کردی۔ کوئی دس بارہ منٹ کے بعد میں نے اسے لابی میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر بعد اس خبیث ویٹر کو بھی دیکھا جسے میری نگرانی پر مامور کیا ہوا تھا یا وہ خود میری نگرانی کر رہا تھا جیسے نیلما اس کی بہن ہو۔ میں پھر کہیں اس کی بہن کو کمرے میں لے جا کر رنگ رلیاں نہ منانے لے جاؤں۔ میں اس کے سامنے شیوا ناتھ سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ وہ کمینہ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے اور میرے درمیان کوئی چالیس پچاس قدموں کا فاصلہ ہوگا۔

پھر میں نے مکرجی کے سامنے سے گزرتے ہوئے غیر محسوس انداز سے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

''دوست! تم مجھے بار میں ملو۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔''

جب میں ہوٹل کے عقبی دروازے پر رک کر پلٹا تو میری اس ذلیل ویٹر سے ٹکر گئی۔ میں نے زہر خند ہو کر کہا۔

''تم مجھے پہلے ہی بہت پریشان اور ہراساں کر چکے ہو اور رنگ میں بھنگ ڈال چکے ہو۔ میری نگرانی اور تعاقب کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں تمہاری بہن یا بیوی کو لے کر ہوٹل جا نہیں رہا ہوں۔''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس میں غیرت کی رمق بھی ہوتی تو وہ مجھ سے الجھ جاتا۔ صرف خشمگیں نظروں سے گھور کر رہ گیا تھا۔ شاید اسے اس بات پر غصہ تھا کہ میں نے ایک نہایت حسین اور پرشباب جوان لڑکی سے مفت میں رنگ رلیاں منائیں راج کمار بن کر، یہ تو میرے نصیب تھے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ میرے تعاقب میں نہیں ہے۔ شیوا ناتھ بار میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے مجھے ویٹر کے بارے میں بتایا کہ اس کا نام شیام ہے۔ وہ ایک پیشہ ور غنڈہ ہے اور انتہائی بے غیرت، بے شرم اور بے ضمیر بھی ہے۔ اس کی ایک بہن نوجوان جس کی عمر سولہ اور اٹھارہ برس کی ہوگی وہ اس سے دھندا کراتا ہے۔ اس کی بیوی رنجنا وہ بھی بیس برس کی ہوگی۔ وہ بھی بہت حسین ہے۔ بہن بیوی ذریعہ آمدنی ہے۔ اس نے ان دونوں کی عریاں سادہ تصویروں کی البم بنا رکھی ہے۔

وہ ہوٹل کے مسافروں کو الم دکھا کر پھانستا اور سودا کرتا ہے۔ اس کی غنڈہ گردی کی وجہ سے بیوی بھی شکار پھانس کر لاتی رہتی ہے۔ اور پھر شیوا ناتھ نے وہ تمام معلومات میں بہم پہنچائیں جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ وہ بھی برسوں میں خود سے کیا کسی اور سے بھی معلوم نہیں کرسکتا تھا۔

جب اس نے مجھے موجودہ کانفرنس کے بارے میں بتایا تو میں اسٹول سے گرتے گرتے بچا۔

جب میں نے اس کی اہمیت پر غور کیا تو حیران رہ گیا۔ متحدہ امریکہ میں جو لیبر یونین تھی صرف مزدور لیڈروں کے لیے ایک انعام کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ یہ جرائم پیشہ سرغنوں اور اشتراکیوں کے لیے بھی اتنی ہی مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ جو لوگ یونینوں کو کنٹرول کرتے ہیں وہ پوری امریکی قوم کو بھی زیر اثر رکھتے ہیں۔ خود کامریڈ لینن نے مزدور اور یونینوں میں اثر و رسوخ کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس کا قول تھا کہ مزدور کو قابو میں کرلو تو پورے ملک کا با آسانی قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ بلیک ٹائیگر باس جس کا نام بڑا عجیب و غریب تھا وہ اسی بات پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ لینن بڑی گہری اور پتے کی بات کہی تھی۔

ماضی میں جرائم پیشہ دنیا کے سرغنوں نے کئی بار ان یونینوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرلیا تھا۔ کئی ایک یونین ان کے اشارے پر چل رہی تھی۔ کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ اگر ان سرغنوں کے ہاتھ یہ دستاویز لگ جاتی ہے وہ نہ صرف اربوں ڈالر کے مالک بن جاتے ہیں بلکہ ملکی سیاست پر بھی حاوی ہوجاتے ہیں۔ اب مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ کیس کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی کسی ایسے کیس سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میں شیوا ناتھ سے ملاقات کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا۔

رتن کمار کی بلیک میل کی فائل کی میرے نزدیک بہت زیادہ اہمیت اختیار کرچکی تھی۔ اس فائل کے حصول کے لیے میں نے آگ خون کے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی جوان کے دام میں پوری ہندوستانی قوم کے لیے ایک المیہ اور ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ مجھے اپنی قوم اور ملک کی بقا عزیز تھی۔ یہ جو جرائم پیشہ تھے ان میں اکثریت مغربی ممالک کی تھی۔ امریکی ایجنٹ بھی تھے۔ امریکہ اور یورپ کو ایشیا کے کسی ملک کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ انہیں غلام اور محتاج بنانا چاہتے تھے۔ میں کچھ دیر تک کیس کی مختلف کڑیوں پر غور کرتا رہا۔ میں پہلی فرصت میں یونم سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے شوہر نے مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ نہیں؟ اگر اس کا ایسا ارادہ ہو تو مجھے کسی اور محفوظ جگہ قیام کرنا ہوگا تاکہ میں آزادی سے اپنی ہر قسم کی سرگرمیاں جاری رکھ سکوں۔ مجھے دو تین ٹیلی فون کالیں کرنی تھیں مجھے دو کالیں کرنی تھیں۔ ایک محکمہ خفیہ پولیس اور دوسری کال اپنے موکل رتن کمار کو۔ اس شبھ کام میں تاخیر پل بھر کی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جب میں کمرے سے نکلا میں نے ویٹر رندھیر کو بڑے پراسرار انداز سے کھڑے دیکھا۔ اس نے مجھے جیسے دیکھا اس کمرے کا دروازہ بجاتا ہوا رک گیا۔ میں نے اس کی پتلون کی جیب میں سے پاکٹ سائز کی البم کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی بہن اور بیوی کی نامناسب تصویروں کی البم دکھا کر ان کا سودا کرنے آیا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر خباثت اور آنکھوں میں کینہ بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایسا تاثر دیا جیسے وہ غیر محسوس انداز سے میری نگرانی کررہا ہو۔ میں کوئی اس کے باس کا غلام نہیں تھا جو اس کے حکم کی تعمیل کرتا اور ہوٹل کے اس کمرے میں قید ہوکر رہ جاتا۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اگر کسی نے میری نگرانی کی، تعاقب کیا اور مزاحمت کرکے گن پوائنٹ پر مجھے واپس کمرے میں جانے پر مجبور کیا تو اس کی ایسی درگت بنادوں گا کہ وہ آئینے میں اپنی شکل تک پہچان نہیں سکے گا۔ اسے اٹھا کر کمرے کی کھڑکی سے باہر پھینکنے میں تامل نہیں کروں گا۔ جب میں نیچے جاکر کی بورڈ سے اپنے کمرے کی چابی نکال کر اوپر آیا تاکہ دیکھوں کہ کوئی چیز بھول تو نہیں گیا۔ جب میں لفٹ سے نکل کر اپنے کمرے کی

طرف جارہا تھا وہ اس دم ایک کمرے سے نکلا تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے بڑی تیزی سے آنے لگا تو میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ جب میں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا تو اس نے اپنی ٹانگ اڑا دی۔ جیسے ہی وہ اندر آیا میں نے اس کی کمر پر ایک لات پوری قوت سے رسید کر دی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کھڑکی سے ٹکرا کے بے ہوش ہو گیا۔ اس کی جیب سے موبائل فون، البم اور بٹوا نکال کر فرش پر بکھر گیا۔ بٹوے میں دو ہزار دو سو کی رقم تھی۔ میں نے دو ہزار کی رقم جرمانہ سمجھ کر اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ موبائل فون دیوار پر مار کے اسے ناکارہ کر دیا۔ پھر میں نے البم اٹھا کے ورق گردانی کی۔ یہ اطمینان سے دیکھنے کی چیز تھی۔ وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا۔ پھر میں باہر سے دروازہ مقفل کر کے نکل آیا۔ میں اپنے کرائے کی بیوک لے کر شہر کے غیر معروف علاقے میں واقع ہوٹل روبی پہنچا۔ یہ علاقہ سیوری کے علاقے میں کوئی چار پانچ میل کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ ایک تیسرے درجے کا ہوٹل تھا۔ یہاں وہ سیاح اور لوگ آتے تھے جنہیں شراب کے ساتھ وقت گزاری کرنا ہوتی تھی۔ بعض اوقات نوجوان لڑکوں ان کی محبوبائیں اور ہم جماعت لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جہاں وہ کمرا کرائے پر لے کر گھنٹوں بند رہتے تھے۔ کمرا بہت ہی سستا مل جاتا جس کا کرایہ بارہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے ہوٹل اور بورڈنگ ممبئی میں عام تھے۔ ان ہوٹلوں پر چھاپہ اس لیے نہیں پڑتا تھا کہ پولیس افسران کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ بعض اوقات افسران کا دل کرتا تو وہ ان ہوٹلوں پر چھاپہ مارتے تھے۔ اس لیے کہ ان کمروں میں اسکول کالج کی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ انہیں قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے افسران کو ہر طرح سے خوش کرنا پڑتا تھا۔ اس علاقے میں چھاپے کا ڈر اور خوف اس لیے بھی نہیں تھا کہ ہوٹل کے مالکان انہیں ہر ہفتہ باقاعدگی سے بھتہ پہنچاتے تھے۔ ان کتوں کو ہڈی سے غرض ہوتی تھی۔

اس لیے ان جوڑوں کو تحفظ اس لیے بھی تھا کہ اس کا مالک ریٹائر پولیس انسپکٹر تھا۔ اس نے اپنی بیس بائیس برسوں کی ملازمت میں دونوں ہاتھوں سے خوب کمایا تھا اور اب بھی کما رہا تھا۔ افسران بالا کو ہر عمر کا مال شراب اور دوشیزاؤں کو پیش کر کے خوش رکھتا تھا اور خود بھی ہاتھ صاف کرتے رہتا تھا۔ اس کے ہوٹل کے کمرے بھی بڑے صاف ستھرے کشادہ تھے۔ قریب ہی مچھیروں کی بستی بھی تھی۔ مچھلی کی بو محسوس ہوتی تھی۔ کمرے دروازوں اور کھڑکیوں پر خوشبو کا اسپرے صبح شام ہوتا تھا۔ دروازے کھڑکیاں بند ہونے سے جو محسوس نہیں ہوتی تھی۔

استقبالیہ کلرک نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ کیوں کہ میں اکیلا آیا تھا۔ نہ تو میرے ساتھ اسکول کالج اور یونی ورسٹی کی کوئی نہ کسی کی بہن، بیوی اور بھابھی اور دفاتر میں کام کرنے والی کوئی لڑکی عورت اور پھر باہر جو مچھیرن لڑکی یا شکاری عورتیں نیم عریانی کی حالت میں شکاری کی تلاش میں تھیں۔ ان میں سے دو ایک نے مجھے آنکھ بھی ماری تھی کہ کیا وہ ساتھی بن سکتی ہے وہ تو اس ہوٹل میں کوئی مرد بغیر عورت کے نہیں آتا تھا۔ اس نے ایک میلا کچیلا اور موٹا بھدا سا رجسٹر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے اس میں اپنا نام جوش کمار لکھا اور کمرے کی زنگ آلود چابی لے کر کمرے میں پہنچا۔ پھر میں نے کمرے کی کھڑکیاں تازہ ہوا کے لیے کھول دیں۔ وہاں ایک اسپرے کا ڈبا رکھا تھا۔ پھر اسپرے کر کے نیچے آیا۔ کمرے کی چابی کلرک کے پاس جمع کرا دی۔ کونے میں ایک میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اس کی طرف لپکا جیسے میری کوئی بچھڑی ہوئی محبوبہ دل نواز ہو اور میں اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے جانے کب سے بے تاب تھا۔

میں نے دہلی کے لیے ایک کال بک کرائی۔ میرے پاس چوں کہ پولیس کے خفیہ محکمہ کا نمبر نہیں تھا۔ میں اپنی ایک نوٹ بک اپنے دفتر بھول آیا تھا۔ اس لیے کال بک کرانی پڑی تھی۔ گو یہ دور موبائل فون اور ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم کا تھا لیکن میں کسی وجہ سے موبائل

فون استعمال نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کیا تھا اور یہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس میں میری کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔ دنیا اس موبائل فون کے باعث سکڑ سمٹ کر نقطہ بن چکی تھی۔ کون ایسا تھا جو موبائل فون استعمال کرتا تھا۔ اوپر سے نیچے تک چار، میز، مزدور، نوکرانیاں اور بھکاری تک اپنے ہاتھوں میں تھامے اور بلاؤز میں رکھے نظر آتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ سے جس کا نام درگا داس سے میری جو گفتگو ہوئی وہ بہت اہم نوعیت کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس جدید ترین سہولت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا ہوں جیسے موبائل فون کیا جاتا ہے۔ میرا ایک انتہائی جدید ترین قیمتی موبائل کھو جانے کے بعد عقل ٹھکانے آئی تھی۔ اس لیے میں بڑا محتاط ہو گیا تھا۔ کان پکڑ لیے تھے کہ اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔''

پھر میں نے رتن کمار سے رابطہ کیا اور اسے بھی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جب میں نے اسے بلیک ٹائیگر باس کے متعلق بتایا تو اس پر ایسا سکتہ طاری ہو گیا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ وہ چند ساعتوں تک بول نہ سکا۔ پھر میں نے اسے ان اشیاء کے بارے میں لکھوایا جس کی مجھے فوری ضرورت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اشیاء مہیا کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ اس کا مسئلہ ہے۔ مجھے کل ہر قیمت پر ان کا ملنا اشد ضروری ہے اور جو رقم باقی ہے وہ کل ہی میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا تاکہ میں سکون، اطمینان اور یک سوئی سے کام کر سکوں۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں تم میری رقم ہڑپ نہ کر جاؤ۔

''تمہیں بقایا معاوضہ مشن کی کامیابی کی صورت میں ادا کر دیا جائے گا۔'' رتن کمار نے تکرار کی۔ ''کیا تمہیں میری بات پر وشواس نہیں؟''

''وشواس کی بات نہیں بات دراصل یہ ہے کہ مشن اس قدر خوف ناک اور خطرناک ہے کہ اس میں مجھے بچ جانے کی ایک فیصد امید بھی نہیں رہی ہے۔ لیکن میں تمہارا کام انجام دیے بغیر نہیں مروں گا۔ چوں کہ کامیابی کے بعد میری موت یقینی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی جائے تاکہ میرے لواحقین کو مل جائے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کل میں تمہارے اکاؤنٹ میں ساری بقایا جمع کرا دوں گا۔'' وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ''تم جاسوس کم کاروباری زیادہ ہو۔''

''سراغ رسانی کا پیشہ بھی ایک کاروبار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''دوسرے کسی کاروبار میں جانے کو خطرہ لاحق نہیں رہتا ہے۔ کیا تم کاروباری نہیں ہو؟ سیاست بھی تو ایک کاروبار ہے۔ اس میں لوگ مالی فوائد کے لیے قدم رکھتے ہیں۔ پہلے تم کیا تھے؟ سیاست میں گھسنے کے بعد کیا سے کیا بن گئے ہو؟ خیر چھوڑو ان لاحاصل باتوں کو، میں ہوٹل روبی میں درگاہ اس کے نام سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ جب تمہارا ہرکارہ اشیاء لے کر مجھ تک پہنچے گا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ ہم میں سے ایک کہے گا الیکشن کون جیتا؟ دوسرا جواب شامل پارٹی اس طرح ہم متعارف ہوں گے۔ میرے اور تمہارے ہرکارے کے سوا کسی اور کو ان باتوں کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

میں نے اپنی گاڑی ہوٹل بلیو شائن ہوٹل سے خاصے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑی کی۔ پونم اس ہوٹل کے کاٹیج نمبر ستائیس میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں پیدل ہی اس کے کاٹیج پر جا پہنچا۔ گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے خیال آیا کہ گوپال ہونے کی صورت میں اپنی آمد کی کیا غرض و غایت بیان کروں؟ کیا اس سے کہوں کہ تمہاری نوجوان اور پرشباب گداز بدن بیوی کی کشش کھینچ لائی ہے۔ لہٰذا گولی مارنے کی زحمت مت کرنا۔ میں نے ہوٹل سے پونم کو اس لیے فون نہیں کیا تھا کہ فون ٹیپ ہونے کا خدشہ تھا۔ اس سے موبائل نمبر بھی نہیں لیا ہوا تھا اور نہ ہی اسے دینا یاد رہا تھا۔ موبائل تو ہر کسی کے پاس ہوتا تھا۔ بھگی اور بھگنیں بھی رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں ایسے شہری بھی تھے جو

موبائل نہیں رکھتے تھے۔ کسی نہ کسی وجہ یا پھر اس کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ گو کہ یہ بڑی سہولت کی چیز بھی تھی۔

ایک۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا ٹیج کی بناوٹ ایسی تھی کہ میں سامنے والی کھڑکی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کی عقبی کھڑکی کی تلاش میں اس کے عقب تک آ گیا۔ وہاں ایک بنگلہ بنا ہوا تھا۔ اس کے عین اوپر ایک کھڑکی تھی۔ اس کاٹیج کے عقب میں اور نیچے کوئی دو سو گز دور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کھڑکی تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ میں نے جنگلے پر کھڑے ہو کر کھڑکی کی طرف جست لگائی اور اس کے چھجے کو فوراً ہی تھام لیا۔ اگر اس کا کنارا ہاتھ میں نہ آتا تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

یہ کمرا نشست گاہ تھی۔ پونم کوئی ناول پڑھنے میں ایسی منہمک اور غرق تھی کہ دنیا سے اور مافیہا سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ میں اس کھڑکی سے بے آواز کمرے میں اتر گیا۔ فرش پر چوں کہ قالین تھا اس لیے آہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ جب اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو تب بھی اسے میری موجودگی محسوس نہ ہوئی۔ یہ انگریزی کا ناول تھا جس کا نام تھا۔ آئی لو یو۔ اس نے پڑھتے پڑھتے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے اس نے مجھے جیسے ہی دیکھا تو اک دم سے غش کھا گئی اور کتاب فرش پر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آ گئی تھی لیکن کتاب سمیت وہ بھی فرش پر آ رہی تھی۔ اس سے سب سے پہلے گوپال کے بارے میں پوچھا کہ کہیں وہ کسی کمرے یا واش روم میں تو نہیں ہے؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اٹھ کے بیٹھ گئی اور بتانے لگی کہ اس وقت تو موجود نہیں ہے لیکن کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ لیکن ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ نہیں کہے گا بلکہ لوٹ جائے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ اس نے مجھے کھلی چھوٹ اور ہر بات کی اجازت دی میں تم سے تعلقات استوار کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ تم کس سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہو؟ کیوں کہ بلیک ٹائیگر باس تم میں دل چسپی لینے لگا ہے اور تمہارے بارے میں تذبذب میں پڑ گیا ہے۔ وہ آج تک کسی سے بھی اس قدر پریشان نہیں ہوا جتنا تم سے ہوا ہے۔ گوپال نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں اب ماتا ہری کا کردار ادا کرنا ہے۔''

اس وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی تو میں اس کا الوداعی بوسہ لے کر گوپال کمرے میں آ گیا اور روشنی بھی ہو گئی۔ گوپال نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''یہ تم نے کمرے میں اندھیرا کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''اس لیے کہ اندھیرے میں سمندر کا نظارہ کروں۔'' پونم نے جواب دیا۔ ''چاروں طرف دودھیا چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ یہ نظارہ اور سماں کیسا پیارا پیارا لگ رہا ہے۔''

''کیا تمہارے لیے کھانے کے لیے کچھ لاؤں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں یہاں سے چاندنی میں سمندر کا نظارہ کیسا لگ رہا ہے؟'' گوپال کھڑکی کے پاس آ کر مشکوک انداز باہر جھانک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتفاق سے برابر کے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں ایک سفید فام سیاح عورت گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ ساٹھ ستر برس کی ہو گی۔ میں بے آواز کمرے میں اتر گیا۔ لیکن میں میز سے ٹکرا گیا جس پر وہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے وہ عورت اک دم سے بیدار ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ نشے میں ہے اور اس کی آنکھیں بار بار بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بستر سے نکلی اور تیزی سے میرے پاس آ کر مجھ سے چمٹ کر میرے گلے میں بانہیں حمائل کر کے بولی۔

''تم کون ہو؟ موہن تو نہیں ہو وہ اٹھارہ برس کا لڑکا تھا کیا تم اس کے بڑے بھائی ہو؟ میں سات دن اور رہوں گی۔ تم شام کے وقت آیا کرنا میں تمہیں سیر کراؤں گی ڈنر کھلاؤں گی تم صبح تک میرے مہمان رہو گے۔ میں تمہیں روز سوڈا لر دیا کروں گی۔''

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواہش

طاہر حسین

زندگی ہر کسی کو پیاری ہوتی مگر ان کو نہیں جن کی زندگی روگ بن جائے۔ ایک ایسے شخص کی بے بسی جس نے ایک ایسی عورت سے شادی کی جو پہلے ہی اپنے چڑیا گھر سے بیاہی جاچکی تھی۔ اس نے اپنے روگ کا علاج ڈھونڈلیا تھا مگر.....

خود اپنے دام میں صیاد آگیا کی عملی تصویر

اسے آج ہی قتل کرنا ہوگا۔'' فلورا نے یہ فقرہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اس کا فربہ جسم ایک بوسیدہ سے کمبل میں لپٹا بری طرح کانپ رہا تھا۔ اور چہرے پر اشکوں کی تحریر بھی واضح تھی۔

''بچاری رانی ہائے ہاورڈ مجھے ہر حال میں اسے قتل کرنا ہوگا۔''

ہاورڈ نے اسے حیرت دیکھا۔ ''فلورا اسے قتل کروگی؟''

''اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اسے کسی اور کو ہاتھ بھی لگانے دوں گی؟ میں خود یہ کام سرانجام دوں گی۔''

ہاورڈ نے آنکھیں جھپکیں۔ ''لیکن میرا خیال تو یہ نہ تھا کہ تم میں اتنی جرأت ہوگی۔ یعنی قتل وغیرہ کرنے کی۔''

''مگر رانی بڑی تکلیف میں ہے ہاورڈ۔ لہٰذا قتل کا ثواب ہوگا۔ یہ قتل اس کی فلاح کے لیے کیا جائے گا۔''

''وہ تو بجا ہے۔'' ہاورڈ نے فلورا کی طرف دیکھا جو بری طرح کانپ رہی تھی۔ ''لیکن بہتر ہوگا کہ یہ کام تم مجھے کرنے دو۔''

''نہیں۔'' وہ سختی سے بولی اور ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ ہاورڈ ہمیشہ کی طرح سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا اور اس لمحہ اسے یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ وہ ایک عورت سے ڈرتا ہے، اپنی بیوی سے ڈرتا ہے اور اس امر کی صفائی کے لیے وہ کوئی توجیہہ بھی پیش نہیں کرسکتا تھا۔

''جیسے تم مناسب سمجھو فلورا۔ میں تو بس تمہاری مدد کا خواہاں تھا۔''

''خبردار جو تم نے رانی کو چھوا بھی۔ اس کے قریب بھی مت جانا۔''

''بہت بہتر۔'' اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ اس نے پہلے بھی کبھی رانی کو نہیں چھوا تھا۔ بلکہ وہ اس سے خوفزدہ تھا وہ رانی سے شدید نفرت کرتا تھا بلکہ اسے فلورا کے سارے پالتو جانوروں سے نفرت تھی۔

''فلورا تم اسے قتل کیسے کروگی؟''

''زہر سے۔''

''کیا تمہارے پاس زہر موجود ہے؟''

فلورا نے اپنے پھٹے پرانے سوئٹر کی جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ اس میں کوئی بے رنگ سیال بھرا ہوا تھا۔

''یہ مسٹر گراٹ دیلر نے مجھے ڈاکٹر میسن کے نسخہ سے دیا ہے۔ یہ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہے

مگر ہے زرا اثر بس ایک دو قطرے ہی کافی ہیں۔"

اور یہی وقت تھا جب اس کے ذہن میں فلورا سے چھٹکارا پانے کا خیال پیدا ہوا۔ برسوں بعد اسے امید کی پہلی کرن نظر آئی تھی اور اسے یقین ہوگیا کہ وہ یہ کام بڑی آسانی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک مبہم سی تصویر تھی۔ بے قاعدہ سی مگر بتدریج واضح ہوتی ہوئی۔

"لیکن تمہارے پاس تو پوری بوتل ہے۔" ہاورڈ کو کرید سی لگ گئی۔

"آئندہ بھی برے وقتوں میں کام آئے گا۔" اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا اور ہاورڈ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "میں رانی کے کھانے میں زہر ملادوں گی اور حل ہونے کے بعد اسے بالکل خبر نہ ہوگی۔" فلورا کے چہرے پر وحشت سی چھا گئی۔ معاً وہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "کہیں رانی نے ہماری باتیں تو نہیں سن لیں؟ میں نہیں چاہتی کہ اسے پہلے سے کچھ معلوم ہوجائے۔ وہ بے خبر ہوگی تو اسے کھانے میں آسانی رہے گی اور اس کی تکلیف ہمیشہ لیے ختم ہوجائے گی۔" فلورا کی نیلی آنکھیں گھوم کر رانی پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ بڑی سی جنگلی بلی سرخ مخملیں صوفے کے درمیانی کشن پر دراز تھی۔ اس کے سرمئی لانبے لانبے بال سرخ کشن پر پھیلے بھلے دکھائی دیتے تھے وہ صوفہ صرف رانی کے لیے مخصوص تھا۔ رانی کی آنکھیں نیم وا تھیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے واقعی ان کی باتیں سن لی ہوں۔

"بچاری۔ ذرا دیکھو تو کتنی بہادر ہے۔ شکایت نہیں کررہی ہے۔"

واقعی وہ شکایت نہیں کررہی تھی اور جانور بیچار کبھی بھی شکایت نہیں کیا کرتے۔ وہ بیمار تھی اور شاید زندگی کے چند آخری سانس لے رہی تھی وہ ہر

وقت گھر بھر کا چکر لگاتی اور گھومتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے ہمہ وقت یہیں بے دم سی پڑی رہتی تھی۔ اور ہاورڈ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ بلا واقعی بیمار ہے۔

''ہاورڈ تم ذرا باہر جاؤ۔ میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات میں اس کے ساتھ تنہا رہنا چاہتی ہو۔'' ہاورڈ بلا تامل باہر آگیا اور کمرے کے باہر کھڑا ہو کر اپنی موجودہ زندگی اور حیثیت کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ناگاہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نے اسے چونکا دیا اور سبز رنگ کی کوئی چیز اس کے چہرے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

''باز آجاؤ بدمعاش۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا مگر آواز اتنی دھیمی تھی کہ فلورا کے سن لینے کا قطعی کوئی امکان نہ تھا۔

فلورا کا چہیتا طوطا پیر کل لیمپ شیڈ پر بیٹھا اسے شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا مسخرا ڑا رہا ہو۔ وہ ہاورڈ کو یوں اچانک ڈرا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ جب وہ کسی ماہر تیراک کی مانند غوطہ لگا کر ہاورڈ کے چہرے کو چھوتا ہوا نکل جاتا تو وہ واقعی ڈر جاتا تھا۔ اور اب پیر کل اوپر بیٹھا خوش ہو رہا تھا۔ کہ اتنی بلندی پر دشمن اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا تھا۔

''میں تمہیں قتل بھی کرسکتا ہوں۔'' ہاورڈ غصہ سے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

لیکن نہیں یہ محض ایک گیدڑ بھبکی تھی وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرسکتا تو کب کا پیر کل کو قتل کرچکا ہوتا۔ وہ اس چڑیا گھر کے ہر فرد کا خاتمہ کرچکا ہوتا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ جانوروں کے جسموں سے اٹھتے تعفن سے اس کا دم گھٹتا تھا۔ ہر چیز پر پروں اور فرکی تہ جمی تھی مگر سب سے اذیت ناک چیز ان کی موجودگی کا احساس تھا جو جان لیوا تھا۔

وہاں ہر طرف جانور ہی جانور تھے۔ دیواروں کے ساتھ مچھلیوں کے حوض بنے ہوئے تھے۔ مچھلیاں اس وقت تیر نہیں رہی تھیں بلکہ سکتہ کے عالم میں بڑی بڑی آنکھیں نکالے اسے گھور رہی تھیں۔ اور ہر پنجرے میں سے جانوروں اور پرندوں کی بٹن نما آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اپنے مجبور اور لاچار دشمن کو جیسے ان کے بجائے ہاورڈ پنجرے میں مقید ہو۔ وہ سب جانتے تھے کہ وہ ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

اور جہاں تک آزاد جانور کا تعلق تھا۔ وہ تو اس کے لیے وبال جان تھے۔ وہ سب جانتے تھے۔ وہاں کتے بلیاں اور نوع نوع کے جانور تھے۔ خصوصاً ڈیلکس ہاؤنڈ نسل کی چھوٹے چھوٹے پاؤں والی کنیا فرنٹری، خونخوار چیتا پکل اور چینی نسل کا کتا فین ٹین وہ سب اسی کی طرف متوجہ تھے۔

''مجھے تم سب سے نفرت ہے۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ اور یہ فین ٹین ہی تھا جو اپنے احساسات کا مظاہرہ ہمیشہ عملی صورت میں کرتا تھا اس نے اچانک چھلانگ لگائی اور ہاورڈ کی ٹانگوں پر جھپٹا۔ ہاورڈ نے شدید پشتم اپنی ٹانگ چھڑائی اور جلدی سے درمیان میں اسکرین کرکے پھر وہ تیزی سے برآمدے کو عبور کرکے، سیڑھیاں اتر کر صحن سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں گھس گیا۔ جو اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی اور یہ وہ جگہ تھی جہاں کسی زمانے میں اصطبل ہوا کرتا تھا۔

جانوروں نے انسان کو گھر سے بھگا دیا تھا اور اب انسان حیوانوں کی رہائش گاہ میں پناہ گزین تھا۔ ہاورڈ نے جلدی سے رم کی بوتل نکالی۔ یہ وہ ہمیشہ اصطبل ہی میں چھپا کر رکھتا تھا کہ وہی اس کی پناہ گاہ تھی۔ وہ شراب پیتا رہا اور اپنی موجودہ حالت پر غور کرتا رہا۔

ہاورڈ عورتوں کے معاملہ میں بڑا لاابالی ہوا کرتا تھا۔ فلورا سے قبل بہت سی لڑکیوں نے اس کی توجہ کا مرکز بننا چاہا مگر ناکام رہیں وہ مویشیوں کے ایک ڈاکٹر کا معاون تھا اور جانوروں میں دل چسپی بھی رکھتا تھا اور شاید یہی ایک مشترکہ پسند اس کے اور فلورا کے درمیان بے تکلفی کا باعث بنی چنانچہ اس نے فلورا سے شادی کرلی۔ وہ ان دونوں بڑا مفلوک الحال تھا جبکہ فلورا کسی حد تک متمول تھی۔ اس کے پاس کچھ زمین تھی جسے وہ ''نوآبادی'' کے نام سے یاد کرتی تھی۔ اس زمین پر ایک بڑا سا پرانا مکان تھا۔ اس کے علاوہ اس کا باپ ترکہ میں نقدی، بانڈ اور

دیگر کئی قیمتی چیزیں چھوڑ گیا تھا اور وہ ان تمام چیزوں کو مختلف بنکوں میں محفوظ کر چکی تھی۔

فلورا نے اس سے کہا تھا۔ ''ہم ایک مثالی زندگی گزاریں گے۔ اور پھر تم میرے پالتو جانوروں کی نگہداشت میں میری مدد بھی تو کر سکو گے۔'' اس نے فلورا کے جانور دیکھے اور خیر جو کام وہ اس وقت کر رہا تھا وہ بھی اسی نوعیت کا ہی تھا۔ بس مشکل یہ تھی کہ جانوروں کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا۔ صرف اس کے پیشے نے اسے اس امر پر مجبور کیا تھا۔ اور پھر مزدور کا اینٹوں سے پیار کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

بہر حال اس نے فلورا سے شادی کر لی اور باقاعدہ قانونی شادی کی۔ مگر وہ تو پہلے ہی اپنے چڑیا گھر سے بیاہی جا چکی تھی ہاورڈ تو محض مستقل خدمت گار کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ کام وہی پرانا تھا۔ بس مالک بدل گیا تھا۔

مگر یہ کام اس سے بھی بدتر نکلا یہ ہمہ وقتی ملازمت تھی اب وہ کھاتا بھی اپنی جانوروں کے ساتھ، رہتا بھی انہی کے ساتھ اور ان ہی کے ساتھ سوتا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ اسے مجبور کیا جاتا کہ وہ ان سے پیار بھی کرے۔

ہاورڈ رم پیتا رہا اور خود کو ستا رہا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ فلورا کے گھر اس لیے آیا تھا کہ اس کا اپنا ذاتی کوئی مکان نہیں تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تب اسے اس مکان کا نقشہ بہت بے ڈھنگا سا لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد فلورا کی ان جانوروں میں دلچسپی خود ہی ختم ہو جائے گی۔ لیکن وہ ان سے نجات حاصل کرنے کے بجائے بتدریج ان میں اضافہ کرنے لگی۔ یہاں تک کہ پڑوس میں کسی صاحب کو ان کے ایک دوست نے مگرمچھ بھیجا۔ مگر اس کی بیوی نے اسے گھر میں رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا وہ صاحب اسے فلورا کے پاس لے آئے وہ جانتا تھا کہ ہر لاوارث جانور کو صرف یہیں پناہ مل سکتی ہے چنانچہ فوراً اس مگرمچھ کو جس کا نام اب ایلس ہے گھر کے اکلوتے غسل خانہ میں نہانے کے ٹب میں جگہ مل گئی۔ اور جب بھی نہانے کے لیے اس ٹب کی ضرورت پڑتی تو پہلے ایلس کو وہاں سے ہٹانا پڑتا اور بعد از غسل اسے دوبارہ وہاں منتقل کر دیا جاتا۔ اسی لیے ہاورڈ پسینے کی بدبو برداشت کر لیتا مگر نہاتا نہ تھا۔

کھانا وہ سب ایک خاندان کی طرح اکٹھے کھاتے تھے فلورا اکثر کہا کرتی تھی کہ ہم سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ کھانے کے دوران وہ ہمیشہ رانی کو اپنی گود میں بٹھاتی۔ لیکن یہ رانی کے موڈ پر منحصر تھا۔ وہ فلورا کی پلیٹ میں سے ساتھ ہی ساتھ ہڈیوں کا صفایا کرتی جاتی۔ فرٹیزی اس دوران عجیب عجیب آوازیں نکالتی میز کے چاروں طرف گھومتی رہتی۔ ان جانوروں کی موجودگی میں کسی قسم کی بھی گفتگو ناممکن تھی۔ لیفین ٹین ہاورڈ کے پاؤں ہی سے چمٹا رہتا۔ وہ متواتر اسے کھلاتا رہتا لیکن اگر کبھی تھوڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو اگلی مرتبہ فین ٹین نوالے کے ساتھ اس کی انگلیاں بھی چبانے کی کوشش کرتا تھا۔

پنجروں والے جانور اتنا تنگ نہیں کرتے تھے۔ اس کی بس ایک ہی مصیبت ہوتی تھی کہ ہاورڈ کو روزانہ ان کے پنجرے صاف کرنا پڑتے جو کہ انتہائی غلیظ کام تھا۔ فلورا ہمیشہ سے بہت مصروف رہتی تھی شاید نے اس سے شادی اسی لیے کی تھی کہ وہ پنجرے صاف کر لیا کرے گا۔ سب سے باوقار جانور رانی تھی۔ وہ اس گھر کی مالکہ لگتی تھی۔

ہاورڈ کو اس وقت اپنی رم بہت اچھی لگ رہی تھی کہ کم از کم وہ اس سے اپنے غم تو بھول جاتا تھا اور زندگی قابل برداشت محسوس ہونے لگتی تھی پہلے وہ رم کی بوتل اپنے کمرے میں رکھتا تھا۔ لیکن رانی کو اس کی بو بھا گئی۔ اور وہ اس کے لیے اصرار کرنے لگی۔ چنانچہ فلورا نے اسے حکم دیا کہ بوتل کو کسی دوسرے کمرے میں رکھا کرے۔ مگر جب رانی نے اس تبدیلی پر شدید احتجاج کرتے ہوئے گھر سر پر اٹھا لیا۔

تو ہاورڈ کو اجازت مل گئی کہ وہ رم کو اپنے کمرے میں رکھ لیا کرے لیکن اس شرط پر کہ جب بھی وہ پینے ایک ڈراپ رانی کو بھی دے مگر جلد ہی رانی کو اس کی لت پڑ گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح بوتل ڈھونڈ نکالتی اور

اس کے کاک اور گردن کو منہ میں لے کر اس بری طرح چاٹتی کہ ہاورڈ کا جی متلانے لگتا اور کئی کئی روز تک وہ بوتل کے قریب بھی نہ جاتا۔ اور شاید رانی کے مرض لاحقہ کی اصل وجہ ہاورڈ کا یہ گریز ہی تھا ناوہ بوتل کھولتا ناہی بوتل کا کارک اور گردن شراب سے تر ہوتے۔ لہٰذا وہ بڑا خوش ہو رہا تھا کہ اب اس کی رم محفوظ رہا کرے گی۔

آخر اس نے پہلے ہی فلورا سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں کیوں نہ سوچا۔ اس نے اپنے تئیں سوال کیا اور پھر خود ہی جواباً سوچنے لگا۔ امید بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے ہاں امید پھر کوشش اور آخر میں کامیابی، میں جانوروں کے اس معمولی ٹولے سے ہار ماننے والا نہیں ہوں میں انہیں ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میری ہستی تک مٹادیں میں اس جائیداد کا صحیح حق دار ہوں۔ فلورا مجھ سے بیس سال بڑی ہے ان جانوروں میں رہتے ہوئے تو اسے کوئی مرض لاحق نہیں ہوا۔ اب یہ کام میں خود سرانجام دوں گا۔ اور پھر یہ ساری جائیداد یہ ساری دولت میری ہوگی۔

یک بیک گھر کی طرف سے فلورا کی چیخیں بلند ہوئیں ہاورڈ بے تحاشہ اس طرف بھاگا۔ فلورا برآمدے میں کھڑی بین کر رہی تھی جب وہ اس کے قریب پہنچا تو ہذیانی آواز میں بولی۔

''وہ مرگئی۔ ہاورڈ رانی مرگئی۔''

''لیکن تم یہی تو چاہتی تھیں۔'' مگر فلورا ایسی منطق سے بہلنے والی نہیں تھی۔

''وہ مرنا نہیں چاہتی تھی ہاورڈ وہ جان چکی تھی کہ میں کیا کرنے والی ہوں مگر وہ یہ سب کچھ جاننے سے قاصر تھی یوں لگتا تھا جیسے مجھ پر اس کا اعتماد اٹھ گیا ہو۔ اور آخر جب اسے پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا ہے تو اس نے مجھے عجیب شکایتی نظروں سے دیکھا تھا اور ہاورڈ میں وہ نظریں کبھی فراموش نہ کرسکوں گی میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنا سر ہلاتی رہی..... ہاورڈ وہ دل میں یہ بات لے کر مری ہے کہ میں نے اس سے دغا کی ہے۔''

''خیر اب اس کا تو کوئی حل نہیں۔''

''جانور بہت ذی فہم ہوتے ہیں ہاورڈ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا اچھی طرح جانتے ہیں لیکن یہ فلاحی قتل رانی کی سمجھ سے بالاتر تھا۔''

''فلورا پھر تمہیں آئندہ کبھی ایسا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے میرا مطلب ہے تم بذات خود ایسا کام نہ کرنا۔ ایسے فرائض میں انجام دیا کروں گا۔ جانوروں کے جذبات میرے لیے ذرا مختلف نوعیت کے ہیں لہٰذا انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

فلورا نے اسے درد آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔''

''یہ حقیقت ہے ڈارلنگ۔ لاؤ وہ بوتل میرے حوالے کردو۔'' فلورا نے وہ بوتل اس کے حوالے کردی جسے اس نے بعد میں اصطبل میں چھپادیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہاورڈ کارڈبورڈ خرید لایا۔ اور رانی کا تابوت بنانے لگا۔ اس نے یہ کام بڑے جوش وخروش سے کیا اور جب وہ تابوت تیار کرکے فلورا کو دکھانے کے لے لایا تو اس نے ہاورڈ کے کام کو بہت سراہا۔ پھر اس نے بیلچہ اٹھایا اور قبرستان کی طرف چل دیا۔ یہ جگہ مکان کے پچھواڑے انگوروں کے باغ میں واقع تھی۔ یہ قطعہ بھی فلورا کی ملکیت تھا اس کی پوری زمین میں یہ سب سے اچھی اور خوب صورت جگہ تھی ہاورڈ نے تقریباً تین فٹ گہری قبر کھودی اور پھر فلورا کو خبر دی۔

گو فلورا نے اس جنازے میں شرکت کے لیے چند دوسرے جانوروں کو بھی ترغیب دی۔ مگر رانی اپنے اس خاندان میں کوئی ایسی ہر دلعزیز نہ تھی۔ پیر کل اور فین ٹین تو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے اور آج بھی وہ اپنے اس اصول پر کاربند رہے۔ چیتا، پکل بے دلی سے ساتھ ہولیا فرنٹری بھی آمادہ ہوگئی فلورا سفید چوہے بھینٹ چڑھانے کے لیے ساتھ لے آئی ہاورڈ سمجھا کہ وہ چوہوں کو رانی کے ساتھ ہی زندہ دفن کردے گی۔ جیسے فرعون کے زمانے میں

تھا۔لیکن اگر فلورا نے ایسا سوچا بھی تھا تو آخری لمحے اس کی نیت بدل گئی شاید اسے ان پر رحم آ گیا تھا۔لہٰذا اس نے چوہوں کو آزاد کر دیا۔

وہ منظر بڑا دل دوز تھا ہاورڈ نے رانی کو بند کیا۔ تابوت قبر میں اتارا اور پھر قبر کو مٹی سے بھرنے لگا۔ اس موقع پر فلورا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

سورج غرب ہونے کو تھا جب فلورا کی آہ و بکا ختم ہوئی۔اور ہاورڈ اسے زبردستی گھر لے آیا۔

''زندگی ہر کسی کو کتنی پیاری ہوتی ہے۔'' اس سے بڑے فلسفیانہ انداز میں ہاورڈ نے آہستہ سے کہا۔'' خصوصاً جب زندگی روگ بن جائے اور اس بوتل میں جو چیز ہے وہ اسی روگ کا ہی تو علاج ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہاورڈ نے بڑی پر امید نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''فلورا کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

'میرا تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

''ڈارلنگ تمہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔'' وہ کسی بھینس کی طرح پلی ہوئی تھی بلکہ فلورا پر اس سے بھی زیادہ چربی چڑھی ہوئی تھی۔مگر اس وقت تو بہر حال وہ اسے کچھ کھلانے پر تلا ہوا تھا۔''تم پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں فلورا۔ یہ مت بھولو کہ تمہیں اپنے لیے نہیں اپنے جانوروں کے لیے زندہ رہنا ہے تمہیں بے پروا نہیں ہونا چاہیے اور کیا رانی اس بات کو پسند کرے گی کہ اس کے ساتھیوں کی نگہداشت میں کسی قسم کی بھی غفلت برتی جائے؟ مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے رانی کی روح بے قرار ہو جائے گی۔''

''مجھ سے کچھ بھی نہ کھایا جائے گا۔یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز میرے حلق میں اٹک گئی ہو۔'' ہاورڈ کو وقتی طور پر ماننا پڑی مگر اسے یقین تھا کہ اس کے منصوبہ وک شرمندہ تعبیر ہونے میں بس اب تھوڑی ہی دیر ہے۔

فلورا اپنا روزہ توڑے بغیر لیٹ گئی۔گھنٹوں وہ بے کل سی کروٹیں بدلتی رہی آخر کار سو گئی۔صبح وہ کافی دیر سے بیدار ہوئی۔

''کیا میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟'' سب سے پہلی جو بات اس نے کہی وہ یہی تھی۔

''ہاں اسپرین کی دو ٹکیاں لا دو۔''

''ساتھ میں تھوڑا سا جوس بھی لا دوں۔ کیا تم جوس پینا پسند کرو گی؟''

''ہاں کوشش تو کروں گی۔''

وہ جلدی باورچی خانے میں گیا جوس کی بوتل نکالی گلاس میں برف ڈالی اور اس پر جوس انڈیلا۔ پھر اس نے مسٹر گراٹ دیلیز کی ہوئی ہوئی بوتل میں سے دو قطر اس میں گرائے اور چمچے سے حل کرنے لگا۔گو وہ اسے چکھ کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔البتہ رنگ اور خوشبو بے شک جوس ہی کی تھی اور جہاں تک اس زہر کی خصوصیات کا تعلق تھا اسے ڈاکٹر میسن کے نسخہ پر کامل یقین تھا۔اس نے گلاس پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کیے گلاس کے گرد نشو کا رومال لپٹا اور فلورا کے پاس لے آیا۔

''ہاورڈ تم کتنے اچھے اور مشفق انسان ہو۔'' فلورا نے بڑی اپنائیت سے کہا اور یہ اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے۔

اسے شاید شاید پیاس لگی تھی اس نے جوس کا گلاس ختم کر دیا اور اسے کسی قسم کا فرق دیا ذائقہ بھی محسوس نہ ہوا تھا پھر وہ یونہی مسکرا کر ہاورڈ کو دیکھتی رہی۔مگر پھر اچانک اس کے چہرے کے زاویے بدلنے لگے وہ کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی اس نے استفہامیہ نظروں سے ہاورڈ کی طرف دیکھا۔اور پھر بڑے آرام سے آنکھیں موند لیں۔

''خدا حافظ فلورا۔'' وہ چہکا مگر فلورا نے بولی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد ہاورڈ نے ایک پل بھی ضائع نہیں کیا جانوروں کو کھانا کھلانے کا وقت تو تھا۔اس نے مسٹر گراٹ ویلیو کی دی ہوئی طلسمی دوا سب جانوروں کے کھانے میں ملا دی۔یہ کام اس نے بڑی احتیاط اور مہارت سے کیا۔

زخم دل بھرتا نہیں

صائمہ خان

دھندلے آئینوں میں کھوئی ایک لڑکی کا فسانہ، وقت نے اس کے پاؤں میں بھاری زنجیریں ڈال دی تھیں۔ دو پگھلتی آنکھوں کی کہانی، انہیں زندان کے واحد روزن سے زندگی نظر آگئی تھی۔

ایک ایسی لڑکی کا فسانہ جسے تنہائی نے نفسیاتی مریض بنادیا تھا

میں کلب میں بیٹھا کوئی گھنٹہ بھر سے بور ہو رہا تھا اور فرخ حسب عادت آتی جاتی ہر خوب صورت لڑکی کو بغور دیکھنے میں مصروف تھا۔

''یار فرخ..... تم اپنا یہ انتہائی ضروری کام تنہا آ کر بھی سرانجام دے سکتے تھے۔'' میں نے اکتا کر کہا۔

''کون سا کام؟'' فرخ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''یہی جو تم اس وقت سرانجام دے رہے ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔

اصل میں فرخ مجھے یہی کہہ کر ساتھ لایا تھا کہ اسے ایک بے حد ضروری کام ہے۔ عرفان اور حیدر چلاتے ہی رہ گئے کہ بازی ختم ہو لینے دو مگر فرخ نے بساط الٹ دی اور مجھے بازو سے کھینچتا ہوا گاڑی تک لایا اور پھر گاڑی پوری اسپیڈ پر چھوڑ دی اور اب کوئی گھنٹہ بھر سے بیٹھا آتی جاتی لڑکیوں کو گھور رہا تھا جیسے اس سے اہم کام اور کوئی نہ ہو۔

''بات یہ ہے کہ میں نے تمہیں ایک ممکنہ ہار سے بچایا ہے۔'' فرخ نے اطمینان سے کہا۔ ''پر تم ہو آدمی ناشکرے۔''

''جو آدمی جیتنا جانتا ہو، اس میں ہارنے کا ظرف بھی ہونا چاہیے۔ پھر کیا پتا میں ہارتے ہارتے بھی جیت جاتا۔''

''چھوڑو یار۔'' اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔ ''چلو میں تمہیں ایک پٹاخا لڑکی سے ملاؤں۔''

مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے کسی پٹاخا لڑکی سے ملاتا، سرخ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس ایک چمکتی دمکتی شعلہ بداماں قیامت خراماں خراماں سامنے سے گزری اور فرخ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ میں نے فرخ کی آنکھوں کو اس خوب صورت حسینہ کے پیچھے لپکتے دیکھا تو ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی سے کافی کے سپ لینے لگا۔

''اے ہوش میں آؤ وہ تو گئی۔'' میرے کانوں میں جھانجھریں سی بجیں۔

چونک کر میں نے نظریں اٹھائیں اور میری نظریں اس کے چہرے پر ٹھٹک کر رہ گئیں جانے وہ خوب صورت تھی یا نہیں پر اس کے دلربا چہرے کی معصومیت میں انجانی سی کشش تھی جو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی اچھوتی کرن کا خیال آتا تھا جیسے کبھی انسانی نظروں نے نہ چھوا ہو۔

''گئی۔'' فرخ نے عجیب بونگے پن سے اسی سمت گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں گئی۔ اور اب تم بھی واپس آ جاؤ۔'' وہ ہنسی اور ایک بار پھر جھانجھریں سی بجیں۔

میرا جی چاہا وہ یوں ہی ہنستی رہے اور میں اس کے مترنم لہجے کی موسیقیت کو قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتا رہوں۔ کیا کسی آواز میں اتنی خوب صورتی، اتنا رچاؤ ہوتا ہے کہ آدمی کا دل کسی ضدی بچے کی طرح اسے اپنے اندر چھپا لینے کو مچل اٹھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کی جھانجھریں بجاتی آواز کو اپنی مٹھی میں اتنی نرمی سے بند کر لوں کہ نہ تو اس کا حسن مجروح ہو اور نہ ہی اس کے رنگ پھیکے پڑیں۔ اور جب میرے اندر کودتے جذبے مرنے لگیں اور میری روشنیاں پھیکی پڑ جائیں تو اس وقت میں اپنی بند مٹھی کھول دوں اور اس رنگ بکھیرتی تتلی کے سارے رنگوں کو دمکتا ہوا دیکھوں اور پھر ہولے ہولے ان سارے رنگوں کو اپنے اندر جذب کر لوں۔

''اگر تم ایک پاور اوٹنڈ اس کے ساتھ ناچنا چاہتے ہو تو کوئی حرج نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''لیکن اگر تم اسے زندگی کا انداز بنانا چاہتے ہو تو مائی پور بوائے (my poor boy) مجھے افسوس ہے وہ تمہاری وجاہت اور شخصیت کے باوجود تم پر اس موٹے، بھاری اور بدصورت شخصیت کو ترجیح دے گی جس کا بزنس دنیا کے آدھے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ سمجھے مائی ڈیئر۔''

''woman only wants money''

(عورت صرف پیسہ چاہتی ہے) اس کے لہجے کی موسیقیت میں زہر سا گھلنے لگا مگر وہ ہولے سے ہنسی اور زہر کی تلخی شہد کے سمندر میں ڈوب گئی۔

''ہائے پنکی تم۔ ابھی ابھی میں تمہارا ہی ذکر کررہا تھا۔'' فرخ بولا

''میرا ذکر۔'' اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''یعنی تمہیں سینوں کے جمگھٹ میں میرا ذکر کرنے کی فرصت بھی مل گئی۔ کیوں جی کیا فرمارہے تھے صاحبزادے۔'' وہ یک دم مجھ سے مخاطب ہوگئی۔

''جی..... جی.....'' میں بوکھلا کر رہ گیا۔ ''یہ فرخ..... یہ.....''

''جی مجھے معلوم ہے یہ فرخ ہے۔'' اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ''مگر میں پوچھ رہی تھی۔ خیر جانے دیجیے ضرور اس نے کوئی..... بیہودہ بات کہی ہوگی۔'' اس نے بات ختم کردی۔

''بڑی تیز لڑکی ہے۔'' میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔ ''اور اتنی معصوم نہیں جتنی چہرے سے لگتی ہے۔''

''میں مریم ہوں۔'' اس نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔

''اور باقی تفصیل تم اپنے اس دوست سے پوچھ لینا۔''

مریم نے چھوٹا سا کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور پھر اسی طرح ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی اور میں اس کی مدھم ہنسی کے ترنم میں کھو گیا۔

''تم بریگیڈیر واسطی کو جانتے ہو؟'' فرخ نے پوچھا۔

''نام تو سنا ہے شاید۔''

''مریم بریگیڈیر واسطی کی لڑکی ہے اور باپ کی طرح کچھ کچھ کریک۔''

''نہیں، کریک تو وہ کسی صورت نہیں لگتی۔ اتنی معصوم سی تو ہے۔'' میں نے فوراً تردید کی۔

''ارے بڑی آفت ہے۔ تمہارا واسطہ نہیں پڑا ابھی۔''

''اور تمہارا پڑ چکا ہے۔'' میں نے بغور اسے دیکھا۔

''نہ.....'' فرخ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''میں تو اس سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ ویسے یہاں کلب میں ہی کئی لڑکے اس پر مرتے ہیں۔''

''اور وہ۔''

''ارے اسے کیا پتا سنجیدگی کس چڑیا کا نام ہے۔ فقنہ ہے فقنہ۔ سب کو چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔''

''خوب.....'' جانے کیوں مجھے اطمینان ہوا۔

کچھ دیر تک میں نے مریم کے متعلق سوچا اور پھر سر جھٹک کر اسے ذہن سے نکال دیا۔ مگر اس رات آسمان پر چمکتے ہوئے اس بے حد آبدار ستارے کو دیکھ کر مجھے اس کی ستارہ آنکھیں یاد آ گئی اور مجھے لگا جیسے اس کی جلترنگ بجاتی آواز کا ترنم سارے میں پھیل گیا ہو۔

''افوہ..... کس قدر خوب صورتی ہے اس کی آواز میں، جیسے کہیں دور جھرنے پھوٹ رہوں۔ میں کھو سا گیا اور اس کے چہرے کی معصوم ملاحت کتنی سندر ہے۔ ایسی سندرتا اور ایسا ترنم کہ آدمی ساری عمر سنتا رہے۔ تکتا رہے اور نہ تھکے۔ تو یہ مریم ہے۔ سچ مچ کی جیتی جاگتی مریم..... کوئی سنگ مرمر سے تراشا ہوا بت نہیں۔''

''مریم!'' میں نے زیر لب دہرایا اور مجھے لگا جیسے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے زیادہ روشن، زیادہ بڑے ہوگئے ہوں۔

''کیا یہ اس کے نام کا اعجاز ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''کیا حماقت ہے۔ یعنی رات کے اس پہر میں ایک ایسی لڑکی کے بارے میں سوچے جا رہا ہوں جسے میں نے محض چند ثانیوں کے لیے دیکھا اور جس کے لیے میرے دل میں کوئی ایسا چور جذبہ بھی نہیں۔ یہ سارا اعجاز شاید اس چاندنی رات کا ہے۔ پھر بھی جانے کیوں بہت دیر تک مجھے اس کی معصوم صورت ڈسٹرب کرتی رہی۔

☆☆☆

دوسری بار میں نے مریم کو ایئرپورٹ پر دیکھا۔ جواد کا پلین آنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا

اور میں تیزی سے لاؤنج کی طرف جارہا تھا کہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائی لاپروائی سے چیونگم چبارہی تھی اور ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو!'' اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک کسی بھولے بسرے خواب کی طرح جاگی۔

وہ بڑی اپنائیت سے ہولے سے مسکرائی اور اس نے اپنی بند مٹھی میری آنکھوں کے سامنے کھول دی۔

''چیونگم کھاؤ گے۔''

''تھینکس۔''میں نے اس کی گلابی گلابی گداز ہتھیلی پر رکھی چیونگم اٹھالی۔

''کیا تمھیں کسی کا انتظار ہے؟''

''نہیں۔'' وہ اتنی چھوٹی تھی کہ آپ جناب کا تکلف برتنے کو جی نہ چاہا۔

''تو کیا تم کہیں جارہی ہو؟''

''اوہ نو۔''اس نے اسی رسانیت سے کہا۔

''تو پھر؟'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''کیا کہوں۔ بڑا عجیب سوال ہے۔''

''سنو۔''اس نے دفعتاً میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''اگر میں شور مچادوں کہ تم مجھے چھیڑ رہے ہو تو کیسی رہے۔''

''ارے باپ رے۔'' میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔''ایسا غضب نہ کرنا ورنہ میرے اس خوب صورت سر پر جو بال ہیں نا، ان میں سے ایک بھی سلامت نہ رہے گا۔''

''تو کیا فرق پڑتا ہے۔''اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکے۔''ہر گنجا آدمی مجھے اٹریکٹ کرتا ہے۔''

''مجھے تو معاف ہی رکھو ایسی اٹریکشن ہے۔'' میں نے دنوں ہاتھ جوڑ دیے۔''ویسے یار ہو بڑی خطرناک چیز۔''

''پتا ہے لوگوں کی پٹائی کرنا یا کروانا میری ہابی ہے۔''اس کی آنکھوں میں ایسی شریری چمک تھی کہ مجھے سچ مچ پسینہ آ گیا۔ بقول فرخ اس سے کسی قسم کی حرکت کی بعید نہ تھی۔

''بڑی خطرناک ہابی ہے۔'' میں نے نروس ہو کر کہا۔''مگر پلیز مجھے اپنے سلیکشن میں شامل نہ کرنا۔''

مجھے پسینہ پونچھتے دیکھ کر وہ ہنسی۔''جاؤ معاف کیا۔''

اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑے شاہانہ انداز میں کہا۔ اسے شاید میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے منہ کھولا مگر اسی وقت نیویارک سے آنے والی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوگئی اور پھر بنا کچھ کہے لوگوں کے ہجوم میں کہیں گم ہوگئی۔

☆☆☆

جواد میرا چھوٹا، بے حد پیارا بھائی جو دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے میرے پاس آیا تھا۔ اب کوئی بچہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ بے حد سمجھ دار ہوگیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

''ارے!''میں نے اسے خود سے الگ کر کے بے حد غور سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''کیا شاندار قد نکالا ہے اور کیسے سرخ وسفید ہو رہے ہو ماشاء اللہ۔''

''بھائی جان !'' وہ دوبارہ مجھ سے لپٹ گیا۔''آپ بھی مجھ سے کچھ کم شاندار نہیں لگ رہے سچ۔''

''اچھا، فوراً ہی بدلہ اتارلیا۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''باقی سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا۔''

''جی ہاں، سب آپ کو یاد کرتے ہیں اور میرا جی تو بالکل آپ کے بغیر نہیں لگتا۔''

''اچھا!''

واپس جاتے ہوئے پل بھر کے لیے میری آنکھوں نے چاروں طرف اسے ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ تھی۔ دو ہفتے جواد کے ساتھ بہت مصروف گزرے جاتے ہوئے وہ بہت دل گرفتہ تھا۔

''ارے یار، یوں منہ نہ لٹکاؤ۔ یہی زندگی ہے۔ پھر ملنے کے لیے جدا ہونا۔'' میں اسے تسلی دیتا رہا۔ ''میں جلد آؤں گا۔ سب کی محبتوں سے دور زندگی گزارنا کچھ کم آزمائش نہیں سمجھے۔ اچھا۔''

میں ریلنگ پر جھکا اسے اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بلوجینز کی وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ میں ایک گہری سانس لے کر واپس مڑا۔ اسی وقت میں نے مریم کو دیکھا۔ وہ ایئرپورٹ کے آخری سرے پر جھکی رن وے پر رینگتے اور ٹرمینل کی طرف جاتے پلین کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے مخاطب کرتا وہ تیزی سے مڑی اور سیڑھیوں کی طرف جاتے لوگوں کے ہجوم میں گھل مل گئی۔ ''کیا یہ بھی کسی کو سی آف کرنے آئی ہے؟''

میرے دل نے پل بھر کے لیے سوچا۔ پھر میں سر جھٹک کر لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ تب ہی کسی نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو میرے محترم استاد پروفیسر صدیقی تھے جو دوران تعلیم مجھ پر خاصے مہربان رہے تھے۔ کچھ دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سب کے متعلق پوچھتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی اہم میٹنگ میں شرکت کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک دم کوئی آ کر اس.....زور سے ٹکرایا کہ گرتے گرتے بچا۔ جھنجلا کر نظریں اٹھائیں تو مریم تھی۔

''ارے تم!''

''پلیز، پلیز ہیلپ می۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے پلیز۔'' اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور خوف کے احساس سے اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

''بات کیا ہے آخر؟'' میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ.....وہ میرے پیچھے پڑے ہیں۔'' اس نے مڑ کر اپنے پیچھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

''کون.....کون ہیں وہ؟'' میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

''وہ.....وہ اسمگلرز.....میں ان کے چنگل میں پھنس گئی ہوں اور مجھے جان کا خطرہ ہے۔''

مارے گھبراہٹ کے اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

''اسمگلر.....مگر تم ان سے کیسے ٹکرائیں۔'' مجھے حیرت تھی۔

''میں.....پلیز ان باتوں کا وقت نہیں۔ مجھے ان سے بچا لیجیے پلیز۔'' اس کا لہجہ ملتجی تھا۔ ایک بار پھر اس نے مڑ کر دیکھا اور ڈر کر میرے بازو سے آ لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم لرز رہا تھا اور وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سہمی جا رہی تھی۔

''گھبراؤ مت۔ حوصلہ رکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس لمحے ایک خاصی معزز خاتون، ایک ویل ڈریسڈ شخص کے ساتھ ہمارے سامنے آ رکیں۔

''ارے پنکی شریر.....'' ویل ڈریسڈ شخص شائستگی سے ہنسا۔ ''تم ہمیں دیکھ کر وہاں سے بھاگ کیوں آئیں؟''

میں نے مریم کی طرف دیکھا جو پیلی پڑ رہی تھی۔

''معاف کیجیے۔'' میں نے مریم کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ آپ کی پنکی نہیں یہ میری بیوی ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں شاید۔''

''مذاق، بھلا میرا آپ سے مذاق کا کیا رشتہ ہی جناب۔'' میرے لہجے میں قدرے درشتی آ گئی۔

''مگر اتنی مشابہت، کچھ غیر یقینی سی لگتی ہے۔'' پہلی بار عورت نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''پنکی!'' مرد پھر مریم سے مخاطب تھا۔

''کہیں یہ تمہاری شرارت تو نہیں ہے بیٹا۔''

''یہ آپ کی پنکی نہیں جناب اور یہ کنفرم بات ہے۔ یہ میری بیوی ثانیا ہے اور ابھی ابھی پلین سے یہاں پہنچی ہے۔'' میں نے مضبوطی سے کہا۔

''اچھا۔'' مرد کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

''معاف کیجیے گا۔ اصل میں ہماری پنکی بالکل ایسی ہے۔ بلکہ ہو بہو یہی۔ بالکل یقین نہیں آ رہا۔ خیر سوری۔'' وہ معذرت کرتے جانے لگے مگر جاتے ہوئے بھی پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔

''چلو ڈیئر۔'' اسے ساتھ لیے میں نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھی اور میں نے گاڑی چلا دی۔

''یقین نہیں آ رہا کہ ایسے مہذب لوگ بھی اسمگلر ہو سکتے ہیں۔''

ایئرپورٹ کی حدود سے باہر آتے ہوئے میں نے کہا۔

''بظاہر کیسے شائستہ لوگ تھے۔ گو عورت کسی قدر رعونت زدہ۔''

''اے خبردار جو انہیں کچھ کہا تو۔'' مریم للکاری۔

''ایں، یعنی کیا مطلب۔'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ وہ میرے پاپا، ماما ہیں۔ اسمگلر نہیں۔'' مریم نے مزے میں آ کر کہا۔

''ماما، پاپا..... مگر وہ تو..... تم تو۔'' مارے حیرت کے میں ہکلا سا گیا۔

''ارے وہ ..... بس یوں ہی ..... انہیں تنگ کرنے کو جی چاہا تھا..... کیسا رہا۔'' وہ محظوظ ہو کر بولی۔

''فنٹاسٹک .....'' میں نے قہقہہ لگایا۔ ''اور اس میں میرا کردار کیسا رہا۔''

''عمدہ.....'' اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔ ''مجھے تم سے ایسی برجستگی کی توقع نہ تھی۔'' اس کے لہجے میں پسندیدگی کی جھلک تھی۔

''تھینک یو.....'' مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ ''بے چارے کیسے پنکی پنکی کر رہے تھے اور جب میں نے کہا یہ ٹانیا ہے میری بیوی تو کیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ سوچتے ہوں گے کتنی مشابہ ہے پنکی سے۔ بے چارے۔'' مجھے ان پر ترس آ رہا تھا۔

''مجھ سے دوستی کرو گے؟'' مریم نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''نہ بابا..... باز آیا ایسی دوستی سے..... ماما، پاپا کو تو بخشی نہیں ہو..... دوستوں کا جانے کیا حشر ہوگا۔''

''نہیں.....'' وہ ہنس پڑی۔ ''کم از کم تمہیں نہیں ستاؤں گی۔''

''کیوں؟'' میں نے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے پوچھا۔

''میرے ساتھ یہ خصوصیت کیوں؟''

''اصل میں تم نے جس طرح سچویشن کو کنٹرول کیا، مجھے اچھا لگا۔ بس ذرا سا شکوہ ہے۔''

میں سمجھ گیا اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ ''ویسے مجھے سوچنے کا موقع ہی کب ملا جو فوری طور پر سوجھا۔ پھر بھی معذرت خواہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

دل میں بے ساختہ خواہش ابھری۔ کاش یہ حقیقت ہوتی۔ تم سچ مچ میری ہوتیں تو..... کیسی انہونی خواہش تھی خوب صورت مگر تمام نہ ہونے والی آرزو۔

''خیر جانے دو۔ اب ایسا کرو فل اسپیڈ پر گاڑی چھوڑ دو۔ اور ماما، پاپا کے پہنچنے سے پہلے مجھے گھر پہنچا دو۔''

''ٹھیک ہے۔ تم گائیڈ کرو۔''

مریم نے گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رکوائی۔ بادامی رنگ کی وہ کوٹھی پھولوں سے گھری ہوئی تھی۔

''دیکھو، مائنڈ نہ کرنا۔ میں تمہیں اس وقت اندر نہیں بلاؤں گی۔ ماما، پاپا آنے والے ہوں گے اور تم ساتھ ہوئے تو پول کھل جائے گا۔''

''اوکے، پھر سہی۔''

میں اسے ڈراپ کر کے چلا آیا۔ راستے بھر میں مریم کی عجیب و غریب فطرت کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کا اچانک مجھ سے ٹکرانا۔ اسمگلروں کی کہانی سنانا اور مدد مانگنا بعد میں یہ انکشاف کہ وہ اس کے ماما، پاپا ہیں۔ یہ سب کس قدر سنسنی خیز اور ناقابل یقین سا لگتا

تھا۔ مریم نے ایسا کیوں کیا۔ میں بار بار سوچتا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ شاید یہ اس کی چلبلی فطرت کا تقاضا ہے۔ میرے ذہن میں خیال آیا۔

پتا نہیں کیوں یہ لڑکی مجھے بہت ناقابلِ فہم اور کچھ پراسراری نظر آرہی تھی۔ مریم جیسی شوخ و چنچل لڑکیاں تو کھلی کتاب ہوتی ہیں مگر مریم کھلی کتاب نہیں تھی۔ اسے سمجھنا بہت مشکل تھا اور میں اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کی خوب صورت آواز بار بار مجھے بلاتی تھی اور روح میں گھر کرتی تھی۔ یوں جیسے کوئی کہیں گم ہوجائے اور کوئی دور سے پکارے۔ بار بار پکارے کہ آؤ مجھے کھوج لو، مجھے ڈھونڈ لو اور پالو۔ اور اس کا معصوم چہرہ میرے جذبات میں ہلچل مچاتا تھا۔ میں اس کھوئی ہوئی لڑکی کو تلاشنا چاہتا تھا۔ اسے پہچاننا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے لگتا تھا کہ یہی میرا گمشدہ حصہ ہے۔ وہ جس کا میری روح طواف کرتی ہے اور دیوانہ وار جس کے گرد چکراتی ہے مگر اسے پہچان نہیں پاتی۔ اس لیے کہ میرے آئینے دھندلے ہیں اور ابھی مجھے صحیح طور پر پہچاننا نہیں آیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو سوسوں پردوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے اور نہ مجھے اسے کھوجنا ہے۔

☆☆☆

اگلی دوپہر اس کا فون آیا۔

''ہیلو فرینڈ، کیا حال ہے میں مریم ہوں۔''

اگر وہ نہ بتاتی تو بھی میں اس کو پہچان گیا تھا۔ اس کی خوب صورت جلترنگ بجاتی آواز ہی اس کی پہچان تھی۔

''مریم..... مگر میرا فون نمبر۔''

''بڑی جستجو کرنا پڑی تب کہیں تم ملے۔ پہلے فرخ کو فون کیا تھا۔''

''تھینکس، کسی نے ڈھونڈا تو.....'' میں نے ممنونیت سے کہا ''ویسے ممی پاپا سے کھینچائی ہوئی؟''

''اوہ نہیں۔'' وہ بے ساختہ ہنسی۔ ''وہ آئے تو میں سلیپنگ ڈریس میں سو رہی تھی۔ بڑے حیران تھے کہ پنکی سے مشابہہ کوئی میری ہمزاد تو نہیں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟'' وہ دوبارہ ہنسی، جیسے کہیں دور چاندی کی گھنٹیاں سی بجیں۔ میں کھو سا گیا۔ اتنی خوب صورتی، ایسا رچاؤ۔ ''میں نے پاپا سے چپکے سے کہا۔ پاپا آپ نے ماما سے خفیہ کہیں کوئی شادی تو نہیں کر رکھی۔ اور وہ میری ہمزاد نہیں میری کوئی بہن ہی تو نہیں۔ پاپا میری شرارت سے بہت ہنسے۔ کیا پتا ایسا ہی ہو۔ وہ بھی محظوظ ہونے لگے۔''

''مگر مریم تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں سنجیدہ ہوگیا۔

''کیا کہوں فرینڈ..... کچھ مت پوچھو۔'' مریم کی جھانجھریں بجاتی آواز اداس ہوگئی۔

''کیوں؟ فرینڈ کہتی ہو اور۔'' میں بے چین ہوگیا۔

''ہاں، فرینڈ کہا ہے نا اس لیے جھوٹ نہ بول سکوں گی اور تمہیں ایک بات بتاؤں۔ اس اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی دوست نہیں۔''

''اور وہ کلب میں جو ڈھیر سارے لوگوں سے تمہاری دوستی.....''

''نہیں کوئی نہیں۔'' اس نے سختی سے تردید کی۔ ''جان پہچان دوستی نہیں ہوتی۔ میں نے کبھی دوست نہیں بنائے۔ میں بھرے ہجوم میں تنہا ہوں۔''

''مریم.....'' اس کے لہجے کی اداسی مجھے بے چین کرگئی۔

''سچ کہہ رہی ہوں فرینڈ، سالوں بعد کسی کو دوست بنانے کو جی چاہا ہے، مگر صرف دوست۔ کوئی غلط مطلب نہ نکال لینا۔''

''مگر مریم یہ سب کچھ..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''تو تم باز نہیں آؤ گے فرینڈ۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''ایئرپورٹ والا واقعہ تمہیں کھٹک رہا ہے۔ ہے نا تو سنو۔ کبھی کبھی میرا ذہن بری طرح منتشر ہونے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں ٹوٹنے

اور بکھرنے کے عمل سے گزر رہی ہوں۔ ایسے میں جو بھی سرزد ہو جائے۔''

اس کی آواز میں ٹوٹے ہوئے کانچ کی کھنک تھی۔ کانچ کے وہ سارے ٹکڑے جیسے میری روح میں اتر گئے۔ اتنی سی لڑکی اور اتنی گہری بات۔ میرے خدا۔ اس کی آواز میں ٹوٹے ہوئے ساغروں کی جھنکار کہاں سے آئی۔ یہ کیسے زخم ہیں جو اس کی آواز میں بول رہے ہیں۔ کون ہے وہ جس نے اسے رہن رکھ دیا۔ کس نے اس ہنستی مسکراتی لڑکی کی آواز کو زخم زخم کر دیا۔

''مریم، مریم تمہیں کیا دکھ ہے مریم۔'' میری آواز میری روح کی پکار بن گئی۔

''دکھ، دکھ تو مجھے کوئی نہیں فرینڈ۔ ماما، پاپا کی اکلوتی اولاد۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ سب..... خیر کب ملو گے۔'' اس نے بات بدل دی۔

''جب بھی موقع ملا، مگر آج نہیں۔''

''اچھا میں انتظار کروں گی..... ملنا ضرور۔''

''اچھا۔''

میں نے وعدہ کر لیا۔ مگر دو تین دن اتنی مصروفیت رہی کہ وہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا اور جب وقت ملا تو مجھے مریم کا خیال آیا۔ مریم کو انتظار ہوگا مگر گھر جانا مجھے مناسب نہ لگا۔ اگر اس کی ممی یا پاپا نے پہچان لیا۔ اور وہ ضرور پہچان لیں گے۔ ابھی ایئرپورٹ والے واقعے کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ میں کلب چلا آیا۔ مگر مجھے مریم کہیں نظر نہ آئی۔

ضروری تو نہیں کہ وہ روز کلب آتی ہو۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ حسن شیراز جو گیمز روم میں بلیئرڈ ٹیبل پر اسٹک پکڑے کسی پارٹنر کے منتظر تھے، مجھے پکارنے لگے تو میں ان کے پاس چلا گیا پھر میں اسی وقت چونکا جب کسی کی خوب صورت ہنسی چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بج اٹھی۔ اسٹک میرے ہاتھوں میں ساکت ہو گئی۔

''بھئی کیا بات ہے کہاں کھو گئے۔'' حسن شیرازی نے ٹوکا۔

''کہیں..... کہیں بھی نہیں۔''

میں نے بوکھلا کر اسٹک اس زور سے ماری کہ گیند اچھل کر میز کی حدود پار کر گیا۔

حسن شیرازی نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے اپنا پورا دھیان کھیل میں لگا دیا۔ مگر حقیقت میں اب میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔

وقفے وقفے سے بلوریں چوڑیوں کی طرح کھنکتی ہنسی مجھے ڈسٹرب کرتی رہی اور میری آنکھیں اسے ڈھونڈنے کو مضطرب ہوتی رہیں مگر میں نے پلکیں نہیں اٹھائیں کہ کہیں حسن شیرازی دوبارہ مجھے ٹوک نہ دیں۔ پھر مریم وہیں آ گئی۔

''ہیلو بڑی مصروفیت ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔ میں نے مضطرب ہو کر پلکیں اٹھائیں مگر کچھ کہا نہیں۔

''اوہ مریم، ہاؤ آر یو۔'' حسن شیرازی نے بال پاس کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''فائن..... اور آپ نے یہ نیا پارٹنر کہاں سے ڈھونڈا۔ کچھ کھیلنا بھی جانتا ہے یا۔'' مریم کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

''یہ تو آپ پارٹنر بنا کر دیکھیں۔ تب ہی جان سکیں گی۔'' میں نے برجستہ کہا۔

حسن شیرازی نے قہقہہ لگایا۔ مریم کچھ جھینپ گئی اور اس کے رخساروں پر شفق دوڑنے لگی۔

''مریم چاہو تو میری جگہ آ جاؤ۔'' حسن شیرازی نے پیش کش کی۔

''اوہ نو، تھینکس.....'' اس نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں نے اسٹک پھینک دی۔

''بس سر..... اب اجازت دیں۔''

میں معذرت کرتا اور ان کی ناراضی کی پروا کیے بغیر وہاں سے ہٹ آیا۔ تب ہی مسز جعفری نے مجھے روک لیا۔ وہ میری خیر و عافیت پوچھ رہی تھیں۔ مریم مسز جعفری کے پاس سے گزرتے ہوئے رک گئی۔

''مسز جعفری آپ اپنے میاں کو پٹا ڈال کر رکھیے۔ بڑے بے لگام ہو رہے ہیں۔''

''مطلب!'' مسز جعفری کا رنگ غصے سے سرخ

پڑ گیا۔

''یہ کہ..... کہیں آپ پچھتائیں نہ۔ بروقت اطلاع دے رہی ہوں۔'' مریم ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

''مریم تو اپنے آپ کو بڑی افلاطون سمجھتی ہو.....'' مسز جعفری اپنے اشتعال پر بمشکل قابو پا رہی تھی۔ ''حالانکہ تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''اس کمپلیمنٹ کا شکریہ۔'' مریم اب بھی مسکرا رہی تھی۔

''مگر میں تو آپ کی ہمدردی میں..... ورنہ مجھے کیا ویسے اگر آپ تھوڑی سی تمیز اپنے میاں کو بھی۔''

''شٹ اپ'' مسز جعفری غصے سے طنطناتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

میں مریم کا ہاتھ پکڑے اسے باہر لے آیا۔ ''مریم تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''ارے چھوڑو میں تو انہیں صرف آگاہ کر رہی تھی۔'' مریم نے معصومیت سے آنکھیں ٹپٹائیں۔

''اور وہ میری ممنون ہیں۔''

''ممنون!'' میں بھونچکا رہ گیا۔ ''وہ غصے میں پھنکاریں مسز جعفری اور ممنون۔''

''بھئی وہ ساری ہیجر مچر تمہاری وجہ سے کر رہی تھیں اور دیکھنا، اب وہ میاں کی لگامیں کھینچے رکھیں گی۔''

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔''

''عجیب چیز ہو۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''عجیب کیوں؟'' اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

''اس لیے کہ کچھ مختلف ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی انفرادیت ہے جو تمہیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔''

''انفرادیت!'' مریم کی چمکتی آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ ''منفرد ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ انفرادیت آدمی کو تنہا کر دیتی ہے۔''

''مگر تم تو تنہا نہیں۔'' میرے ذہن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کی ہنستی مسکراتی قہقہے لگاتی مریم تھی۔

''ہاں!'' وہ بے ساختہ ہنسی۔ ''میرے اردگرد بہت لوگ ہیں۔ خیر تھوڑی دیر کے لیے اس ہنستی مسکراتی ہنگامہ خیز زندگی سے کہیں دور نہ چلیں، اگر تمہارے پاس وقت ہو تو؟''

میرے پاس اس کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ ہم لالہ زار کے ایک پرسکون گوشے میں آ بیٹھے۔

''تم آئے کیوں نہیں۔ مجھے تمہارا بہت انتظار رہا۔'' مریم نے پوچھا۔

''تمہاری ممی، پاپا کے ڈر سے۔'' میں نے سچی بات کہہ دی۔

''اچھا؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''اتنے خوف ناک ہیں میرے ماما، پاپا۔''

ہنسنے میں اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا جو بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہیں..... سلولائیڈ کی گڑیا ہے۔ سوتی جاگتی گڑیا۔ میں دزدیدہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

''کیا بات ہے۔ بڑے چپ ہو؟''

''سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''یہ کہ تم ہو کیا!''

''ارے، یعنی کہ ابھی تک اسی میں الجھے ہو، جب میں ابھی تک خود کو نہیں سمجھ سکی تو تم کیسے؟''

''مگر میں تمہیں سمجھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھو فرینڈ، ایک بات میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''کبھی مجھ سے فلرٹ کی کوشش نہ کرنا۔ میری جوتی کی ہیل بڑی مضبوط ہے اور کئی سروں پر طبلہ بجا چکی ہے۔''

''اس انفارمیشن کا شکریہ۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''مگر میں نہ فلرٹ کر رہا ہوں..... نہ عشق صرف اس دوستی کے ناتے اور دوستی کا ہاتھ خود تم نے میری طرف بڑھایا ہے۔''

''ہاں، اس لیے کہ مجھے ایک ہمنوا کی ضرورت

تھی اور تم مجھے ان سارے لوگوں سے الگ نظر آئے۔'' اس کے لہجے میں ایک دم ہی بہت ساری تھکن اتر آئی۔

''تو پھر مجھے الگ ہی سمجھو۔ ان میں شامل مت کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ہر کوئی جعفری نہیں ہوتا۔''

''جعفری!'' اس کی اداس آنکھیں ایک دم کھلکھلا اٹھیں۔

''یہ شخص بھی عجیب ہے۔ چھے بچوں کا باپ ہے مگر اس کی آنکھیں اب بھی ادھر ادھر منڈلاتی ہیں۔''

''زنجیر کمزور ہو تو آنکھیں پابند نہیں رہتیں۔''

''تمہیں پتا ہے یہ ان کی محبت کی شادی ہے۔''

''محبت۔'' میں دھیرے سے ہنسا۔ ''بعض دفعہ الفاظ وہی ہوتے ہیں مگر مفہوم بدل جاتا ہے۔''

''اچھا!'' مریم نے بغور مجھے دیکھا۔

''ہاں، کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ڈوب جاتے ہیں مگر ڈوبنے نہیں دیتے اور کچھ خود تیرنے کے لیے دوسروں کو ڈبو دیتے ہیں۔''

''اور تمہارا شمار؟'' مریم کی متجسس نظریں مجھ پر تھیں۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''آدمی کی پرکھ بس اسی کسوٹی پر ہوتی ہے۔''

''ہاں کھوٹے کھرے کی پہچان۔'' مریم چپ سی ہو گئی پل بھر وہ اپنی لانبی لانبی خوب صورت انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھتی رہی جن پر پنک کیوٹکس چمک رہی تھی۔ پھر وہ یک لخت ہنس پڑی۔

''سوری!'' اس نے ندامت سے کہا۔

''سوری فرینڈ! میں نے تمہیں غلط سمجھا۔''

''اور غلط بار بار نہیں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا۔''

''بالکل۔'' مریم مسکرائی۔ ''اچھا کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔ مثلاً یہ کہ کتنے بہن بھائی ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''دو بہنیں ہیں۔ ایک بالکل تمہارے جتنی اور ایک منی سی بس گیارہ بارہ سال کی اور ایک بھائی مجھ سے بڑا ہے اور ایک چھوٹا..... اور میری امی ہیں اور ابو ہیں بے حد مہربان بہت محبت کرنے والے اور میری دادی اماں ہیں۔ اتنی شفقت اتنی محبت کرنے والی کہ کیا بتاؤں۔''

''اتنے بہت سارے لوگ ہیں تمہارے گھر میں۔'' مریم کے لہجے میں حسرت بھرا اشتیاق تھا۔

''کتنی پیاری، کتنی مکمل ہے تمہاری فیملی۔ خوب رونق ہوگی۔''

''رونق سی رونق۔ جواد اور مونا اتنے نٹ کھٹ ہیں کہ ہر دم دھما چوکڑی مچائے رکھتے ہیں۔ البتہ بھائی جان اور نینا کے مزاج میں قدرے سنجیدگی ہے۔''

''کبھی ملواؤ نا ان سے۔''

''وہ یہاں کہاں۔ میں تو سروس کے سلسلے میں یہاں ہوں۔''

''اوہ اچھا۔ اب کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔''

''اپنے متعلق۔'' میں ہنس پڑا۔

''کیا بتاؤں۔ جان جاؤ گی رفتہ رفتہ۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' مریم بھی ہنس دی۔

''چلو پھر آئس کریم کھاتے ہیں۔''

''چلو۔''

مریم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پل بھر کے لیے خیال آیا۔ کاش یہ رفاقت دائمی ہوتی۔ پھر مجھے اس احمقانہ خیال پر ہنسی آ گئی۔ مجھے مریم سے ملے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ میں تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا بس صرف اتنا کہ وہ بریگیڈیر واسطی کی بیٹی ہے اور بڑی نٹ کھٹ ہے اور بس..... زندگی گزارنے کے لیے صرف اتنی ہی واقفیت کافی نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی تو جاننا ہی بہت ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اور پھر کئی دن یہی سوچ مجھ پر حاوی رہی۔

بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دوران کئی بار مجھے مریم کا خیال آیا مگر میں اس سے ملنے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ تب اس دن لیفٹیننٹ حسن شیرازی کے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ پر مریم کو دیکھ کر مجھے لگا

جیسے میری روح ایک دم ہلکی ہو کر بادلوں کے سنگ اڑنے لگی ہو یا جیسے کوئی مراد بن مانگے پوری ہوگئی ہو۔

''ہیلو فرینڈ! بڑے دنوں بعد نظر آئے۔'' اس کی آنکھیں مسکرائیں۔

''اچھا..... کیا نظر آنا ہی شرط ہے۔''

''نہیں، مگر آدمی ملتا رہے تو.....''

''ہاں..... رسم دنیا جو ٹھہری مگر میری نظریں تو ہر دم۔'' میں کہتے کہتے رک گیا کہ میری نظریں ہر دم اسے ہی دیکھتی رہیں۔

''کہو چپ کیوں ہوگئے۔'' اس نے بے چینی سے مجھے دیکھا۔

''یہی کہ مجھے کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ہر دم آنکھوں کے سامنے گلستان سا کھلا رہا۔''

''اوہ.....'' اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔ ''باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔ کہاں سے سیکھیں۔''

''کیوں سیکھنے کے لیے کیا چین، جاپان جانا پڑتا ہے۔''

میں خوش دلی سے ہنسا۔ ''اپنے ملک میں حسینوں کی کمی ہے کیا جو شک ہو تو۔'' میں دانستہ چپ ہوگیا۔

''کیا؟'' اس نے پلکیں اٹھائیں۔

''آئینہ دیکھ لینا۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''آئینہ.....'' وہ پل بھر کے لیے بالکل گلابی پڑ گئی۔ ''کیا آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''نہیں..... بشرطیکہ آنکھوں میں کوئی کمی نہ ہو۔''

مریم کا گلابی چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

''تو پھر شاید میری آنکھوں میں ہی کچھ خرابی ہے۔ مجھے تو آئینہ بھی دیوار کی طرح لگتا ہے۔ اندھا، گونگا اور بہرا.....'' اس کی آواز بے حد مدھم ہوگئی۔

''تو کسی سے آنکھیں مستعار لے لو پھر شاید تمہیں گلہ نہ رہے۔''

''آنکھیں۔'' مریم کی پرخیال نگاہیں میرے چہرے پر اٹھیں۔ ''آنکھیں ہی تو نہیں ہیں۔ مجھے تو ساری چیزیں اور سارے لوگ ایک جیسے لگتے ہیں۔ بے اعتبار، کمینے، کم ظرف اور چھچھورے۔''

''کچھ مستثنیٰ بھی ہوتے ہیں۔ بس زاویہ سیدھا ہونا چاہیے۔'' میں نے یقین دلایا۔ ''سارے موسم کبھی ایک سے نہیں ہوتے۔''

''جب تک آدمی اندر سے نہ بدلے، باہر جو بھی موسم ہو کیا فرق پڑتا ہے۔'' مریم نے مایوسی سے کہا۔

''آدمی لاتعلق نہ رہے تو ہر موسم اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔''

''اچھا! دیکھیں گے۔'' مریم مسکرائی۔

''شرط یہ ہے کہ دیکھنے کی طرح دیکھنا۔''

''چلو ٹھیک ہے اور تم بھی ذرا بچ کے رہنا۔ ماما بھی آئی ہوئی ہیں یہاں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''کیوں، تمہاری ماما کیا کھا جائیں گی مجھے؟''

''کیا پتا؟'' وہ ہنسی۔

ایک دم تالیاں بجنے لگیں۔ میں نے چونک کر دیکھا رضوان، مسز شیرازی کی مدد سے کیک کاٹ رہا تھا۔

''ارے۔'' مریم دوڑی۔

میں بھی پپی برتھ ڈے ٹو یو کہنے میں لوگوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ مسز شیرازی کیک کے ٹکڑے کاٹ کر لوگوں کی پلیٹوں میں رکھنے لگیں۔ لوگ ٹیبل پر سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں لینے لگے۔ میں نے پیسٹری پلیٹ میں رکھ کر مریم کو ڈھونڈا۔ مریم کچھ لڑکیوں سے باتوں میں مصروف تھی۔ مجھے فرخ نے اشارے سے بلایا تو میں اس کے پاس چلا گیا۔ حیدر اور سعید بھی وہیں آ گئے۔ پھر اچانک ہال سے آرکسٹرا کی آواز آنے لگی۔ لوگ جوڑوں کی شکل میں ہال میں جانے لگے اور چکنے فرش پر تھرکنے لگے۔ کچھ لوگ باہر آتش بازی دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔

''ہیلو ایوری باڈی۔'' مریم نے قریب آ کر کہا۔

سب نے ہیلو ہیلو کہا۔ مریم نے میری طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر اس وقت حیدر نے بڑی شائستگی سے ایک راؤنڈ لیا اور باہر آتش بازی دیکھنے چلا گیا۔ فضا میں پھلجھڑیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ بچے

تالیاں بجا رہے تھے۔ باہر فضا میں رنگین ستاروں کا رقص تھا اور اندر ہال میں گویا پوری کائنات ہی عالم رقص میں تھی اور میرا دل بھی شاید اندر کہیں ہال میں ہی پڑا تھا۔ میں چپکے سے ہال میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی موسیقی تھم گئی۔ اور رقص کرتے ہوئے جوڑے ساکن ہوگئے۔ ہال پر جیسے سکوت طاری ہوگیا۔ پھر دوسرے راؤنڈ کی موسیقی شروع ہوئی۔ پہلے ڈانس کرنے والے جوڑے باہر جانے لگے مگر مریم، ہیں رہی۔ اب وہ فرخ کے بازوؤں کے سہارے دوسرے راؤنڈ کے لیے قدم اٹھا رہی تھی۔ چند اور جوڑے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ حیدر، عرفان اور سعید کے ساتھ وہیں آ کھڑا ہوا۔ میں دیکھتا رہا۔ راؤنڈ پر راؤنڈ ہوتے رہے پھر چکنے فرش پر صرف مریم ہی رہ گئی۔ اس کے ساتھ جو نوجوان تھا وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں بغور مریم کو دیکھتا رہا۔ پھر تالیوں کی گونج میں، میں نے دیکھا، میرے اردگرد جمع جوان پارٹی مریم کو بیک اپ کر رہی تھی۔ اور مریم وہ جانے کہاں تھی۔ اپنے آپ سے بیگانہ ساری دنیا سے ناآشنا وہ رقص کیے جا رہی تھی۔ نوجوان تھکنے لگا تو کسی اور نے اس کی جگہ لے لی مگر مریم ہوش میں نہیں تھی اور دیوانوں کا ساتھ کوئی کب تک دے سکا ہے۔ دھیرے دھیرے سب حوصلہ ہار گئے۔ صرف مریم تھی جو ناچ رہی تھی پھر اسے احساس ہوگیا کہ فرش پر وہ اکیلی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی نظریں سیدھی مجھ پر پڑیں۔

ڈانسنگ اسٹیپ لے کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کا ساتھ دوں مگر میں نے اس کے ہاتھوں کو سختی سے جکڑ لیا۔

''ہوش میں آؤ مریم۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

تالیوں کی بے پناہ گونج میں صرف مریم ہی میری بات کو سمجھ سکی۔ اس کا بے پناہ سرخ چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

پھر لوگ چاروں طرف سے مریم کے اردگرد جمع ہونے لگے اور اسے اپریشیٹ کرنے لگے۔ اردگرد بے پناہ شور تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ میں نے مریم کے ہاتھ چھوڑ دیے مگر جب سب ڈنر کے لیے جانے لگے تو میں نے مریم کا بازو پھر پکڑ لیا۔

''تمہیں تماشا بننے کا بے حد شوق ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

مریم نے کچھ کہا نہیں۔ بس پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ جیسے میری بات سمجھ نہ سکی ہو۔

''بہت خوش تھیں وہاں مجمع لگا کر۔'' میں نے طنز کیا۔

''کبھی سڑکوں پر کسی شعبدہ باز کو دیکھا ہے جو اپنے پٹارے میں شعبدے نکال نکال کر دکھاتا ہے۔''

''شٹ اپ، تمہیں مجھ پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' مریم غصے سے چلائی۔

''یو آل سو شٹ اپ.....'' میرے ہاتھوں کی گرفت اس کے بازوؤں پر سخت پڑ گئی۔

''تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ اس طرح اپنے آپ کو منوا لو گی؟''

''تمہیں کوئی حق نہیں، تمہیں۔'' مارے غصے کے اس کی آواز گھٹ گئی۔

''مجھے حق پہنچتا تھا اور یہ حق خود تم نے مجھے دیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مگر پھر جب تم ہی اسے تسلیم نہیں کرتیں تو پھر سوری۔'' میں نے اس کے بازو چھوڑ دیے اور تیزی سے باہر چلا آیا۔

''شہریار!'' اس کی گھٹی گھٹی سی آواز مجھے اپنے پیچھے سنائی دی مگر میں ان سنی کر کے فرخ اور حیدر کے گروپ میں شامل ہوگیا جو ڈنر کے لیے جا رہے تھے۔ لوگ کھاتے پیتے رہے مگر مجھ سے کچھ کھایا نہ گیا۔ میں اپنا ہی خون جلاتا رہا۔ مریم نے کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے موقع نہ دیا۔ میں سارا وقت حیدر اور فرخ کے ساتھ ہی رہا۔ اور ڈنر کے فوراً بعد چلا آیا۔ حالاں کہ ڈنر کے بعد کچھ گانوں وغیرہ کا پروگرام تھا لیکن میرا دل اس سارے ہنگامے سے اچاٹ ہو چکا تھا

اور سر میں عجیب سے دھماکے ہو رہے تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''تو کیا میں مریم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ نہیں۔''

میں نے سختی سے تردید کی۔ ''بس یہ ہے کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ کوئی چیز اس میں ایسی ہے جو امپریس کرتی ہے اور اس کی آواز دل میں اتری ہوئی لگتی ہے۔ پھر بھی محبت ..... نہیں محض ہمدردی صرف اتنا کہ میں اسے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس چھوٹی سی معصوم لڑکی کو جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی.....''

فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف مریم تھی۔

''اب بھلا بات کرنے کا کیا جواز ہے مریم؟''

میں نے کچھ سنے بغیر فون رکھ دیا۔

''میں اتنا خفا کیوں ہوں؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مریم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے دخل در معقولات کا۔ مگر میں شاید اپنے آپ کو بہت بڑا حق دار سمجھنے لگا تھا۔

اچھا ہوا جو مریم نے مجھے آئینہ دکھا دیا۔ ورنہ شاید میں اتنا آگے بڑھ جاتا کہ رکنا دشوار ہو جاتا اور مریم کے لیے تو شاید یہ بھی ایک کھیل ہوتا۔

فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

''سنو مریم!'' میں نے ٹیلی فون کی طرف دیکھتے ہوئے ٹن ٹن بجتی گھنٹی کو مخاطب کیا۔ ''سنو مریم! مجھے ڈوری اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا ہے۔ شکر ہے کہ جنون کی منزلیں پھلانگنے سے پہلے ہی خرد نے میرے ہاتھ تھام لیے ہیں۔ سو میں اب اس کی پناہ میں ہوں اور اس کی پناہ میں ہی تحفظ ہے۔''

مگر گھنٹی بجتی رہی۔

''اوہ ہیل اٹ.....'' میں نے غصے سے ریسیور کریڈل سے ہٹا کر میز پر رکھ دیا مگر گھنٹی پھر بھی بجتی رہی۔ میں نے تکیے سے سر اٹھا کر ریسیور کو گھورا۔ مگر ریسیور ٹیبل پر خاموش پڑا تھا۔ پکار رہا تھا۔ آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے اور تکیہ کانوں پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔

صبح سورج کی پہلی کرن نے میری پلکوں پر دستک دی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے میں خالی الذہنی کے عالم میں بستر پر پڑا رہا۔ پھر مجھے کل رات کی واردات یاد آئی۔ مریم کا غصہ سے لال بھبوکا چہرہ.....اور خود میرا اشتعال میں آنا۔

مریم جیسی لڑکی کو چاہنا اور پھر اسے پا لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اس راستے کی طرف کیا دیکھنا جس پر جانا نہ ہو تو مریم.....میری عزیز دوست..... خدا حافظ۔

میں نے دل ہی دل میں الوداع کہا اور پورے خلوص سے اس کی خوشیوں کی دعا مانگی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب ہم زندگی میں نہیں ملیں گے اور اگر ملے بھی تو دو اجنبیوں کی طرح، کبھی سر راہ یا کسی محفل میں اور شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے کترا کر گزر جائیں۔ بغیر ایک دوسرے کو مخاطب کیے۔ اس لمحہ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل کا کوئی گوشہ ہمیشہ کے لیے ویران ہو گیا ہو۔ کبھی نہ آباد ہونے کے لیے۔

☆☆☆

زندگی کے وہی معمولات تھے ہمیشہ کی طرح۔ فلائٹ لیفٹیننٹ حسن شیرازی خصوصی پرواز پر جا رہے تھے اور میں ان کے قریب دوربین لگائے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دوربین لوگوں پر سے گزرتی ہوئی ایک ایسے چہرے پر سے گزری جس پر مجھے مریم کا دھوکا ہوا میں نے اسے فوکس میں لیا تو دیکھ کر وہ مریم ہی تھی۔ وہ ایئرپورٹ کے جنگلے سے ٹکی فضا میں اٹھتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہی تھی .....اس کی اداس آنکھیں کچھ کھوج رہی تھیں۔ جانے کیا۔ سرخ رنگ کے سیاہ پھولوں والے لباس میں اس کا گلابی رنگ دمک رہا تھا۔ گل لالہ..... مجھے یہی تشبیہ سوجھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے لالہ کا پھول کھل رہا تھا۔ میں کھو سا گیا۔

''مریم.....عزیز مریم..... یہ تمہاری آنکھوں میں کیسی تلاش ہے۔ وہ کون ہے جو تمہیں نہیں ملتا۔ جسے تمہاری آنکھیں تلاش کرتی ہیں اور نہیں پاتیں۔''

''شہریار!'' حسن شیرازی مجھے پکار رہے تھے۔

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹالی۔

''شہریار، تم اگلی پرواز پر کب جا رہے ہو۔'' انہوں نے پوچھا۔

''اسی سنڈے۔''

میں نے جواب دے کر دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگالی۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود بھی میں پھر اسے فوکس میں نہ لے سکا۔ تاہم یہ سوال بار بار مجھے کچوکے دیتا رہا کہ وہ ایئرپورٹ پر کیوں آئی ہے؟ میں تیسری بار اسے ایئرپورٹ پر دیکھ رہا تھا۔ وہ کون ہے جو نہیں آ چکتا۔ اسے کس کا انتظار ہے۔ وہ میرا نادیدہ رقیب مگر اب تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ پھر رقابت کیسی۔ میرے اور اس کے درمیان تو صدیوں کے فاصلے ہیں جو شاید ابد تک رہیں پھر مجھے اس نادیدہ شخص کا خیال کیوں ڈنک مار رہا ہے۔ میں اپنا خون کیوں جلا رہا ہوں کیا واقعی میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ نہیں، میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو جھٹلا دیا۔ یہ سب میرا ذہنی فتور ہے شاید جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

تب اس دوپہر شہر کی بھری پری سڑک پر سے گزرتے ہوئے مریم نے گاڑی میرے قریب روک دی۔

''آؤ۔'' اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے نظریں اٹھائیں اور مریم کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

چند لمحے یوں ہی گزر گئے، میرا جی چاہا میں چپکے سے آگے بڑھ جاؤں اور وہ یوں ہی دروازہ کھولے دیکھتی رہ جائے مگر اس کی آنکھوں میں التجا تھی اور وہ اتنی اداس ہو رہی تھی کہ میں کچھ کہے بنا یوں بیٹھ گیا گویا اس کا منتظر تھا۔

مریم نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''بہت خفا ہو۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''خفا تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں کہ.....''

''مگر میں نے تمہیں فرینڈ کہا ہے۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''کہا ہے نا..... سمجھا نہیں۔''

''معاف نہیں کرو گے۔''

''جب خفگی نہیں ہے تو معافی کیسی۔'' میں نے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''سنو فرینڈ۔''

''نہیں۔'' میں نے مڑ کر اسے ٹوکا۔

''یہ اعزاز تو تم نے مجھ سے بہت پہلے خود ہی چھین لیا تھا۔'' اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ میرا سر ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے ہذیانی انداز میں میرے ہاتھ تھام لیے۔

''شہریار، تم مجھے مار لو، خفا ہو لو، ڈانٹ لو، مگر مجھ سے اپنا آپ مت کھینچو۔ مجھے اپنے دوست سے محروم نہ کرو۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ مگر میں چپ رہا۔

''تم لڑکی ہو۔ لڑکیوں سے ہی دوستی کرو۔ اپنے جیسی اچھی اچھی لڑکیوں سے۔'' بالآخر میں نے نرمی سے مشورہ دیا۔

''اس سارے شہر میں ایک تم ہی مجھے ہم زبان ملے۔''

''اور میری ہی زبان تم کاٹنا چاہتی ہو۔'' میرا لہجہ خود بخود کٹیلا ہو گیا۔

''نہیں، مگر مجھے خود پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت میں کیا کر بیٹھوں گی۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''کیا تم نظر انداز نہیں کر سکتے؟ میری اوٹ پٹانگ حرکات اور الٹی سیدھی باتوں کو۔ یوں سمجھ لو کہ کبھی کبھی میرا دماغ الٹ جاتا ہے۔ پھر میں اپنے بس میں نہیں رہتی۔ بس ایسے وقت.....''

تو اس کی نظروں میں میری اہمیت اتنی ہی تھی..... سایہ، دیوار یا کوئی بے جان پتھر، جس سے وہ پل دو پل کو ٹیک لگا لے اور جو بس چپ چاپ سنتا رہے، دیکھتا رہے اور کچھ نہ کہے۔

''پتھر میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں مریم!'' میں نے درشتگی سے کہا۔

''جانتی ہوں مگر پلیز لیوڈس ٹاپک میں تم سے

معافی مانگتی ہوں۔''

میں چپ ہوگیا۔ وہ جانے کہاں لیے جارہی تھی۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ دونوں ہی اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے خاموش تھے۔

''یہ میرا گھر ہے۔'' اس نے گاڑی گیٹ کے اندر جا کر روک دی۔ بلکہ گھر کہاں، مکان۔ گھر تو آدمیوں سے ہوتا ہے۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''تو کیا یہاں جن بھوت اور آسیب رہتے ہیں۔ آدمی نہیں۔'' میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں ان چاروں دیواروں کے پیچھے قید ہوں۔''

مریم تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر گر پڑی۔

''تو.....'' میں اسے دیکھتا رہا۔ آدمی زندگی بھر قید ہی تو رہتا ہے۔ کبھی اپنا کبھی دوسروں کا اور اب وہ مجھے ان دیواروں کے پیچھے لے آئی تھی۔ شاید قید کرنے کے لیے حالاں کہ میں تو پہلے ہی اسیر تھا۔

مریم نے ملازم کو کافی کے لیے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مریم کے ماما، پاپا کہاں ہیں اور کیا وہ اب بھی مجھے پہچان لیں گے، اتنے دنوں بعد۔

''ماما، پاپا کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔'' مریم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور اگر وہ ابھی آ گئے تو تمہیں پہچانیں گے نہیں۔''

''ارے!'' پل بھر کے لیے میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ مریم کو میرے دل کی بات کا کیسے پتا چلا۔

''ماما کو سوشل ویلفیئر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں اور پاپا..... وہ اپنے دوستوں میں مصروف رہتے ہیں۔'' مریم نے گہری سانس لی۔ ''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ مکان اپنے مکینوں کو ترستا ہے۔''

میں خاموشی سے اسے کافی بناتے دیکھتا رہا۔ مریم بھی کہیں گم تھی۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں دور نکل جاؤں۔ ان سارے لوگوں، ہنگاموں اور پاؤ ہو سے دور..... کسی اجنبی جگہ۔'' مریم کھوئی کھوئی سی تھی۔

اور کسی اجنبی شخص کے سامنے جو مجھے نہ جانتا ہو اور جو مجھے پھر کبھی نہ ملے۔ اپنا آپ کھول کر رکھ دوں اور اس سے کہوں۔ اجنبی مسافر..... میں رونا چاہتی ہوں اس لیے کہ میں ہنستے ہنستے اور فضول قہقہے لگاتے تھک چکی ہوں اور پھر خوب آنسو بہاؤں۔ اتنے کہ میرے اندر کوئی آنسو نہ رہے اور اپنے دل کی ہر بات اور ہر دکھ کہہ دوں اور جب میرے آنسو ختم ہو جائیں تو میں لوٹ آؤں اپنی دنیا میں..... جہاں لوگ کبھی نہ جان سکیں کہ یہ ہنستی مسکراتی قہقہے لگاتی لڑکی اپنے اندر کتنے آنسو چھپائے پھرتی تھی اور میں زندگی بھر اس اجنبی کی ممنون رہوں جس نے مجھے رونے کا حوصلہ دیا۔''

مریم تھک کر چپ ہوگئی۔ اس کے سامنے رکھی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور صوفے کے کناروں کو پکڑے اس کی انگلیاں سفید پڑ چکی تھیں اور اس کے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

''تو مریم تمہیں رونے کے لیے کندھا چاہیے مگر میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ آؤ اور میرے کندھوں پر سر رکھ کر رو لو۔ اس لیے کہ تمہارے سارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں اور تم چھوٹی سی جذباتی لڑکی۔ شاید تم مجھے وہی اجنبی سمجھ رہی ہو جس کے سامنے تم اپنا سارا بوجھ الٹ دینا چاہتی ہو اور میں شاید ہمیشہ اجنبی ہی رہوں۔ پھر بھی میری کبھی دوست..... میں تمہیں اس اذیت سے ضرور نکالوں گا۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیا دکھ ہے۔ مجھے بتاؤ.....''

میری آنکھیں سوال کر رہی تھیں مگر میرے ہونٹ خاموش تھے۔ شاید میں ابھی اندر سے بہت خفا تھا۔ بہت ناراض تھا۔ اس لیے کہ وہ اتنی ذہین ایسی خوب صورت باتیں کرنے والی لڑکی..... میرے اندر نہ جھانک سکی۔

کیوں مجھے اس لیے ایک دیوار سے زیادہ اہمیت نہ دی۔

''تم چپ کیوں ہو فرینڈ۔''

مریم شاید اپنے آپ میں آ گئی تھی۔ اس لیے اس کی آنکھیں خیالوں کا بوجھ جھٹک کر میری طرف نگران تھیں۔

''دیواریں بھی کبھی بولی ہیں۔''

غیر ارادی طور پر ایک نوکیلا جملہ میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا اور میں خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہو گیا۔

مریم کی آنکھیں مکمل طور پر کھل گئیں۔

''تو تم ابھی تک خفا ہو۔ بتاؤ میں اب کیا کروں۔ تمہارے پاؤں پر سر رکھ دوں یا اپنا سر پھوڑ ڈالوں۔''

''اپنا کیوں، دیوانہ تو میں ہوں۔''

''تمہارا سر خاصا مضبوط لگتا ہے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے میرے سر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''مگر میں نے بھی جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ لی ہے دھیان رہے۔''

''گویا سر توڑنے کے امکانات زیر غور ہیں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''میرے لیے تو ایک پھول بھی کافی ہوگا۔''

''شکر ہے تم ہنسے تو۔'' مریم نے طمانیت سے کہا۔ ''اب تو خفا نہیں ہونا۔''

''ایک شرط پر۔''

''کیا.....؟''

''بس اتنا بتا دو کہ تم ایئر پورٹ کیوں جاتی ہو۔ میں نے بارہا تمہیں وہاں دیکھا۔ ابھی دو دن پہلے بھی .....'' میں نے بغور اسے دیکھا۔

''ایئر پورٹ.....'' اس نے پرخیال نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے جہازوں اور ایئر پورٹ اور اس سارے ماحول سے بڑی دلچسپی ہے۔ بچپن میں جب پاپا باہر جاتے تھے اور ماما گھر سے باہر مصروف ہوتیں تو میں ضد کر کے نوکر کے ساتھ یہاں آ جاتی تھی۔ اور ہر روز یہاں کھڑے ہو کر پاپا کا انتظار کرتی۔ پھر یہ سارا ماحول میری روح کے اندر رچ بس گیا اور اب جب کہ پاپا یہیں ہیں۔ اب بھی شاید میرا انتظار ختم نہیں ہوا۔ میں تقریباً روز ہی وہاں جاتی ہوں اور جہازوں کو رینگتے ہوئے اور ٹرمینل کی طرف جاتے ہوئے اور پرواز کرتے ہوئے دیکھتی رہتی ہوں۔ اور مجھے لگتا ہے جیسے یہ کوئی حقیقی منظر نہ ہو۔ بلکہ ایک وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی کوئی بڑی سی تصویر ہو اور سارے چلتے پھرتے لوگ اور جہاز سب اس تصویر کا حصہ ہوں اور اس تصویر کے باہر صرف ایک ذی روح ہو۔ میں جو اس تصویر کو دیکھ رہی ہوں۔ اکیلی اور تنہا۔'' مریم نے خاموش ہو کر مجھے دیکھا۔

''کیا تم نے بھی کبھی کینوس کے باہر کھڑے ہو کر دیکھا ہے۔ کبھی محسوس کیا ہے کہ الگ کھڑے ہو کر ساری دنیا کو دیکھنا کیسا لگتا ہے۔''

''تم بتاؤ۔ میں اسے بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔''

''میں، مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے ساری دنیا آوازوں سے اور لوگوں سے خالی ہو گئی ہو اور جیسے زندگی دور کہیں مر رہی ہو۔''

''تم کینوس کے اندر کھڑے ہو کر دیکھا کرو پھر تمہیں دنیا خالی نظر نہیں آئے گی۔''

''جب خالی پن انسان کے اندر ہو تو کیا اندر اور کیا باہر ساری جگہیں ایک سی ہیں۔''

''تمہیں اپنے اندر جھانکنے سے فرصت ملے تو کبھی دوسروں کو بھی دیکھ لینا۔ پھر تمہارے اندر کوئی خالی پن نہ رہے گا۔''

''دوسرے..... جب میرے اپنوں نے مجھے نہ سمجھا تو دوسرے کیا کریں گے۔''

اسے شاید ماما، پاپا سے شکایت تھی۔

''تو اس دن تم نے ماما پاپا کو پہچاننے سے انکار کیوں کیا تھا۔''

میں نے اسے ایئر پورٹ والا واقعہ یاد دلایا۔

''اس دن۔'' اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

''اس دن ماما، پاپا فرانس سے آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں خواہ مخواہ بے چارے خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ میں انہیں ریسیو کرنے آئی ہوں۔ یا یہ کہ مجھے ان کا انتظار ہے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہیں اپنے آپ کو چھپا چھپا کر رکھنے کا بہت شوق ہے۔ کتنے پرت ہیں جو تم نے اپنی شخصیت پر چڑھا رکھے ہیں۔ کبھی سوچا تم نے.....''

''سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ کھلکھلا

کر ہنسی۔

''سوچنے کے لیے تو دماغ چاہیے۔''

''ہاں..... اور یہی تو تمہارے پاس نہیں۔'' میرے ہونٹ متبسم ہوگئے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔

''آؤ تمہیں اپنی دنیا کی ایک جھلک دکھاؤں۔''

وہ مجھے کوٹھی کے پیچھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔

''یہ میرا نگارخانہ ہے۔'' اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔

وہاں چاروں طرف تصویریں تھیں۔ پھولوں اور تتلیوں کی اور خوب صورت مناظر کی..... جھیلوں اور جھرنوں کی..... موتی اچھالتے فواروں کی ایئرپورٹ کی پرواز کرتے جہازوں کی اور ان سب تصویروں میں ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ پھولوں میں گھری ہوئی اور تتلیوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی اور خوب صورت مناظر کے درمیان بیٹھی ہوئی تنہا اور اداس لڑکی۔ ہر تصویر میں لڑکی کی اداس آنکھیں بڑی واضح تھیں۔

''اردگرد کتنی ہی خوب صورتی، پھول، تتلیاں اور رنگ کیوں نہ ہوں۔ ایک ہمنوا کے بغیر سب بیکار ہے۔'' مریم نے کہا۔

میں بچی کی اداس آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ یہ بچی مریم سے کس قدر مشابہہ ہے۔ مریم کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا۔

''یہ تصاویر تو ابتدائی دور کی ہیں۔ ادھر دیکھو۔''

اس نے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا اور واقعی یہ تصویریں ایسی تھیں جو فنی اعتبار سے یقیناً اہمیت رکھتی تھیں۔ پتھر کوٹتے مزدور اور بھیک مانگتے فقیر..... اندھی بھکارن اور جان بلب آدمی۔ تنہائی ..... انتظار..... بھوک..... خوف..... محبت اور نفرت کی تصویریں۔ پھر میں ایک تصویر کے سامنے ٹھٹک گیا۔ یہ خود مریم تھی۔ گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی مریم۔ جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں موٹی موٹی زنجیریں تھیں۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تھے۔ اور آسمان کی طرف تکتی نگاہیں، لبریز تھیں اور عنوان تھا ''انتظار۔''

''ہر آدمی کسی نہ کسی زنجیر میں بندھا ہوتا ہے۔'' مریم نے آہستہ سے کہا۔ ''اور میری طرح نجات کا منتظر۔''

''تم اپنے خول سے باہر نکلو تو شاید تمہیں نجات مل جائے۔''

عجیب سے تاثر میں ڈوبے ڈوبے میں نے کہا۔

''اس خول کے اندر ہی میرے لیے امان ہے۔'' مریم نے جواب دیا۔

میں اگلی تصویر دیکھنے لگا۔ یہ تصویر بھی مریم کی تھی مگر کیسی..... پل بھر کے لیے میں کانپ سا گیا۔ آنکھوں کی جگہ سیاہ گڑھے تھے اور سارا جسم زخموں سے چور، زخموں سے خون ابل رہا تھا اور پس منظر میں بہت سارے لوگ ہاتھوں میں پتھر لیے اس پر پھینک رہے تھے۔

''تم بہت اذیت پسند ہو۔'' میں نے بلبلا کر کہا۔ ''مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تصویروں میں تمہارا فن اپنے عروج پر ہے۔''

''شکریہ دونوں ریمارکس کا..... اور اب ادھر آؤ۔ ایک نیا کرشمہ۔''

وہ مجھے ایک نسبتاً تاریک گوشے میں لے آئی اور کوئی بٹن دبایا۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا۔ میں ایک دفعہ پھر ششدر رہ گیا۔

بہت سارے شوخ چیختے چلاتے رنگ۔ مبہم سے خاکے اور بے احتیاطی سے کھینچی ہوئی لکیریں ..... ہر تصویر میں بے ترتیبی اور عدم توازن کا احساس ہوتا تھا۔

''کچھ سمجھے.....'' مریم کے لبوں پر بڑا دلآویز تبسم تھا۔

''یہ تصویریں تمہاری نہیں۔'' میں نے بڑے یقین سے کہا۔ مریم کے ابتدائی دور کی تصاویر بھی ایک نفیس ذوق اور خوب صورت توازن کا احساس دلاتی تھیں۔

''تصاویر تو میں نے ہی بنائی ہیں۔'' مریم کی مسکراتی نگاہوں میں چیلنج تھا۔

''تو.....'' میں نے ایک بار پھر ان چیختے چلاتے بے ترتیب رنگوں کو دیکھا۔ سارے رنگ جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''یہ تصویریں کسی بیمار ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔'' میں نے قیافہ لگایا۔

مریم کی آنکھیں پل بھر کے لیے حیران ہوئیں پھر وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ''تم ہمیشہ اپنا آپ منوا لیتے ہو۔ کاش میں بھی تمہاری طرح پاور فل ہوتی۔''

''تمہارے اندر بہت پاور ہے مگر تم آگاہ نہیں۔'' میں نے اس کی مقناطیسی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیر تم ان تصویروں کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''یہ تصویریں میں نے بیماری کے دنوں میں بنائی تھیں۔ مریم کا چہرہ کسی تکلیف دہ خیال سے سفید پڑ گیا۔'' ان دنوں جب میں ساری دنیا سے بیزار تھی۔''

''اسی لیے...... ان میں کچھ عجیب سا بھدا پن اور الجھاؤ ہے۔'' میں نے سوچا۔ وہی الجھاؤ جو ان دنوں مریم کو الجھا رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں نے تصویریں نہ دیکھی ہوں۔ مریم کی زندگی کے سارے دور دیکھ لیے ہوں۔ جیسے میں اسے پرت پرت تہ در تہ دریافت کر رہا ہوں۔

''سنو مریم...... میں تمہیں دریافت کرنا چاہتا ہوں اور میں تمہیں دریافت کر کے رہوں گا۔ خواہ مجھے کتنی ہی مسافت طے کرنا پڑے۔'' میں نے دل ہی دل میں عہد کیا مگر اس سے کچھ نہ کہا۔ میں جانتا تھا وہ کہے گی۔

''تم مجھے کیا دریافت کرو گے فرینڈ...... ابھی تو میں ہی خود کو دریافت نہیں کر سکی۔''

''کیا سوچ رہے ہو......؟'' مریم نے نگار خانے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''میں...... جوڈو کراٹے اور مصوری میں مطابقت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ ایک جوڈو کراٹے کی ماہرا تنے نازک فن میں بھی دسترس رکھتی ہے۔''

''بہت شوق پال رکھے ہیں میں نے۔ کس کس پر حیران ہو گے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''یعنی اور بھی......'' میں نے حیرت ظاہر کرنے کے لیے آنکھیں پھاڑیں۔

''ہاں...... Master of none Jeck of all Trades but۔''

''نہیں یہ تو نہ کہو۔'' میری نظروں میں اس کے حسین فن پارے تھے۔ ''ماسٹر تو خیر تم ہو۔''

''تمہاری نظروں میں......'' وہ مسکرائی۔

''پاپا سے ملو گے۔ اب تک آ چکے ہوں گے۔''

''نہیں پھر کبھی سہی...... میں تو بڑے ضروری کام کے لیے نکلا تھا کہ تم مجھے بیچ راستے سے اغوا کر لائیں۔ اب اجازت دو۔''

''دیکھو...... وعدہ کرو کبھی مجھ سے خفا نہ ہو گے۔ میری اوٹ پٹانگ حرکات اور الٹی سیدھی باتوں پر۔''

''اور تم باز نہیں آؤ گی اپنی اوٹ پٹانگ حرکات سے۔'' میں نے اسے گھورا۔

''بتایا تو ہے نا...... کبھی کبھی میں آؤٹ آف آرڈر ہو جاتی ہوں۔ تب خود پر سے کنٹرول مکمل طور پر اٹھ جاتا ہے۔''

''تو مریم ڈیئر...... آؤٹ آف آرڈر تو میں بھی ہو سکتا ہوں نا، کبھی کبھی آدمی اپنے بس میں نہیں رہتا۔ تاہم کوشش کروں گا۔''

''اور یہ وعدہ بھی کہ ملتے رہو گے۔''

''اچھا۔''

میں نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہا۔ بہت دور سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ وہ ابھی تک گیٹ پر کھڑی تھی۔ میں مسکرایا اور ہاتھ ہلاتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شام سرمئی پہاڑوں پر اپنا آنچل پھیلا رہی تھی اور میرا گھوڑا جانے پہچانے راستوں پر سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے شروع سے ہی گھوڑے پر سواری کرنا اچھا لگتا تھا۔ اور جب میرا جی چاہتا میں گھوڑا لے کر ان پہاڑوں کی طرف نکل آتا۔ گھوڑا دوڑتے ہانپنے لگا تو میں نے رفتار دھیمی کر دی اور اردگرد کے خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس وقت مجھے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ

کون ہوسکتا ہے کہ گھڑسوار تیر کی طرح سنسناتا میرے قریب سے گزر گیا۔ میں نے سنبھل کر دیکھا وہ بلیو جینز اور سرخ اسپورٹس شرٹ میں ملبوس لڑکی تھی۔

''ارے واہ..... بڑا گھمنڈ ہے شہ سواری پر.....''

میں نے گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا اور لمحوں میں ہی اسے جالیا۔ اب اس کا گھوڑا ایک تنگ سی گزرگاہ پر دوڑ رہا تھا۔ وہ بائیں سرے پر تھی اور دائیں طرف گہرے گہرے کھڈ تھے۔ پل بھر کے لیے میں نے سوچا..... اور اگلے ہی لمحے دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی..... مگر خیر گزری اس نے گھوڑا روکا نہیں۔ میرا دھیان بھی پوری طرح گھوڑے کی طرف تھا۔ گھوڑے کے پاؤں سڑک کے انتہائی سرے پر پڑ رہے تھے۔ اگر ذرا سا پاؤں رپٹ جاتا تو گھوڑے اور سوار دونوں کے مقدر میں سیکڑوں فٹ نیچے گہرائیوں میں سسکتی ہوئی موت تھی۔ گزرگاہ عبور کرتے ہی دونوں نے یک دم لگامیں کھینچی تھیں اور اس وقت میں نے دیکھا وہ مریم تھی۔

''تو یہ تم ہو فرینڈ.....'' مریم کا گلابی چہرہ پسینے میں ڈوب رہا تھا۔

''میں بھی سوچ رہا تھا۔ یہ سر پھری لڑکی کون ہوسکتی ہے۔ میں نے اسے گھورا۔

''جو گھوڑا بھڑک جاتا تو.....'' مریم کا چہرہ ابھی تک سپید پڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوتا..... ہڈیاں سرمہ بن جاتیں بس۔'' میں نے لاپروائی ظاہر کی۔

''ضرورت کیا تھی اتنی تنگ جگہ سے گھوڑا نکالنے کی۔'' مریم نے خفگی سے دیکھا۔

''تم نے خود ہی تو چیلنج کیا تھا۔ طیش دلا کر بھاگ آئیں۔''

''سر پھرے تم بھی کچھ کم نہیں۔'' اس نے گھوڑے سے چھلانگ لگا کر لگام تھام لی۔ ''مجھے سوچ لینا چاہیے تھا اس علاقے میں رائیڈنگ کرنے والا کوئی معمولی سوار نہیں ہوسکتا۔''

''یعنی بالواسطہ اپنی ہی تعریف ہو رہی ہے۔''

مریم دھیرے سے ہنسی۔ اس کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی تھی۔ گھوڑے دیودار کے تنے سے باندھ کر ہم صنوبر اور چنار کے درختوں کے پاس گزرتے ہوئے ایک خوب صورت سبزہ زار میں پہنچے جہاں چاروں طرف رنگارنگ پھولوں کی بہار تھی۔

''یہاں بیٹھتے ہیں۔'' مریم نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے قریب ہی ایک دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔

''کتنی بے پناہ خوب صورتی ہے۔'' میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ چٹانوں سے نکلتے ہوئے جھرنے کے اردگرد لاتعداد لالے کے پھول کھل رہے تھے۔ منظر کچھ جانا پہچانا لگا۔ پھر یاد آیا۔ اس جگہ کی تصویر میں نے مریم کے نگارخانے میں دیکھی تھی۔

''مریم..... ایک بار تمہیں دیکھ کر مجھے لالے کا خیال آیا تھا۔'' مجھے یاد آیا۔

''اچھا کب.....'' مریم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بہت دن ہوئے۔ تم ایئرپورٹ پر ریلنگ سے لگی کھڑی تھیں۔ بڑے بڑے سیاہ پھولوں والا سرخ لباس پہنے۔ جیسے کہیں کوئی لالے کا پھول اچانک ہی اگ آئے اور حیران کردے۔ بالکل چٹانوں سے جھانکتے ہوئے اس لالے کی طرح۔''

''یہ بھی دیکھا ہے کہ لالے کے سینے میں کتنے داغ ہوتے ہیں.....؟''

''داغ تو چاند کے سینے میں بھی ہوتے ہیں۔ پھر کیا اس کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ داغ نہیں چراغ ہیں جو جل کر روشنی دیتے ہیں۔''

''لگتا ہے ماحول کا حسن تم پر جادو کر گیا۔ اب بیٹھے شاعری کرتے رہو۔'' مریم نے ہنس کر کہا۔

''ماحول بھی حسین ہو اور ہم نشین بھی تو اثر تو ہو ہی جاتا ہے۔'' میں نے دزدیدہ نظروں سے اسے گھورا۔

''تو واقعی اثر ہوگیا ہے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ میں اس کی شرارت سمجھ کر ہنس دیا۔ اس

نے چہرہ اٹھا کر گہری ہوتی شام کو دیکھا۔

"اب چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی با دل نخواستہ اٹھا۔

"یہ بتاؤ مریم! یہ تم نے رائیڈنگ کہاں سے سیکھی۔"

"رائیڈنگ اور سوئمنگ میں نے اسکول ہی میں سیکھی۔ ویسے پاپا بہت اچھے شہ سوار ہیں اور ہمیشہ ہی دو تین گھوڑے ان کے پاس رہے۔"

میں نے گھوڑے کھولتے ہوئے مریم کے سفید گھوڑے کو تحسین بھری نگاہوں سے دیکھا۔ گھوڑا بے حد خوب صورت تھا۔ سفید رنگ پر سیاہی مائل جامنی رنگ کے شیڈ بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔ انگ انگ میں جیسے بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ توانائی اور خوب صورتی کا بہترین امتزاج۔

"بے حد شاندار گھوڑا ہے۔" میں نے اسے تھپکی دیتے ہوئے بے ساختہ تعریف کی۔

"سوار بھی کچھ کم نہیں۔" مریم نے قہقہہ لگایا اور گھوڑا دوڑانے لگی۔ میرے ہونٹ مسکرا اٹھے اور میرا گھوڑا بھی اس کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔ سرمئی پہاڑیوں کو عبور کر کے ہمارے گھوڑے میدانی علاقے میں پہنچے تو مریم نے گھوڑا روک لیا۔

"اچھا بھئی خدا حافظ۔ تمہارے ساتھ وقت اچھا گزرا۔" مریم کے مسرور چہرے پر خوب صورت سی چمک تھی۔

"میرے ساتھ تو ہمیشہ وقت اچھا ہی گزرے گا۔ تم موقع تو دو۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"دیکھو فرینڈ زیادتی کر رہے ہو۔ پھر شکایت کرو گے۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔"

"سوری......" میں سنجیدہ ہو گیا۔

"چلو گی غریب خانے پر۔" میں نے درختوں میں گھرے سرمئی بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ "چائے کا ایک کپ پینا چاہو تو...... ہمیشہ کے لیے نہیں۔" میں پھر طنز کر گیا۔ مریم کا رنگ ذرا سا بدلہ۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا۔

"یہ کپ ادھار رہا۔ پھر سہی بائے۔" وہ گھوڑا دوڑاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

زندگی بے حد خوب صورت ہو گئی۔ پھولوں اور خوب صورت مناظر کی معیت میں مریم سے باتیں کرتے ہوئے اور سرمئی پہاڑیوں میں گھومتے ہوئے۔ کلبوں میں اور ریسٹورانوں میں ہنستے مسکراتے دن تیزی سے گزرنے لگے۔ ہاں کبھی کبھی مریم پر ہمیشہ کی طرح ڈپریشن کا دورہ پڑتا اور وہ اداس ہو جاتی۔ ایسے میں اوٹ پٹانگ حرکات کر کے خوب ہنسا کرتی۔ کسی راہ چلتے کو منہ چڑا دیا۔ کسی کو ٹانگ اڑا کر گرا دیتی۔ کسی کے ہاتھ سے آئس کریم کا کپ چھین کر کھا لیا یا سامنے آنے والے سے خواہ مخواہ الجھ پڑی...... یا پھر کسی کو بے وقوف بنا کر خوش ہو لی۔ اور کچھ نہیں تو گاڑی انتہائی رفتار پر سڑکوں پر دوڑائے پھرتی۔ اس دن بھی وہ اسی موڈ میں تھی اور پیدل ہی چٹانوں اور پہاڑیوں میں چکراتی پھر رہی تھی۔

"آخر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔" تنگ آ کر میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

"میں خود نہیں جانتی۔" وہ بار بار سامنے ابھری ہوئی اونچی سی چٹان کو دیکھ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا...... کبھی کبھی مجھ پر دورہ سا پڑتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں سارے ہنگاموں سے دور کہیں ویرانوں میں نکل جاؤں۔ کسی اجنبی جگہ جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔" وہ بہت مضمحل ہو رہی تھی۔

"ہاں اور اب تو کسی اجنبی مسافر کی منتظر ہو جس سے تم اپنا دکھ درد کہہ سکو۔" میرے ہونٹ تلخی سے مسکرائے۔

"تخیلاتی لڑکیوں کی طرح تخیلاتی محبوب کی منتظر۔ جسے تمہاری نظریں کبھی نہ چھو سکیں۔"

"نہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اب مجھے

کسی اجنبی کا انتظار نہیں رہا۔"
"ریلی۔"
"ہاں...... تب میرا کوئی نہیں تھا اور اب میں تم تک دل کی ہر بات منتقل کر سکتی ہوں۔ کیوں کہ تم بہترین امین ہو اور تم ہی وہ واحد شخص ہو جس سے میں سب کچھ کہہ سکتی ہوں۔" ایک دم میرے دل کے اندر کہیں بہت سارے پھول کھل اٹھے۔

"تو اب تمہیں بے چینی کیا ہے۔" میں نے اسے بغور دیکھا۔

"بے چینی۔" اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ "میں سچ کہتی ہوں، مجھے خود پتا نہیں۔ لیکن کوئی چیز ہے جو میرے دل کو اندر ہی اندر چھیلے جاتی ہے اور مجھے پوری طرح خوش نہیں ہونے دیتی۔ لگتا ہے جیسے میرے اندر بھی خلا ہے اور باہر بھی اور میں اس خلا کے بیچ لٹک رہی ہوں اور میرا جی رونے کو چاہتا ہے۔"

"تو تم روتی کیوں نہیں مریم۔" میں نے نرمی سے مریم کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایک بار کھل کر رو دو۔ پھر شاید یہ حبس نہ رہے۔"

"میرے آنسو کہیں گم ہو گئے ہیں فرینڈ۔" اس نے خشک آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں مگر مجھے چاروں طرف آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی ہیں گھورتی ہوئی۔ مضحکہ اڑاتی ہوئی۔ کھوج لگاتی آنکھیں اور ان اتنی ساری نگران آنکھوں سے ڈر کر میرے آنسو دبک جاتے ہیں۔"

"یہ صرف تمہاری اپنی آنکھیں ہیں جو تمہاری نگران ہیں مریم اور اپنی آنکھیں تو رازداں ہوتی ہیں۔"

"اور مجھے لگتا ہے فرینڈ۔" میرے ہاتھ میں رکھا اس کا ہاتھ کانپ اٹھا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے میں توازن کھو رہی ہوں۔ جیسے میں پاگل ہو رہی ہوں۔" اس نے یک دم میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے پاگل ہونے سے بچالو فرینڈ۔ میں پاگل نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے بچالو۔" اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔

"مجھے بچالو فرینڈ...... مجھے پاگل ہونے سے بچالو۔" وہ لرز رہی تھی اور تکرار کیے جا رہی تھی۔

"مریم مریم۔" میں برابر اسے تسلی دے رہا تھا۔ اسے پکار رہا تھا۔ نرمی سے تھپک رہا تھا مگر وہ جیسے ہوش و خرد کی ساری منزلیں پھلانگنے پر تلی ہوئی تھی۔ پھر یک دم اس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"مریم میری عزیز دوست۔" میں نے مریم کے لرزتے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"تم بے توازن نہیں ہوئیں۔ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تمہارے اندر کا خوف۔ دیکھو تو تمہارے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے ہیں اور تمہیں اپنے اوپر مکمل کنٹرول ہے۔ تمہارا شعور کبھی تمہیں بے توازن نہیں ہونے دے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم یوں لرز نہ رہی ہوتیں۔"

مریم کے جسم پر طاری لرزہ دھیرے دھیرے دور ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور جھینپی جھینپی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"ہاں ٹھیک تو تم ہمیشہ سے ہی ہو...... بلکہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو۔" میں نے اسے ہنسانے کے لیے شوخی سے کہا۔

"اور یہ بیہودہ وہم تمہیں کیسے ہوا؟ تم تو پاگل بنا سکتی ہو، سیکڑوں کو...... سو ہوش مندوں کی ایک ہوش مند۔"

مریم مسکرائی نہیں۔ مجھ سے نظریں چرائے خاموشی سے اپنے سامنے چٹان کو دیکھتی رہی۔

"میں بتاؤں...... تم بوریت کا شکار ہو رہی ہو اور کچھ نہیں۔"

"اب یہ نہ کہہ دینا کہ میں فرسٹریٹڈ ہو رہی ہوں۔" مریم نے بات کاٹی۔

''اچھا تو پھر تم ہی بتا دو یہ سب کیا ہے؟''

''اس تنے کو دیکھ رہے ہو۔''

اس نے اوپر پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ پل بھر کے لیے میں اس بالکل غیر متعلق بات پر جز بز ہوا۔ پھر اوپر دیکھنے لگا۔ شاید بھی طوفان سے پہاڑی پر اگا ہوا درخت اکھڑ کر اس طرح گرا تھا کہ اس کا دوسرا سرا سامنے والی چٹان کے ابھرے ہوئے سینے پر ٹک گیا تھا اور درخت تو کیا اب تو صرف سیدھا اور گول تنا ہی رہ گیا تھا۔ جو پہاڑی اور چٹان کے اوپر پل کی طرح لگا ہوا تھا۔

''اگر آدمی اس تنے کے اوپر کھڑا ہو کر بادلوں کو چھوئے تو کیسا لگے۔''

''بشرطیکہ اس پل صراط سے سیدھا عالم بالا کو نہ پہنچ جائے۔'' میں نے جل کر کہا۔ مریم کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''جو آدمی ساری عمر ہی پل صراط پر سفر کرتا رہا ہو اس کے لیے اسے عبور کرنا ناممکن تو نہیں۔''

''اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو اتنی مشکل صورت کا انتخاب کیوں۔ مجھے کہو میں تمہیں زہر لا دیتا ہوں۔'' میں ابھی تک بلبلا رہا تھا۔ مریم ہنس پڑی۔

''تم سمجھ رہے ہو میں تمہیں ٹال رہی ہوں۔ یہ بات نہیں..... میں دیر سے سوچ رہی تھی کہ کیا اس تنے پر چل کر اس چٹان تک پہنچنا ممکن ہے۔''

''جسے زندگی سے پیار نہ ہو وہ یہ کوشش کر دیکھے۔'' میں نے بے نیازی ظاہر کی۔

''اچھا چھوڑو۔ تم کیا کہہ رہے تھے۔''

''کچھ نہیں۔''

''نہیں کچھ تو..... شاید یہ کہ میں بور ہو رہی ہوں۔''

''ہاں اور میں تمہیں بوریت کا علاج بتاؤں اگر برا نہ مانو تو.....'' میں شوخ ہو گیا۔

''بتاؤ.....''

''شادی کر ڈالو۔'' میں نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

''وہ نان سینس..... تمہیں ماما نے وکیل بنا کر تو نہیں بھیجا۔''

''میں تو خود اپنی وکالت کر رہا ہوں۔'' میں نے سمجھایا۔

''یہی تو ماما پاپا سے جھگڑا ہے۔''

''جھگڑا کیوں.....''

''بس جو وہ چاہتے ہیں وہ میں نہیں چاہتی۔''

''اور تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں بس آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی طرح آزاد اور بے فکر..... اور مجھے زنجیر ہونا پسند نہیں۔''

''تم احمق ہو نری۔ ہر آدمی کسی نہ کسی زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔''

''اور زنجیر بھی وہ جو کچے دھاگے سے زیادہ ناپائیدار ہے۔'' مریم کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ''پتا ہے پاپا کہتے ہیں عورت صرف روپیہ چاہتی ہے۔ اور وہ سچ کہتے ہیں۔ عورت بڑی چھچھوری، خود غرض اور مطلبی ہوتی ہے۔ پیسے کی بھوکی۔''

''ارے ارے۔ یہ اپنی ہی صنف کو اتنی ملامتیں۔''

''بے جا نہیں۔ میں نے اپنے اردگرد بہت ساری عورتیں دیکھیں ہیں۔ چیختی چلاتی اور بھوکے گدھوں کی طرح اپنی لالچی نظروں سے گھورتی۔ چاہے تم ان کے سامنے سونے کے ڈھیر لگا دو۔ ان کا دل کبھی نہیں بھرتا۔ چلائے جائیں گی۔ اور لاؤ اور لاؤ۔''

''ساری ہی عورتیں ایسی نہیں ہوتیں۔ شاید تمہارے طبقے میں ایسا ہو مگر مڈل کلاس.....''

''میں مڈل کلاس اور اس سے بھی نیچے لوئر کلاس کو بھی جانتی ہوں۔ خاوند خون پسینہ ایک کر کے اوور ٹائم لگا کے بیویوں کو خوش کرنا چاہیں گے مگر وہ کبھی خوش نہیں ہوں گی۔ سارا پیسہ کپڑوں پر اور فضول نمائش پر اور ایروں غیروں پر لٹا دیں گی اور ان کا ہاتھ پھیلا رہے گا اور وہ خون چوستی رہیں گی۔ جونکوں کی

طرح.....اور مجھے جونک نہیں بننا۔''

''تمہارے اندر کتنا زہر بھرا ہے۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔''اور اپنے ہی طبقے کے خلاف۔''

''ہاں سچ کا زہر۔'' اس کے ہونٹوں پر طنزیہ تبسم پھیل گیا۔''اور میں تمہیں بتاؤں۔عورت کی نظر میں ہر چیز ثانوی ہے۔ چاہے میاں ہو۔ چاہے بچے۔ محبتیں ہوں یا رفاقتیں۔ اولیت وہ پیسے کو ہی دے گی۔عورت صرف پیسہ چاہتی ہے۔''اس کے ہونٹ طنز سے بل کھا گئے۔

''مگر مریم تم تو ایسی نہیں ہو۔ میں نے تمہیں کبھی شوما رتے نہیں دیکھا۔ حالاں کہ تم پیسوں میں کھیلتی ہو۔''

''میرے پاپا کے پاس بہت پیسہ ہے۔'' مریم نے قہقہہ لگایا۔''اتنا کہ کبھی ختم نہ ہو اور عورت صرف پیسہ ہی چاہتی ہے۔''

''اچھا.....'' میرے دل کو دھکا سا لگا اور میں چپ ہو گیا۔تھوڑی دیر مریم بھی چپ رہی پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''بڑے چپ ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''جب زمینیں بنجر ہوں تو پھول نہیں کھلتے۔''

''تم خفا ہو شاید۔'' میں چپ رہا۔

''قصور میرا نہیں۔اصل میں میری شخصیت کی تعمیر میں جو پہلی اینٹ رکھی گئی وہی غلط تھی۔''

''کچھ بھی غلط نہیں۔جواز مت ڈھونڈا کرو۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''جواز تو ہے میرے پاس۔ پاپا نے مما کے سامنے پیسوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔مگر ماما کی ہوس کم ہی نہ ہوتی۔اصل میں ماما غیر خاندان کی تھیں۔ پاپا نے انہیں ان کے ظرف سے زیادہ نوازا۔''

''مریم یہ تم اپنی ماما کو کہہ رہی ہو۔'' میں نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔

''میں سچ کہتی ہوں۔ایسی عورت جس نے کبھی پیسہ نہ دیکھا ہو اور اسے ایک دم ڈھیر سارا خرچ کرنے، نمود و نمائش کرنے اور ضائع کرنے کے لیے مل جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ پاپا کو چاہیے تھا کہ انہیں تھوڑا تھوڑا ان کے حوصلے کے مطابق دیتے۔ پھر شاید ان کی نظریں پاپا کو اہم سمجھتیں۔''

''تمہیں اپنی ماما سے اتنی نفرت ہے مریم۔''

''نفرت نہیں۔مگر کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے وہ میرے ماما پاپا نہیں۔ جیسے میں ان کی بیٹی نہیں اور انہوں نے مجھے گود لیا ہو۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''مریم۔'' میں نے تھکی تھکی نظروں سے اسے دیکھا۔تم نے اپنے اس چھوٹے سے دماغ میں کیا کچھ بھر رکھا ہے۔کتنی الٹی سیدھی باتیں۔مگر کچھ بھی ہو، تم ایک لڑکی ہو۔ چھوٹی سی کمزور جسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔''

''افوہ..... مجھے کس قدر نیند آ رہی ہے۔'' مریم پلکیں جھپکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب چلتے ہیں۔'' میں چپ چاپ اسے تکتا رہا۔

''بات یہ ہے کہ میں جونک نہیں بننا چاہتی۔'' اس نے میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔

''اور یہ کسی اداس اونٹ کا سا پوز نہ بناؤ۔ ذرا مسکرا کے مجھے خدا حافظ کہو۔اچھا۔''

پل بھر کے لیے میرا جی چاہا اس چھوٹی سی لڑکی کو اٹھا کر پہاڑی سے نیچے پھینک دوں اور پھر ہاتھ جھاڑ کر آرام سے سو رہوں۔ پھر میں کراہتے ہوئے اٹھا اور اس کے ساتھ چل دیا۔گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے وہ رکی اور میرا جھلایا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر مسکرائی۔

''بہت شکریہ کہ تم نے مجھے بات کرنے کا حوصلہ دیا۔اور مجھے سکون سے سنا۔اور تم ہی وہ واحد روزن ہو جس سے میں زنداں کے باہر جھانک سکتی ہوں۔ ہوا کے واحد جھونکے۔''

وہ جھکی اور اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ پھر وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

تھوڑی دیر میں ششدر سا کھڑا ابھی اپنے ہاتھ کو اور کبھی اسے گھوڑا دوڑاتے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مسکراتے ہوئے اپنے ہونٹ اپنے ہاتھ پر رکھ دیے۔

☆☆☆

مریم دو دن سے غائب تھی۔ جب کبھی وہ کوئی تصویر بنانے میں مصروف ہوتی تو اس طرح کئی کئی دن کے لیے غائب ہوجاتی۔ اس لیے تشویش تو نہیں تھی مگر میں اسے مس کررہا تھا۔ آخر تنگ آکر میں نے اسے فون کیا۔

''بھئی یہ تم گوشہ نشین کیوں ہوگئی ہو۔ اپنے حجرے سے نکلو نا۔''

''فنشنگ ٹچ دے رہی ہوں۔'' مریم نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ''سہ پہر کو رائیڈنگ کے لیے آؤں گی۔''

''کسی آئیڈیے پر کام کررہی ہو۔''

''یاد ہے وہ چٹان اور پہاڑی جس کے اوپر تلے کا پل سا بنا ہوا تھا۔ اسے ہی پینٹ کررہی ہوں۔''

''خوب تو بہت مصروف ہو۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔'' میں نے فون رکھ دیا۔

ساری سہ پہر میں مریم کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ وعدہ کرکے نہیں آئی تھی۔ میں متفکر ہوگیا۔ پھر مجھے خیال آیا کیا پتا میرے آنے سے پہلے ہی وہ پہاڑوں کے اس طرف پھولوں بھری وادی میں نکل گئی ہو مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں مایوس ہوکر واپس آیا اور اسی وقت میں نے دیکھا مریم پہاڑی کے اوپر اس تنے کے قریب کھڑی تھی جو چٹان کے اوپر گرا ہوا ہے۔ میں نے اسے بلانا چاہا۔ مگر یہ دیکھ کر میری سانس رکنے لگی کہ وہ تنے کے اوپر چل رہی تھی۔ ذرا سا دھیان بھٹکنے پر سیکڑوں فٹ گہرائیوں میں گر سکتی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبالیے اور اپنی آواز حلق میں گھونٹ لی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے تنے پر چلتا دیکھتا رہا۔

خدا جانے یہ تنا کب سے گرا پڑا تھا۔ اور اس کے اندر بوجھ سہارنے کی طاقت تھی یا نہیں۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور مریم کے پاؤں کے دباؤ سے وہ لچک رہا تھا۔ چرمرا رہا تھا۔ میری ہتھیلیاں پسینے لگیں۔ پھر میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ مریم چٹان پر پہنچ چکی تھی۔ پل بھر وہ یوں ہی ساکت کھڑی رہی اور پھر واپس آنے کے لیے دوبارہ تنے پر چلنے لگی۔ مجھے لگا جیسے تنا نیچے کی طرف پھسل رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ لمحے گزر گئے یا صدیاں۔ کچھ خبر نہ تھی۔ ہاں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مریم تنا عبور کرکے پہاڑی پر سے نیچے اتر رہی تھی۔ اور میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں مریم کو کس قدر چاہتا ہوں اور یہ کہ مریم موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ میں پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔ مگر میرے گھٹنے لرز رہے تھے اور میرا دل کسی کے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''مریم۔'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہیں کیا سوجھی مریم۔''

''تم کون ہو؟'' مریم نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں مکمل اجنبیت تھی۔

''میں..... مذاق چھوڑو مریم۔ پہلے ہی میرا دل قابو میں نہیں۔'' میں نے اس کی بے وقت ایکٹنگ پر چڑ کر کہا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے مذاق کی۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں۔'' اس نے عجیب بے اعتنائی سے کہا۔

''مریم پلیز۔ تنگ مت کرو۔'' میں بے زار ہونے لگا۔

''میں کسی کو تنگ نہیں کررہی۔ تم خود ہی فری ہو رہے ہو۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے بے رخی سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم مجھے نہیں جانتیں تو پھر تم یہاں کیوں آئی ہو۔'' میں نے اس کے ساتھ ساتھ

چلتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں، میں اس چٹان پر کھڑے ہو کر آسمان کو چھونا چاہتی تھی۔''

''تو پھر چھو لیا۔'' میں نے طنز کیا۔

''نہیں بہت اونچا ہے۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''اب بس کرو یہ اداکاری۔ چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا مگر اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

''اپنی راہ لو مسٹر..... میں ہاتھ توڑ دیا کرتی ہوں۔'' اس نے خوں خوار نگاہوں سے مجھے گھورا میں سن ہو گیا۔ کیا ہو گیا ہے مریم کو۔ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے یا واقعی نہیں پہچان رہی۔ مگر یہ کیا تک ہے۔ اتنا سخت ہتک آمیز رویہ۔ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا میں معترف تھا اور ایئر پورٹ پر اس کا مظاہرہ بھی دیکھ چکا تھا مگر اس نے کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں کیا تھا۔

تو کیا اس وقت یہ ہوش میں نہیں۔ میں نے بغور اسے دیکھا اس کی آنکھیں خواب آلود ہو رہی تھیں جیسے ابھی سوئی سوئی اٹھی ہو۔ اور چہرے پر گلابی چمک تھی۔ وہ مجھے گھورتے گھورتے مڑی اور واپس چل دی۔ میں اسے روبوٹ کی طرح قدم اٹھاتے دیکھتا رہا۔ پھر بے دلی سے آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی قہقہہ لگ کر ہنس دے گی اور چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے چپکے سے کہے گی۔

''کہو فرینڈ..... کیسا بے وقوف بنایا۔''

اور میں اس کی اس ناروا حرکت پر خوب سناؤں گا۔ خفا ہو جاؤں گا اور بالکل بات نہیں کروں گا۔ میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ مگر وہ رکے بغیر چلی گئی جانے اس نے گھوڑا کہاں باندھا تھا۔ اب تو میدان آ گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی گاڑی میدان میں کھڑی نظر آ گئی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی موڑتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی نظریں اب بھی مکمل اجنبی تھیں۔ جانی پہچانی ناشنا سا آنکھیں ہر مہربان جذبے سے نا آشنا..... اور مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی۔ کوئی غیر فطری سی بات تھی جسے میں سمجھ نہیں رہا تھا۔ پھر وہ چلی گئی اور میں گاڑی کے پیچھے اڑتی گرد کو ہونقوں کی طرح گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

میں بستر میں لیٹا آنکھیں بند کیے پرانے گیت سن رہا تھا کہ فرخ نے آ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

''یہ کیا قنوطیت ہے۔ دیوداس کیوں بنے ہوئے ہو۔''

''یوں ہی.....'' میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''کہیں دل تو نہیں لگا لیا یار۔ کچھ چکر سا لگتا ہے۔'' اس نے آنکھیں نچائیں۔

''چکری آدمی کو ہر بات چکر ہی لگتی ہے۔''

''یعنی کے خطرے والی کوئی بات نہیں۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ''چلو پھر کلب چلتے ہیں۔''

''رہنے دو۔ مجھے تمہارے مشغلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم اپنی پسند کا مشغلہ ڈھونڈ لینا۔'' اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا اور مجھے پکڑ کر زبردستی کھڑا کر دیا۔

''چلو فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔''

''کیا ضروری ہے۔'' میں نے کاہلی سے پوچھا۔

''ہاں..... بات یہ ہے کہ یہ تمہارا چہرہ جو ایک گز لمبا ہو رہا ہے مجھ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہا۔ اس سے پہلے کہ مجھے نروس بریک ڈاؤن ہو جائے اسے اصل حالت میں لے آؤ ورنہ.....'' میں بے دلی سے فرخ کے ساتھ چل دیا۔

فرخ کے ساتھ ہنستے بولتے، قہقہے لگاتے بھی میرا ذہن غیر حاضر سا رہا۔ بار بار مجھے مریم کا خیال

آتا۔ مریم نے ایسا کیوں کیا بھلا۔ پھر فرخ کو کسی نے پکارا تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں بے دھیانی میں اورنج جوس کے گلاس میں اسٹرا گھماتا اور سوچتا رہا۔

''ہیلو.....'' وہی نغمہ ریز بہاروں کا پیغام دیتی خوب صورت آواز۔ وہی معصوم بے ساختہ لہجہ۔ وہی روح میں اترتی مٹھاس۔

''ہیلو.....'' میں نے نظریں اٹھائے بغیر بے دلی سے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے کرسی گھسیٹ کر بے تکلفی سے پوچھا۔

''وہی جو نظر آ رہا ہے۔'' میرا لہجہ برف ہو رہا تھا۔

''اوہو..... تو خفا ہیں جناب۔''

''نہیں دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔'' اندر ہی اندر سلگتے ہوئے میں نے کہا۔

''بھئی مجھے افسوس ہے کہ تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا..... اور میں وعدے کے مطابق نہ آ سکی۔ مگر کیا کرتی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بیڈ پر پڑتے ہی نیند آ گئی۔''

اتنا سفید جھوٹ میں نے تلملا کر اسے دیکھا۔ کل کے اتنے ہتک آمیز رویے کے بعد یہ نئی کہانی۔ میرا جی چاہا تھپڑوں سے اس کا چہرہ لال کر دوں اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جاؤں کہ وہ ساری دنیا کو ایک ہی ترازو میں تول رہی تھی۔

''تو پھر اس چٹان پر تمہاری روح چہل قدمی فرما رہی ہوگی۔'' میں نے طنز کیا۔

''چٹان پر یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''فریبی، دھوکے باز۔'' میں بھڑک اٹھا۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے ان سے الگ رکھنا پھر بھی ''میں الو نہیں ہوں سمجھیں۔'' میری آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ ''بیوقوف بنانا ہے تو دنیا میں اور بہت سارے لوگ ہیں۔ مجھے افسوس ہے تم نے میرے خلوص کو پتھروں میں تولا۔'' میں نے غصے سے بل کھاتے ہوئے اٹھنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''پیچھا چھڑانا چاہتے ہو فرینڈ۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''میری الٹی سیدھی باتوں سے اکتا گئے ہو تو مجھ سے کہہ دو۔ ایک بے بنیاد بات کو بنیاد بنا کر مجھ پر الزام مت دھرو۔'' اس کی آواز میں ہلکی ہلکی چبھن تھی جیسے اندر ہی اندر اس کا دل کٹ رہا ہو۔

''میں پیچھا چھڑانا چاہوں گا تم سے۔ تم جو میری رگ جان کے قریب ہو..... میری کل کائنات میری روح جسے دیکھتے ہی میری آنکھوں نے دل میں بسا لیا۔ میرے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ میں کچھ بول نہ سکا۔''

''میں سچ کہتی ہوں فرینڈ..... مجھے مجھے اتنی گہری نیند آ گئی تھی کہ پھر آدھی رات کو ہی آنکھ کھلی اور اگر تم نے چٹان پر کسی کو دیکھا ہے تو وہ یقیناً میں نہیں تھی۔''

مریم کی بے ریا آنکھیں ہمیشہ کی طرح معصوم اور شفاف تھیں۔ میں نے یقین نہیں کیا مگر میں زیادہ دیر تک اس سے خفا نہ رہ سکا۔ پھر بھی کئی دن تک میرے دل میں خلش سی رہی کہ مریم نے آخر جھوٹ کیوں بولا۔ کیوں اس نے ان چند لمحات کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ جب اس نے خود کو خطرے میں ڈال کر وہ پل صراط عبور کیا تھا مگر ہر بات میری فہم سے دور تھی۔

اس دن مریم نے کھانے پر مدعو کیا تو مریم کے پاپا اور ماما سے ملاقات ہوئی..... ماما نے تو کم ہی بات کی مگر پاپا بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔

''صاحبزادے تمہاری شکل مجھے کچھ دیکھی بھالی سی لگتی ہے۔'' انہوں نے عینک کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی..... شاید دیکھا ہو کلب میں۔'' میں بوکھلا گیا۔

''کلب میں ہی دیکھا ہوگا۔'' وہ مطمئن ہو گئے۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے

کے بعد بریگیڈیر واسطی معذرت کرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ماما تو پہلے ہی جا چکی تھیں۔

مریم مجھے لے کر لان میں آ گئی۔

''کیسے لگے میرے پاپا، ماما؟'' اس نے گھاس کے سبز فرش پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا تو اچھے لگے مگر ماما.....'' میں چپ ہو گیا۔

''اب بولو بھی.....''

''کچھ خود پسند اور مغرور سی۔'' میں نے رک کر کہا۔

''ہاں، وہ ایسی ہی ہیں۔'' اس نے برا مانے بغیر کہا۔ میں نے مریم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور خوب صورت آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''مریم.....'' میرا دل میری آواز میں دھڑکنے لگا۔

''ہوں.....'' اس نے سبزے پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''مریم..... کسی بھلے آدمی نے کہا ہے کہ زندگی محبت کرنے کے لیے بہت کم ہے.....اور میں اس مختصر سی زندگی کو اب ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

''بڑے نیک ارادے ہیں.....'' مریم مسکرائی۔

''تو پھر اخبار میں اشتہار شائع نہ کرا دیں۔ ضرورت ہے ایک لڑکی کو جو محبت کرنے کا فن جانتی ہو اور ایک سر پھرے شخص کو برداشت کر سکے اور.....''

''مریم..... یہ مذاق نہیں ہے۔'' میں برہم ہو گیا۔

''سوری فرینڈ عادت سی پڑ گئی ہے۔'' اس نے معذرت کی۔ ''پتا ہے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں.....اس دنیا میں جہاں اتنی نفرتیں ہیں اور اتنی کینگیاں ہیں اور اتنے دکھ ہیں۔ محبت کا نرم و کومل جذبہ کیسے پنپ سکتا ہے۔ آدمی کیسے بنجر زمینوں میں پھول کھلنے کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لہجے میں اس کے اندر کا دکھ بول رہا تھا۔

''مریم.....'' میری سوالی آنکھیں التجا کرنے لگیں۔

''اپنے دکھوں کی بنجر زمین میرے نام کر دو۔ میں اس میں خوشیوں کے گلاب کھلا دوں گا۔''

''آنسوؤں کی آبیاری سے بنجر زمینیں زرخیز نہیں ہوتیں فرینڈ۔ وہ کلرزدہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی کہ پھر ان میں کبھی کوئی پھول نہیں اگتا۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ کسی امید کا کونپل.....نہ کسی آرزو کا گلاب۔'' میں اس کی آواز کے درد کو محسوس کرتا رہا مگر آج مجھے اس سے حتمی بات کرنا تھی۔

''مریم.....''

''ہوں.....'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی۔

''کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟'' میرا دل جیسے مٹھی میں دھڑکنے لگا۔

''محبت.....'' اس نے یک دم آنکھیں کھول دیں اور کھلکھلا کر ہنسی۔

''کس قدر احمقانہ سوال ہے۔'' اس نے ہنستے ہنستے بہ مشکل کہا۔

میں چپ چاپ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ کیا مریم محبت کو مذاق سمجھتی ہے میرا دل ڈوبنے لگا اور میں کس قدر احمق واقع ہوا ہوں جو اس جیسی نٹ کھٹ ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے والی لڑکی سے توقعات وابستہ کر بیٹھا.....اس کے نزدیک تو شاید زندگی بھی ایک مذاق ہے۔ گویا یہ سب کچھ اس کے نزدیک ایک کھیل تھا.....مگر اس نے محبت کا اظہار کیا ہی کب تھا۔ یہ تو میں خود ہی توقعات وابستہ کر بیٹھا۔ میرا چہرہ پھیکا پڑنے لگا۔

''میری زندگی میں اس قدر گلیمر، حسن اور مصروفیات ہیں کہ میرے پاس اس قسم کی خرافات کے لیے ذرا سا بھی وقت نہیں۔'' اس نے گھاس کی پتیاں نوچتے ہوئے کہا۔

''تو تم محبت کو خرافات سمجھتی ہو۔'' میرا دل درد سے بھر گیا۔ جی چاہا اسے جھنجھوڑ کر کہوں۔ ''اگر تمہاری زندگی میں اتنا ہی گلیمر، اتنا ہی حسن ہے تو پھر تم اندر

سے اتنی کھوکھلی کیوں ہو۔ تمہیں ڈپریشن کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی تم ساری دنیا سے اتنی بے زار کیوں ہو جاتی ہو..... مت جھوٹ بولو فریبی لڑکی اپنے آپ سے، مجھ سے اور ساری دنیا سے۔''

وہ کئی ثانیوں تک چپ چاپ گھاس کی پتیاں نوچتی رہی۔ پھر دفعتاً اس نے سر اٹھایا۔

''پتا نہیں..... میں اسے محبت تو نہیں کہہ سکتی مگر عرصہ ہوا میرے اندر ایک جذبہ سا لودے اٹھا تھا۔''

''پھر.....؟'' میری سانسیں رکنے لگیں۔

''پھر کیا ..... ماما نے کہا، وہ لوفر شاعر تمہیں پھنسانا چاہتا ہے۔ اس کی نظر تمہارے پاپا کی دولت پر ہے اور اس کی تنخواہ اتنی تھوڑی ہے کہ محض تمہارے کاسمیٹکس کے سامان پر ہی خرچ ہو جائے گی۔ میں نے ماما کو بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں وہ صرف میرا دوست ہے اور مجھے ہرگز بھی پھانسنا چاہتا مگر ماما نہ مانیں۔'' اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔

''تمہیں پتا ہے پھر میں نے کیا کہا۔''

اس کے ہونٹ دھیرے سے مسکرائے۔ عجیب زہریلی سی مسکراہٹ تھی جیسے ان ننھے ننھے دو ہونٹوں نے ساری دنیا کا زہر چوس لیا ہو..... پھر اس کی آنکھوں میں ایک نرم نرم سا تاثر ہلکورے لینے لگا۔

''میں نے اس سے کہا..... احسان علی، تمہاری نظر میرے پاپا کی دولت پر ہے..... اور تم مجھے پھانسنا چاہتے ہو اور یہ کہ تمہاری تنخواہ میرے ڈرائیور کے برابر ہے۔''

''تم ہمیشہ کی اذیت پسند ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔

مریم نے ایک نظر مجھے دیکھا اور اس کی سیاہ آبدار آنکھوں میں روشنیاں سی تڑپیں جیسے کہیں دور بہت سارے چراغ جھلملائے ہوں۔

''پہلے تو وہ ہکا بکا سا رہ گیا..... پھر وہ بہت ہنسا۔ اتنا ہنسا کہ.....'' مریم اسی تاثر میں ڈوبی ہوئی چپ ہو گئی۔

''اس نے کہا تھا.....'' مریم کو یاد آیا۔

''بی بی! تم ہو کس خیال میں، میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ بیوی بچوں والا اور میں نے تمہارے بارے میں کبھی اس انداز میں نہیں سوچا۔ میری ایک بچی ہے تمہاری عمر کی اور وہ مجھے بہت پیاری ہے تمہاری معصوم، شوخ باتیں مجھے اس کی یاد دلاتی ہیں..... اور جب مجھے اس اجنبی شہر میں اس کی یاد ستاتی ہے تو میں تمہارے پاس چلا آتا ہوں اور تم سے باتیں کر کے یوں خوش ہوتا ہوں جیسے یہ تم نہیں ہو وہ ہے اور تم..... تم نے اس قدر بیہودہ گری ہوئی بات کہی ہے کہ جی چاہتا ہے زمین میں دھنس جاؤں۔''

مریم کو یوں لگا جیسے وہ یک دم زمین میں دھنستی جا رہی ہو۔ اس نے بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا۔

''چلے جاؤ احسان علی، چلے جاؤ اب میں کبھی تم سے نظریں نہ ملا سکوں گی۔ ماما، او ماما یہ تم نے کیا کر دیا۔ اس قدر گھٹیا اتنی نیچ بات۔'' وہ خاموش چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔

''میں جانتا ہوں تمہارے اندر یہ زہر کس نے بھرا ہے۔'' احسان علی نے پھر کہا۔ ''بہت سی باتیں ہیں جو معصوم ذہنوں کو آلودہ کر رہی ہیں۔ عریاں فلمیں، گھٹیا لٹریچر۔ یہ ماحول اور تمہاری ماما۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم بہت معصوم ہو۔ بے حد نا سمجھ۔ بالکل میری رینو کی طرح ..... اور تمہارے اندر زبان کسی اور کی بول رہی ہے۔''

احسان علی جا چکے تھے مگر مریم اسی طرح بیٹھی رہی۔ ماما آئیں..... پاپا آئے۔ ایک ایک نے منتیں کیں مگر وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہ چہرے پر سے ہاتھ اٹھائے۔ پھر جب رات بہت گہری ہو گئی اور ٹمٹماتے ستارے بجھنے لگے تو اس نے ایک گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھا جو بہت دور بہت دھندلا نظر آ رہا تھا۔

''تو یہ تم ہو ماما ..... جس نے میرے ذہن کو آلودہ کیا۔ بار بار ایک ہی بات کو دہرا کے۔ حالاں

کہ وہ احسان علی اس کی ہتھیلیاں ایک بار پھر پسینے میں ڈوب گئیں..... اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔

''وہ مجھے بچی سمجھتا تھا۔'' مریم نے بڑی دیر بعد سر اٹھایا۔ ''اور ماما اسے میرا عاشق کہتی تھیں۔'' وہ ہولے سے ہنسی مگر اس کی ہنسی میں زہر گھلا تھا۔

''کیا تم.....'' الفاظ میرے منہ میں ٹھٹک سے گئے۔

''پاپا باہر تھے، ماما مصروف اور میں بے حد تنہا اور اداس..... اور وہ مہربان اور شفیق..... بالکل پاپا کی طرح، اصل میں ہم دونوں اپنی اپنی محرومیوں کی تلافی ایک دوسرے کی ذات میں کر رہے تھے مگر ماما بہت غلط سمجھیں۔''

اس کی آواز کی نغمگی میں ہلکی سی کسک تھی۔ ایسی ہی کسک میرے دل میں بھی تھی جیسے کوئی بہت بڑا کانٹا یک دم روح میں چبھ کر ٹوٹ جائے۔

مریم نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کے چہرے پر ابر چھا رہا تھا اور آنکھوں میں حزن وملال ساری واردات اس کی آنکھوں کے سامنے سے دوبارہ گزر رہی تھی۔

احسان علی تو اسے مطمئن کر کے چلے گئے تھے مگر وہ رات بھر اپنا خون جلاتی رہی اور اپنے آپ کو نوچتی رہی۔

اگلی صبح ماما نے دروازہ کھولا تو وہ بے ہوش پڑی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ ماما گھبرا گئیں۔ پل بھر میں بڑے بڑے ڈاکٹر جمع ہو گئے بڑی دقتوں، بڑی کوششوں کے بعد اسے ہوش آیا..... مگر ماما کو دیکھتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چلانے لگی۔

''ماما..... پلیز ماما..... میرے سامنے مت آؤ۔'' ڈاکٹروں کے کہنے پر ماما ہٹ گئیں..... مگر پھر اسے دورے پڑنے لگے بار بار بے ہوشی کے دورے ڈاکٹروں نے کہا۔

''اسے کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس کا جسم تو انا ہے مگر روح بیمار..... اور اس کے ذہن کی گرہ کو ماہر نفسیات ہی کھول سکتا ہے۔''

ماما گھبرا کر اسے لندن لے آئیں..... پھر نفسیاتی تجزیے، لمبی لمبی نشستیں ماہر نفسیات کے ا۔ سیدھے سوالات۔ ان کی بے تکی باتیں مریم دل دل میں ہنستی اور ہر بات کا الٹا جواب دیتی۔ کوئی بھ اس کے اندر کی بات نہ جان سکا۔ مگر پھر ڈاکٹر ہار نے اس کی روح میں جھانک لیا۔ وہ اس سے کو بات نہ چھپا سکی۔

''شیریر لڑکی۔ تم بیمار و بیمار کچھ نہیں ہو۔''

ڈاکٹر دھیرے دھیرے غیر محسوس طریقے سے اسے زندگی کی طرف لانے لگا۔

''بس یوں ہی تمہیں تنگ کرنے کو جی چاہ ر ہے۔ بہت ہو چکی..... اب باز آجاؤ۔''

''اچھا.....'' وہ ہنستی بیمار تو واقعی میں نہیں ہوں لوگوں کی سمجھ کا فتور ہے۔''

''بس بہت آرام کر لیا اب کام کرو۔ کیا تمہیں رنگ اور برش نہیں بلاتے؟''

''رنگ اور برش.....!'' اس نے اپنی انگلیاں دیکھیں جو مدت ہوئی برش پکڑنا بھول چکی تھیں۔

''ہاں..... ایسا کرو۔ فضول بیٹھ کر الٹی سیدھی باتیں سوچنے کی بجائے تصویر بنانا شروع کر دو۔ ایک اچھی سی تصویر..... مجھے گفٹ دینے کے لیے..... دو گی نا مجھے گفٹ۔''

ڈاکٹر ہار بر دھیرے دھیرے اسے مائل کر رہے تھے۔

''ضرور ڈاکٹر۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

پھر وہ تصویریں بنانے لگی..... رنگ اور برش اس کے ہاتھ میں آئے تو وہ سب کچھ بھول کر انہی میں کھو گئی، شروع شروع میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا..... وہ جو اتنے نفیس ذوق کی مالک تھی جس کے ہاتھ میں رنگ بولنے لگتے تھے اور تصویریں زندہ ہو جاتی تھیں، وہی رنگ استعمال کرنے کا سلیقہ بھول گئی..... برش پر اس کی گرفت مضبوط نہ رہی اور رنگ

بے قابو ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس کی تصویروں میں چلاتے ہوئے بے تحاشا شوخ رنگ ہوتے جو آپس میں گڈمڈ ہو جاتے..... اور لکیریں اکثر اپنی حدود پار کر جاتیں..... پھر جوں جوں وہ نارمل ہوتی گئی رنگوں میں بھی توازن آتا گیا حتیٰ کہ آخری تصویر جو اس نے ڈاکٹر ہاربر کو گفٹ دی تھی اسے دیکھ کر ڈاکٹر بے ساختہ بول اٹھے۔

''ویل ڈن لڑکی..... میرا دعویٰ ہے تم یقیناً بڑی مصور ہو گی..... اور اب تم بالکل صحت مند ہو۔ دنیا کی رنگینیوں اور خوشیوں میں حصہ لینے کے لیے بالکل فٹ۔''

اس کے بعد مریم کو پھر کبھی دورہ نہ پڑا۔ مگر کبھی کبھی عجیب سی بے چینی اسے بے قرار کر دیتی۔ بے تحاشا ہنستے شرارت کرتے شور وغل مچاتے اسے ایک دم تنہائی کا احساس ہونے لگتا اور اداسی خون کی طرح اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔

''پھر مجھے کبھی محبت کا احساس نہ ہوا۔'' مریم نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر کہا۔

''شاید میرے اندر تالے پڑ گئے تھے جو کبھی نہ کھل سکے۔ بارہا میں نے سوچا کہ ماما کی بات مان لوں۔ مگر مجھے ہنسی آ جاتی۔ لگتا جیسے یہ کوئی لطیفہ ہو۔ کوئی مسخری سی بات۔ یا جیسے مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہونے لگا ہو، پتا نہیں کیا چیز ہے جو میرے ہاتھ باندھے رکھتی ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''تم اپنے آپ کو سزا دے رہی ہو مریم..... تم سمجھتی ہو ابھی تمہاری میعاد پوری نہیں ہوئی جس دن بھی تم نے سمجھ لیا کہ تم اپنے حصے کا عذاب بھگت چکیں اور کفارہ ادا ہو گیا۔ قفل خود بخود ٹوٹ جائیں گے۔''

''اور شاید وہی دن میری رہائی کا ہو۔'' مریم نے دھیرے سے کہا۔ ''تم یقین کرو۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بندھا ہوا محسوس کیا۔ لگتا ہے میری روح کہیں گروی رکھی ہے اور میں نہیں جانتی کہ اسے کیسے چھڑاؤں۔''

میں چپ اسے تکتا رہا۔ کیا میری محبت اتنی ہی بے وقعت تھی کہ بند دروازے نہ کھول سکی۔ کیا میرا خلوص اتنا ہی ناتواں تھا کہ اس کے ذہن میں پڑی ہوئی گرہ کو نہ کھول سکا۔ کیا میرے تیشے کی ضرب میں کوئی طاقت نہ تھی..... ہاں شاید میرا جذبہ ہی خام تھا جو پتھر کو موم نہ کر سکا۔ میں نے خام جذبوں سے جو شیش محل بنائے تھے دھڑام سے نیچے آ رہے اور ان کی کرچیاں میرے دل میں ترازو ہو گئیں۔

میں نے کرب سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کیا ہوا فرینڈ؟'' مریم جو میری صورت تک رہی تھی۔ چونک پڑی۔

''میں نے تو سنا تھا مریم..... محبت کی ایک نظر سارے دروازے کھول دیتی ہے پھر کیا میرا جذبہ بالکل بے اثر رہا۔'' بے اختیار شکوہ میرے لبوں پر مچل اٹھا۔ مریم پل بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''تم میرے زندان کے واحد روزن ہو تازہ ہوا کے جھونکے میرے غم گسار میرے ہمدرد مگر.....''

''مگر کیا.....؟'' میرا دل پارے کی طرح تڑپ رہا تھا۔

''میرے دل پر مہریں لگی ہیں کہ ایک تلاطم سا بپا ہے۔ پھر بھی کبھی میرا دل نہیں چاہا کہ تمہارے سینے پر سر رکھ کر سارے آنسو بہا دوں۔''

''تو اس کا مطلب ہے.....''

''ہاں فرینڈ جس شخص کو دیکھ کر میرے دل پر لگی مہریں ٹوٹ جائیں گی اور جس کے سینے پر سر رکھ کر رونے کو جی چاہے گا، وہی ہو گا جسے میں اپنا دل نذر کروں گی اور اپنی روح بھی.....''

میری آنکھیں تاریک پڑ گئیں اور میرے اندر جلتی جوت ایک دم بجھ گئی..... کتنی سفاکی سے اس نے میرا دل توڑ دیا تھا۔ درد کی ایک تیز لہر میرے دل کو کاٹتی چلی گئی..... مارے ضبط کے میں نے ہونٹ کاٹ لیے۔ میرا جی چاہا اس سے پوچھوں۔

''تو اب تک تم یہ کیا کھیل کھیل رہی تھیں مریم۔ تم نے مجھے کیوں دیوار سمجھ لیا..... ایسا سامع جو سنتا

رہے چپ چاپ۔ بے حس، سپاٹ جذبوں کے ساتھ۔ بے روح۔''

''تم بہت پیارے، بہت مخلص دوست ہو اور مجھے احساس ہے کہ میں زیادتی کر رہی ہوں مگر.....''

''مت کہو مجھے دوست۔'' میری آنکھیں خون ہو رہی تھیں۔

''دوست تو تم میرے ہو۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''اب تم مجھے اس کی سزا مت دینا کہ میں نے سچ بولا اور مجھے سے خفا مت ہونا۔''

''گویا یہ بھی ایک شرط ٹھہری۔'' میرے ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ تڑپی مگر مجھ سے بولا نہ جا سکا۔ میں نے سر جھکا لیا اور واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں.....'' اس نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ایسے مت جاؤ پہلے وعدہ کرو مجھے اپنی دوستی سے محروم نہیں کرو گے۔''

جی چاہا کہہ دوں میں لڑکیوں سے دوستی کا قائل نہیں۔ مگر مریم کی نگاہوں میں امید تھی اور چہرے پر معصوم سی چمک۔ مجھ پر کچھ کہا نہ گیا۔

''بولو نا، چپ کیوں ہو؟'' اس نے میرا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

''نہ مرنے دیتی ہو نہ جینے.....'' میری آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ ''آخر چاہتی کیا ہو تم؟''

''مرنے کی بات مت کرو..... اکیلے مرنے نہیں دوں گی۔'' اس کی ضد پر مجھے ہنسی آنے لگی۔

''ساتھ جی نہیں سکتیں مگر..... خیر جہاں تک یہ شجر فیض پہنچا سکا پہنچائے گا۔ پھر بے شک اسے جڑ سے کاٹ دینا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم کا چہرہ سفید پڑ گیا اور ہونٹ کچھ کہنے کو لرزنے لگے۔ مگر میں اس کی بات سننے کے لیے رکا نہیں، اس لیے کہ بہت ساری دھند میری آنکھوں میں جمع ہونے لگی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ میں اس چھوٹی سی لڑکی کے سامنے حوصلہ ہار بیٹھتا میں وہاں سے بھاگ نکلا۔

جانے کیا بات تھی، زندگی کچھ اجیرن اجیرن سی لگنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا وقت کے پاؤں میں بھاری بھاری زنجیریں پڑ گئی ہوں۔ نہ ہنسنے مسکرانے کو جی چاہتا..... نہ کہیں سیر و تفریح کو۔ وہی میں تھا..... وہی مریم..... اور وہی شب و روز مگر کچھ نہ کچھ ضرور بدل گیا تھا۔ کبھی میں سوچتا مریم نے تو کبھی مجھے آس نہ دلائی تھی۔ پھر میں کیوں بے آپ ہو گیا۔ دنیا میں صرف ایک مریم ہی تو نہیں..... میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ مگر آنکھیں تھیں کہ ایک ہی صورت دیکھے جاتیں۔

''تم اتنے کنجوس کیوں ہو گئے ہو فرینڈ..... ہنسنے مسکرانے اور باتیں کرنے میں.....''

مریم پوچھتی میں زخمی نظروں سے اسے دیکھتا اور سر جھکا کر اپنا ہی دل نوچنے لگتا۔

''کاش..... اے کاش یہ فساد کی جڑ نہ ہوتا۔ سارا درد تو یہاں سے ہی اٹھتا ہے۔'' میں سوچتا۔

''خوش رہا کرو فرینڈ..... میں تمہیں اداس نہیں دیکھ سکتی۔'' مریم ریشم جیسے ملائم لہجے میں کہتی۔

''مت الجھاؤ مجھے اس کچے ریشم میں.....'' میں بے آواز چلاتا..... ''ایسا نہ ہو کہ میرے دل کی طنابیں ٹوٹ جائیں اور میں ایسا مسئلہ بن جاؤں جو کبھی حل نہ ہو۔''

''فرینڈ.....''

''مت کہو مجھے فرینڈ.....'' میں چلا اٹھا ''میرا کوئی نام بھی ہے۔''

''ہاں نام..... مگر تم اتنے غصے میں کیوں آ گئے شہری۔''

''سوری..... شاید میں کچھ اپ سیٹ ہوں۔'' میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''تمہیں مجھ پر غصہ ہے نا..... بے شک مجھے ڈانٹ لو..... برا بھلا کہہ لو..... مار لو مگر دل پر کوئی بوجھ مت رہنے دو۔ اپنا غصہ نکال ڈالو۔''

مریم کی نگاہوں میں خلوص کی چمک تھی۔

میں نے سر اٹھا کر مریم کو دیکھا وہ جو میرے لیے اتنی مخلص تھی اتنی ہمدرد تھی پھر بھی درمیان میں کتنے فاصلے تھے۔

''طمانچے مت مارو مریم دوست ہونا تو ایک بات مانو.....'' میں نے بڑے ضبط سے کہا۔

''ایسا کیوں کہتے ہو فرینڈ۔'' مریم نے تڑپ کر کہا۔

''میرے خلوص کا مذاق مت اڑاؤ، حکم دو کیا چاہتی ہو۔''

''مریم!'' میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کچھ دنوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو، میرا مطلب ہے مجھ سے ملامت کرو۔''

''وجہ.....؟'' مریم کی آواز لرز رہی تھی۔

''بہت بکھر رہا ہوں.....تھوڑا وقت دو کہ خود کو سمیٹ لوں.....پھر میں خود تم سے ملوں گا۔''

''وعدہ۔'' مریم اداس سی ہوگئی۔

''وعدہ.....'' میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے اس کا ننھا ہاتھ تھام لیا۔

''میں بہت بری ہوں.....اتنی بری کہ تم سے پیارے دوست کو دکھی کر دیا.....'' مریم نے نم نم آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پلکیں جھپکتی بھاگ گئی۔

☆☆☆

وقت کتنا بھی کٹھن کیوں نہ ہو گزر ہی جاتا ہے۔ میں بھی رفتہ رفتہ سنبھل گیا۔ میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ وہ جسے میں نے اپنے مقدر کا ستارہ سمجھا تھا کسی اور ہی آسمان کا نصیب ہے۔ اب پھر میں ہنسنے مسکرانے اور قہقہے لگانے لگا تھا۔ مریم کے خیال سے اب مجھ پر وحشت طاری نہ ہوتی۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ مجھے مریم تک جانے کا حوصلہ نہ ہوا.....ہزار کوشش کے باوجود بھی ایک سوز سا اندر ہی اندر جلائے جاتا۔ دل تھا کہ خواہ مخواہ گداز ہوئے جاتا اور کوئی غم آلود سا احساس کبھی کبھی آنکھوں کے دریچے سے جھانکنے لگتا۔ لگتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی ساری طنابیں ٹوٹ جائیں گی اور مجھے خود پر اختیار نہ رہے گا۔

تب اس دن سڑک کراس کرتے ہوئے میری نظر یک دم مریم پر پڑی تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سیاہ مرسیڈیز میں وہ فراز کے ساتھ بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی.....پل بھر کے لیے مجھے آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ فراز کھڑکی سے سر نکالے آئس کریم والے کو پیسے دے رہا تھا۔ اسی وقت مریم کی نگاہ مجھ پر پڑی.....مگر اس کی نگاہیں مکمل اجنبی تھیں۔ پہچان یا شناسائی کی ایک رمق تک ان میں نہ تھی۔ مجھے دھکا سا لگا .....یہ مریم جان بوجھ کر انجان کیوں بن رہی ہے.....اور یہ شخص ارب پتی باپ کا اکلوتا بیٹا.....جس کے روزانہ ہزاروں اسکینڈل بنتے ہیں.....یہ گھاگ شکاری اس معصوم ہرنی سے کیسے آنکھ لایا۔

''مریم.....'' میں کراہ اٹھا۔ ''یہ تم نے کیا کیا مریم.....؟''

سیاہ مرسیڈیز تیزی سے میرے قریب سے گزری۔ مریم کی نظریں ایک بار پھر میری نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہی اجنبی، ناشناسا سی آنکھیں.....اور پھر گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی.....میرا ساکت بدن ہلکی سی لرزش کے ساتھ جاگ اٹھا اور میں سر جھکا کر اپنی راہ ہولیا۔ مگر دل میں رہ رہ کر ٹیس سی اٹھتی.....اس دن میں بہت دیر اندر ہی اندر سلگتا اور جلتا رہا۔ اگلے دن میں بنا سوچے سمجھے مریم سے ملنے چلا آیا۔ مریم کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔

''سوتم چلے آئے فرینڈ.....ایک طویل مدت کے بعد۔''

''ہاں.....تمہاری گرفت اتنی کمزور نہ تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''مت پوچھو میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔''

''اچھا واقعی.....'' میں نے طنز کیا۔

''ہوں اور میں تمہیں بتاؤں.....''

اس کا چہرہ گلاب ہو رہا تھا۔ اور ہونٹوں پر عجیب سی تمتماہٹ تھی۔

''نہیں..... مجھے کچھ مت بتاؤ میں سب جانتا ہوں۔'' میرا لہجہ غیر ارادی طور پر خشک ہوگیا۔

''اچھا..... کیا جانتے ہو بھلا.....؟'' اس کی معصوم آنکھیں کسی خوش آئند خیال سے چمک رہی تھیں۔

''یہ کہ.....'' میں جان بوجھ کر چپ ہوگیا۔

''کیا.....؟'' مریم نے اشتیاق سے پوچھا۔

''مریم..... یہ تم آج کل جس شخص کے ساتھ نظر آرہی ہو نا یہ کوئی اچھا آدمی نہیں۔'' میں نے رک کر کہا۔ ''اپنے آپ کو اس سے بچا کر رکھنا۔''

''کس آدمی کے ساتھ؟'' مریم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''جب سے تم نہیں آئے میں بہت کم گھر سے نکلتی ہوں۔ اور ہمیشہ اکیلی ہی۔''

میں نے بے یقینی نظر سے اسے دیکھا۔

''یقین کرو فرینڈ..... میں اتنی اپ سیٹ ہو رہی ہوں کہ کچھ مت پوچھو۔ دو چار بار کلب گئی مگر دل نہ لگا۔ یہ سوچ کر ڈسٹرب ہوتی رہی کہ تم دکھی ہوگے۔''

''جب تمہارے دل میں کوئی چور نہیں ہے مریم..... تو پھر یہ جھوٹ کیوں؟'' میں نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے پوچھا۔

''میں جھوٹ بولوں گی فرینڈ..... میں اور تم سے.....'' مریم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''مریم .....'' میں گرج اٹھا۔ ''بند کرو یہ ڈرامہ..... میں احمق نہیں ہوں۔''

''شہریار.....'' مریم کے ہونٹ سفید پڑ گئے۔

''کسی نے تم سے کیا کہہ دیا شہری کہ تمہیں میرا یقین نہیں رہا۔''

''تم کیا سمجھتی ہو میری اپنی آنکھیں نہیں ہیں۔'' مارے غصے کے میں لرز رہا تھا۔

''اور میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا ورنہ میری طرف سے جاؤ تم جہنم میں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے میری خطا تو بتا دو فرینڈ۔'' مریم کی خشک آنکھوں میں بگولے سے اڑ رہے تھے۔ ''تم نے مجھے کس کے ساتھ دیکھا اور کب..... مجھے پتا تو چلے کہ میں کس جرم میں سنگسار ہو رہی ہوں۔''

''مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مریم کہ تمہیں منع کروں مگر میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ فراز کوئی اچھا آدمی نہیں۔''

''فراز.....'' مریم کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''اب اتنا بنو مت۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''کل میں نے تمہیں اس کے ساتھ سیاہ مرسیڈیز میں دیکھا تھا آئس کریم کھاتے ہوئے۔''

''مگر کل تو میں کہیں گئی ہی نہیں فرینڈ، سارا دن سوتی رہی۔'' مریم اب بھی الجھی ہوئی تھی۔

''مریم.....'' میں نے ایک غضب آلود نگاہ اس پر ڈالی اور وہاں سے چلا آیا۔ جاتے جاتے میں نے مڑ کر ایک نظر پھر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں صحرا ہو رہی تھی اور چہرے پر دھول اڑ رہی تھی۔

غصہ مجھے یہ نہیں تھا کہ مریم فراز کے ساتھ کیوں گھوم پھر رہی تھی۔ غصہ مجھے اس کی ہٹ دھرمی پر تھا۔ مانا کہ فراز کوئی نیک نام شخص نہیں تھا پھر بھی اگر وہ مریم کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتا تھا تو مجھے کیا حق پہنچتا تھا اس کی راہ میں حائل ہونے کا..... دکھ تو مجھے یہ تھا کہ مریم نے مجھے جھٹلا دیا..... میں اندر ہی اندر تپ رہا تھا۔ کھول رہا تھا۔ بھڑک رہا تھا۔ تو مریم میں تمہارے نزدیک اتنی بھی حیثیت نہیں رکھتا کہ تم اپنے دل کی بات کہہ سکو۔ اگر وہ اقرار کر لیتی کہ وہ فراز کے ساتھ کہیں گئی تھی تو کوئی ایسی قابل تعزیر بات نہ ہوتی کہ مریم ایک ماڈرن فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور اس پر کوئی پابندی بھی نہ تھی۔ پھر اس نے کیوں انکار کیا میں سلگتا اور اپنا خون جلاتا رہا۔

رات مریم کا فون آیا۔

''تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے فرینڈ۔ تم نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔''

اف..... ایسی ہٹ دھرمی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے فرینڈ۔ اگر میں اس سے ملی ہوتی تو تمہیں جھٹلاتی کیوں..... تم نے کون سا مجھے قتل کر دینا تھا۔''

''ہاں..... یہ کام تو تم سرانجام دیتی رہو۔''

میں نے بھڑک کر ریسیور رکھ دیا۔ یہ کیا ہو گیا ہے مریم کو۔ اگر وہ صرف یہ کہہ دے کہ ہاں میں اس کے ساتھ گئی تھی اور یہ کہ آئندہ میں محتاط رہوں گی تو بات ہی ختم ہو جائے..... مگر نہیں۔ وہ ایسا کیوں کرے گی۔ وہ تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے گھس رہی ہے۔ بے وقوف بنا رہی ہے۔

افوہ..... میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

اے کاش میں تمہاری گردن مروڑ سکتا فریبی لڑکی۔ میں اپنے آپ سے الجھتا اور سوچتا رہا۔

مریم کا فون دوبارہ آیا۔

''فرینڈ.....'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''چلو میں مان لیتی ہوں کہ میں نامعلوم شخص کے ساتھ گئی تھی۔ پھر کیا تم مجھے معاف کر دو گے۔''

افوہ..... یہ اقرار بھی انکار جیسا..... اگر وہ اس کے ساتھ گئی بھی تھی تو یہ کوئی ناقابل معافی جرم نہیں تھا۔ پھر اس نے انکار کیوں کیا۔ میرے دل میں گانٹھ سی پڑ گئی تھی۔

''تم کس قدر مکار ہو مریم، بہترین اداکارہ.....'' میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

تین دن یوں ہی ویران گزر گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا وجود کسی بھاری گلیشیئر کی زد میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے آنکھوں میں ریت سی چبھتی رہتی۔ ہر وقت کوئی دل میں چٹکیاں سی لیتا رہتا۔

ایک جنگ اندر ہی اندر جاری تھی شاید مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسی بڑی بات تو نہ تھی جو میں یوں بے آپے ہو گیا۔ وہ معصوم سی لڑکی مریم..... کیا سوچتی ہو گی بھلا۔ وہ جو اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کہہ دیا کرتی تھی..... وہ تجسس نے اپنا بوجھ ہمیشہ میرے سامنے ہلکا کیا۔ اب اس بھاری بوجھ کو کیسے سہارتی ہو گی۔ شاید اس کا ضمیر جھوٹ بولنے پر اسے ملامت کرتا ہو گا وہ نادم ہو ہو کر اپنے آپ کو نوچتی ہو گی۔ پھر میری ناراضی کا بوجھ اس پر سوار ہو گا۔ سوچتی ہو گی کیسا دوست ہے جو ذرا سی خطا معاف نہیں کرتا۔ ذرا سا جھوٹ جو شاید وہ غیر اختیاری طور پر بول گئی وہ ایک سچی لڑکی جو شاید کسی کی خاطر جھوٹ بول گئی۔

بالآخر میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گیا تو کمزور پڑنے لگا۔ آخر اس کا قصور ہی کیا ہے۔ اور اگر قصور ہے بھی تو بھی میں زیادہ دیر اس سے خفا نہیں رہ سکتا۔ میں نے طے کیا۔ اور اسی دن اس سے ملنے چلا آیا۔

مریم نہیں تھی۔ اس کے پاپا ماما بھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں مایوس واپس مڑا..... ابھی گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ سیاہ مرسیڈیز زن سے میرے قریب سے گزری، گیٹ کے اندر گھستی چلی گئی۔ میں نے سنبھل کر دیکھا۔ مریم گاڑی سے اتر رہی تھی اور فراز اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر فراز نے گاڑی بیک کی اور..... دوبارہ میرے قریب سے گزر گیا۔ میں جو ساکھڑا تھا ایک دم چونکا اور تیزی سے لپکتا مریم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مریم برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ٹھٹکی۔

''کیا ہے؟'' اس کا لہجہ خشک تھا۔

''تو تم فراز کو نہیں جانتیں..... ہیں نا۔''

میرے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا اور وہ سارے نرم و کومل جذبے جو تھوڑی دیر پہلے دل کو گداز کیے جا رہے تھے بے موت مر گئے تھے۔

''مگر تم کون ہو؟'' مریم نے اجنبی نگاہوں سے دیکھا۔

''شاید کہیں دیکھا ہے تمہیں۔''

''ہاں..... اب تم مجھے کیا پہچانو گی.....'' میں پھٹ پڑا۔

''اب تو تمہاری آنکھیں اور ہی خواب دیکھتی ہیں۔''

''کیا ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ہے کہ.....'' مریم نے سرد مہری سے مجھے دیکھا۔ ''ارے تم وہی ہو نا جو اس دن چٹانوں کے پاس.....''

''بند کرو یہ ناٹک۔'' غصہ میرے اندر سے آتش فشاں کی طرح ابل پڑا۔ پل بھر کے لیے میں بدحواس سا ہو گیا اور ساری طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

''جھوٹی فریبی لڑکی اتنی اونچی مت اڑو کہ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھو۔''

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اٹھا اور اس کے رخساروں پر پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ مریم لڑکھڑائی۔ پیچھے ہٹی اور دیوار سے ٹکرا گئی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اس نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''فرینڈ تم یہاں..... مگر میں تو سو رہی تھی.....'' اس نے الجھ کر مجھے دیکھا۔

''تم کب آئے؟''

''میں.....'' میں نے گہری طویل سانس لی۔

وہ رخساروں پر ثبت انگلیوں کے نشان کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی۔

''مگر تم نے مجھے مارا کیوں فرینڈ.....؟'' اس کی معصوم آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔

''تو تمہاری آنکھوں میں پہچان لوٹ آئی؟''

میرے پتھر ہونٹوں میں زندگی دوڑنے لگی۔ مگر میرا سارا وجود زہریلا ہو رہا تھا۔ پھر سارا زہر قطرہ قطرہ میرے ہونٹوں سے ٹپکنے لگا۔

''کتنی قلابازیاں کھاؤ گی اب بس کرو۔ کہیں درمیان سے ٹوٹ نہ جاؤ۔'' میرے ہونٹوں پر زہر خند تھا اور میں اسے لفظوں کی مار مار رہا تھا۔

''تمہاری آنکھیں ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے تھک چکی ہیں نا۔ تو آنکھیں بند مت کرو۔ ترک کر دو مجھے۔ شعبدے کیوں دکھا رہی ہو۔''

''شہریار.....''

مسکرائیے!

منیر صاحب کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ وہ غصے سے دروازے پر گئے اور بولے۔ ''کون گدھے کا بچہ ہے؟''

باہر سے ان صاحب کے بیٹے کی آواز آئی۔ ''ابو! میں ہوں۔''

☆☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ''کیوں بھئی، تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟''

''اپنے گلے کی وجہ سے۔'' دوست نے آہ بھر کر کہا۔

''تمہارے گلے کو کیا ہو گیا؟'' اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔ ''کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی۔''

☆☆

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔ ''یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟''

مریض نے جواب دیا۔ ''ہاں ایک بوڑھی نرس۔''

☆☆

کھانے کی ایک دعوت میں شریک خاتون نے دوسری سے پوچھا۔ ''تمہیں کون سی ڈش پسند آئی؟''

''اسٹیل کی۔'' دوسری نے جواب دیا۔

☆☆

''عاصم! تم اپنے مکان میں کیوں نہیں رہتے۔ دن رات ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہتے ہو۔'' کاشی۔ ''کیا کروں بھائی۔ میرے مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔''

☆☆

مریم کی لرزتی آواز میں غم وغصہ، دکھ، درد اور جانے کیا کیا تھا۔

اعضاء تکلیف دہ ہو جائیں تو آدمی انہیں کاٹ دیا کرتا ہے۔ مجھے بھی کاٹ دو۔"

میں نے نرم لہجے میں ٹھنڈی مار جاری رکھی۔

"بلکہ تم کیوں تکلیف کرو..... میں خود ہی اپنے آپ کو کاٹ رہا ہوں..... جا رہا ہوں تمہاری دنیا سے۔ کبھی نہ آنے کے لیے اب تمہیں ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ سنا تم نے۔"

مریم کا چہرہ کسی اندرونی تکلیف سے سفید پڑ رہا تھا اور اس کی آنکھیں کرب سے پھٹی پھٹی سی لگ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے نہ مجھے روکا۔ نہ بلایا..... بس عجیب سناٹے کے عالم میں کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اور میں زور زور سے پاؤں پٹختا اور زمین کو ٹھوکریں مارتا سبز گیٹ سے باہر نکل آیا۔

رات بھر میں اپنے زخم کریدتا اور ان پر مرچیں چھڑکتا رہا، کوئی تیر سا کہیں دل کے اندر تر از و ہو گیا تھا۔ سانسیں بار لگ رہی تھیں اور سر و بال جان..... اور آنکھوں کے سامنے بار بار ایک ہی منظر اجاگر ہوتا۔

سلگتے ہوئے رخسار اور پھٹی پھٹی منجمد آنکھیں اور درد کی شدت سے لرزتے ہونٹ۔ گویا کوئی بہت ہولناک سانحہ گزر گیا ہو..... اور کان ایک ہی آواز سنتے۔

"تم کون ہو؟ شاید کہیں دیکھا ہے تمہیں....."

اجنبی لہجہ، نامانوس انداز، اندر سارا دھواں ہی دھواں بھر اٹھا۔ جو گہرا ہوتا جاتا اور عجیب سا درد بے حواس کیے جاتا۔

پھر ایک اور قلابازی، نیا بہروپ، بدلا ہوا لہجہ، مانوس آواز۔

"تم یہاں..... تم کب آئے..... میں تو سو رہی تھی۔"

جانے دل کو کس احساس نے جکڑ لیا..... آنکھوں میں کنکر سے چبھ رہے تھے اور چاروں طرف پھیلی دھند گہری ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہے، یہ سب کیا ہے۔" میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ عذاب مجھ پر کیوں اترا میرے مالک۔ کس گناہ کی پاداش میں....."

منظر بار بار بدلتا..... ہر بار نئی اذیت، نیا کرب، کوئی خنجر سا بار بار دل میں اتر جاتا..... پینترے بدل بدل کر کوئی تیر چلائے جاتا اور تاک تاک کے نشانہ لگاتا۔

پھر وہ غم و غصے کی شدت سے سفید پڑتی مریم۔ میں اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔

اور سفید رخساروں پر وہ انگلیوں کے قرمزی نشان..... ایک ایک عکس گویا میری آنکھوں میں زندہ تھا۔

کیا وہ لکیریں انہی ہاتھوں نے ڈالی تھیں۔ یہ بے رحم ستم گر ہاتھ اور وہ نازک شیشہ بدن لڑکی جسے میں نے چارہ گر سمجھا اور جس نے ساری سوئیاں میری آنکھوں میں اتار دیں۔

میں نے بے قراری سے اپنے ہاتھوں کو میز پر پٹخا۔

اب بھی کیا اب بھی کسی گداز کی گنجائش رہ گئی ہے نہیں۔ میں نے ٹھیک کیا۔ اس کی سزا یہی ہے۔

"اپنی راہ لو مسٹر..... میں ہاتھ توڑ دیا کرتی ہوں۔"

کوئی بٹن گھمائے جاتا۔ چینل بار بار تبدیل ہوتا۔ دماغ کے اندر بے پناہ شور تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے جالے..... بار بار میں دیکھنے کی کوشش کرتا مگر کچھ نظر نہ آتا۔

پھر ایک کوندا سا لپکا۔ ایک ساعت کے ہزارویں پل میں کسی خیال نے کچوکا سا لگا دیا۔

مریم نے پہلے بھی تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ بہت پہلے چٹانوں میں جب وہ اس پل نما درخت پر سے گزری تھی۔ بعد میں میرے استفسار پر اس نے کہا تھا کہ وہ تو سارا دن سوتی رہی ہے اور یہ

کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

''تو.....تو.....'' میں مضطرب سا ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے چکا چوندی ہونے لگی.....روشنیوں کے جھماکے.....شور اور غیر واضح تصورات.....میرا ذہن کسی خیال کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں کچھ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر خیالات واضح ہونے لگے۔ کسی مانوس سے خیال کی خوشبو میرے اردگرد چکرائی.....اور ایک انہونا سا خیال مجھے حیران کر گیا۔ بے قرار ہو کر میں نے ریسیور اٹھایا۔ پھر ڈائل کرتے کرتے رہ گیا صبح ہونے والی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنے جالے ختم ہو رہے تھے.....دھند دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی اور میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

''میں نے یہ پہلے کیوں نہ سوچا.....'' میں بار بار ہاتھ مل رہا تھا۔ پھر ہر طرف روشنی پھیل گئی میری بے خواب آنکھیں تھک چکی تھیں۔ اور پپوٹوں میں درد اتر آیا تھا مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا بہت دیر میں خود کو روکے رکھا.....اور جب اضطراب سوا ہو گیا میں نے دھیرے دھیرے نمبر ڈائل کیے۔

''واسطی صاحب.....مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے پلیز صرف اتنا بتا دیں کہ مریم سوتے میں نہیں چلتی؟'' میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔

''تم کون ہو؟ اور یہ کیوں پوچھ رہے ہو'' بریگیڈیر واسطی کی آواز میں درشتی تھی۔

''میں شہریار ہوں.....مجھے احساس ہے کہ بات کرنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں۔'' میری آواز بے ربط ہونے لگی۔ ''مگر میں یہ بہت اہم ہے۔'' الفاظ میرے منہ میں ٹوٹنے لگے۔

''بات یہ ہے کہ.....کچھ دن ہوئی میں نے مریم کو ایک خطرناک چٹان پر دیکھا.....یوں جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ تب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا.....مگر یہ بہت خطرناک ہے۔ اگر اسے سوتے میں چلنے کا مرض لاحق ہے تو پلیز۔'' میں ہچکچا کر چپ

غلط فہمی

ایک صاحب نے اپنی بیوی سمجھ کر غلطی سے ایک راہ چلتی خاتون کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بے حد شرمندہ ہوئے اور جلدی سے خاتون کا ہاتھ چھوڑ کر بولے۔

''معاف کیجیے گا محترمہ! محض غلط فہمی کی بنا پر میں آپ کو اپنی بیوی سمجھ بیٹھا تھا۔''

''قسمت پھوٹ گئی ہو گی اس عورت کی، جسے تم جیسا بے وقوف اور بدصورت شوہر نصیب ہوا.....کبھی آئینہ میں اپنی شکل دیکھی ہے۔ کالا منہ، فضول قسم کے کپڑے اور آنکھیں تو ایسی سرخ ہیں جیسے نشہ کیا ہو۔''

''خدا کی قسم محترمہ! آپ کی صورت ہی نہیں بلکہ گفتگو بھی میری بیوی جیسی ہے۔'' صاحب نے انتہائی حیرت سے جواب دیا۔

وجہ

رپورٹر: ''آپ کے شوہر کی موت کیسے ہوئی؟''

بیوی: ''زہر کھانے سے.....''

رپورٹر: ''لیکن جسم پر یہ نشان کیسے ہیں؟''

بیوی: کھا نہیں رہا تھا.....تو.....''

☆☆

ایک پاکستانی نے اپنے چائنیز انجینئر کو کھانے کے بعد جلیبی پیش کی تو وہ رونے لگا۔ پاکستانی پریشان ہو گیا اور اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟ روتے کیوں ہو؟''

اس پر چائنیز نے جلیبی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ تو لکھا ہے کہ آپ کی ماں کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

لاٹری

شوہر بیوی سے کہتا ہے۔ ''فرض کرو تمہاری ایک کروڑ کی لاٹری لگ جائے اور اسی دن مجھے کوئی اغوا کر لے اور تم سے ایک کروڑ تاوان مانگ لے تو تم کیا کرو گی؟''

بیوی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ناممکن! ایک دن میں دو دو لاٹریاں لگ ہی نہیں سکتیں۔''

سا ہو گیا۔

ریسیور پہ ایک گہری سانس کی آواز آئی..... پھر بریگیڈیر واسطی نے دھیمے سے کہا۔

''ہاں..... میرا خیال ہے کہ کئی بار ایسا ہوا.....

وہ سوتے میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی اور پھر جھنجھوڑنے پر جاگ پڑی۔ لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ کبھی وہ نیند میں گھر سے باہر بھی گئی ہو.....''

''آپ خود بھی نیند سے جاگیں تو خبر ہو.....'' میں کہتے کہتے رہ گیا..... وہ اس خالی ڈھنڈار گھر میں ذہنی مریض نہ بنتی تو کیا ہوتا..... شاید جان سے گزر جاتی۔ یا ہوش و حواس کہیں گم کر دیتی۔

''کب سے واسطی صاحب کب سے ایسا ہے۔'' میں نے اپنی آواز پر قابو پا کر پوچھا مگر اضطراب میرے اندر ہمک رہا تھا اور ذہن میں کوئی دھماکے کر رہا تھا۔

''کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا شاید چھ ماہ۔ یا اس سے کچھ کم.....''

''اوہ.....'' ریسیور میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ ''تو یہ میں تھا صرف میں۔''

''ہیلو..... ہیلو.....'' واسطی صاحب جانے کیا پوچھنا چاہ رہے تھے مگر میرے ہاتھوں سے ریسیور چھوٹ گیا۔

تو وہ اسی دن سے گم تھی..... جب سے میں نے اپنا آپ کھینچا تھا..... مگر یہ تو اس کی رضا تھی..... پھر..... پھر وہ اتنی پریشان کیوں ہو گئی کہ خود پر کنٹرول بھول بیٹھی۔ کیا اسے خود اپنا بھی عرفان نہ تھا۔ میرے دل کے اندر کوئی میخیں ٹھونک رہا تھا..... اور ڈھیر ساری مرچیں جیسے کسی نے میری آنکھوں میں جھونک دی تھیں..... ایک دم میرے اندر عجیب سی وحشت سما گئی..... میں دوڑتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی پوری رفتار پر چھوڑ دی۔ میرا پورا جسم جل رہا تھا اور دماغ خالی خالی لگ رہا تھا ہاتھ گویا پتھر کے ہو کے اسٹیئرنگ کے ساتھ چپک گئے تھے۔ پھر جب میں لپکتا ہوا مریم کے کمرے کی جانب بڑھا تو میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ کیا کہوں گا میں اس سے..... میں تو اسے بازی گر کہتا تھا..... مگر ڈرامے تو میں خود کر رہا تھا..... میں کیا آنکھیں چار کر سکوں گا۔

دھیرے دھیرے میں بدن کو کھینچتا کمرے تک پہنچا۔ مگر کھڑکی کے قریب ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ وہی تھی..... مریم میری چارہ گر..... میرے ہر درد کا مداوا۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑکی پر سر ٹیکے کھڑی تھی اور شیشے کے پیچھے اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے اور آنکھیں پتھر ہو گئیں میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا..... الفاظ میرے اندر کہیں گنگ ہو گئے تھے۔

''مریم.....'' میرے ہونٹوں سے سسکی سی نکلی۔

مگر مریم جانے کہاں تھی..... اس تک میری آواز نہیں پہنچی..... میرا جی چاہا کہ کوئی آئے اور مجھے گھسیٹتا ہوا اس کے سامنے لے جائے کہ یہ ہے تمہارا مجرم اب جو چاہو سزا دو چاہو تو زندہ رکھو چاہو تو جلا دو چاہو تو ساری زندگی منہ نہ لگاؤ کہ یہی اس کی سزا ہے اور میرا وہ ہاتھ قلم کر دو جو تمہارے گلاب چہرے پر اٹھا۔

میں دھیرے دھیرے سر جھکائے کمرے میں آ گیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کا شگفتہ گلابی چہرہ زرد ہو رہا تھا جیسے کوئی گلستان بھری بہار میں اجڑ جائے..... میرا سینہ جلنے لگا اور میرے حلق میں پھندے سے پڑنے لگے۔ دیر تک مریم بے خبری کے عالم میں رہی..... پھر اس نے آنکھیں کھولیں تو میرا شرم سار چہرہ سامنے تھا مریم کی آنکھوں کے سمندر میں تلاطم سا اٹھا اور اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں اس نے کچھ کہا نہیں بس اس کی آنکھیں پگھلتی رہیں..... میں بھی چپ رہا۔ مگر میرا دل موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھلتا رہا اور میری آنکھیں جلتی رہیں غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اٹھا اور اس کے شانے تھپکنے لگا۔

''مریم اب بس کرو مریم میرا حوصلہ مت آزماؤ۔'' میری آواز بکھری بکھری تھی۔ مریم کے آنسو اور بھی روانی سے بہنے لگے اور میرے ہاتھ اس کے

آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

''میں جانتا ہوں مریم ..... میں اندھا ہو گیا تھا۔'' میری آواز اٹکنے لگی۔ ''کبھی کبھی آنکھیں بھی تو اپنی نہیں رہتیں نا..... بہت نامعتبر ہو جاتی ہیں..... یقین کرو میں نے تمہیں نہیں خود اپنے کو نامعتبر جانا۔'' میری آواز ڈوب گئی۔

مریم چپ کی مہر ہونٹوں پر لگائے آنسوؤں کی مالا پروتی رہی۔

''تم بولتی کیوں نہیں مریم .....'' میں نے وحشت کے عالم میں اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''مجھے برا بھلا کہو ڈانٹو، کوسنے دو میرے اس گناہ گار چہرے کو تھپڑوں سے لال کر دو۔ میری آنکھیں نکال دو اور اپنے سارے دروازے بند کر لو کچھ تو کرو۔'' میں کراہ اٹھا۔

''نہیں شہری نہیں.....'' مریم کی آواز مارے کرب کے ڈول گئی۔ ''میں کیسے دروازے بند کر لوں..... تم تو خون کی طرح میرے سارے جسم میں دوڑ رہے ہو۔''

''مریم.....'' میرا سینہ پھٹنے لگا۔ ''مجھے طمانچے مارو اور خنجر سے میرا جسم زخم زخم کر دو اور سارے تیر آج ہی چلا دو۔ مگر وہ نہ کہو جو نہیں ہے..... اپنی ذات کو فریب نہ دو۔ خود اپنی آنکھوں میں ریت مت جھونکو.....''

''شہری! تمہیں کبھی میرا یقین نہیں آئے گا۔'' مریم کی آواز ڈوبنے لگی ''تمہیں سچ کیوں نظر نہیں آتا، سچ جو میرے اندر ہے اور میری آنکھوں میں ہے۔''

''تمہاری آنکھیں تو ہمیشہ تمہاری نفی کرتی ہیں..... اور اقرار کرتی ہیں۔'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں نے کہا نا کہ کبھی کبھی آنکھیں بھی نامعتبر ہو جاتی ہیں۔''

''تو پھر اپنا اعتبار بھی مت کرو.....'' مریم چلا اٹھی ''اس زمین اور آسمان کو بھی جھٹلا دو..... جب تمہارے اندر اتنا دھواں بھرا تھا تو تم یہاں کیوں آئے۔''

''میں.....'' میری آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور میرے اندر کوئی میرا سینہ نوچنے لگا۔

''مجھے اپنا یہ چہرہ لے کر تمہارے سامنے نہیں آنا چاہیے تھا مگر میں تمہارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔'' الفاظ میرے منہ میں لڑکھڑانے لگے ''میں جانتا تھا کہ تم خفا ہو گی ساری دنیا سے روٹھی ہوئی اپنے آپ سے بے زار اور میں تمہیں سمجھانا چاہتا تھا کہ دیکھو ساری دنیا سے خفا مت ہو قصوروار تو بس ایک شخص ہے صرف اسے ہی مصلوب کرو اپنے آپ سے مت روٹھو اور اس ایک نامعتبر شخص کے لیے اپنی آنکھوں میں ساون رت نہ بساؤ.....''

''اور وہ ایک شخص.....'' مریم کی آنکھیں پھر آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ ''کبھی کبھی کوئی ایک شخص اتنا اہم ہو جاتا ہے فرینڈ کہ آدمی اس کی خاطر جان سے گزر جاتا ہے۔''

''تو مریم تم.....'' میری آواز لرزنے لگی۔

''مگر تم نے تو ہمیشہ مجھے سایہ دیوار سمجھا نہیں مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اس قابل کہاں کہ قرعہ فال میرے نام پڑے۔''

''وہ سارے آنسو جو میں نے تمہارے لیے بہائے..... گواہ ہیں۔'' مریم کی نتھری نتھری سی آنکھوں میں کوئی دیا سا جلنے لگا۔

''مریم.....'' میں شدت جذبات سے اتنا ہی کہہ سکا اور میری آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی اتر آئی تو بالآخر میں اس کے دل پر دستک دینے میں کامیاب ہو گیا تھا..... اس کے قفل ٹوٹنے لگے تھے اور دل پر لگا زنگ چھٹ رہا تھا۔

''جب تم نے اپنا آپ کھینچ لیا..... تب مجھے پتا چلا..... پھر میری خشک آنکھیں سمندر بن گئیں تم نے مجھے غلط کیوں سمجھا شہری بتاؤ نا کیا میں اتنی ہی نامعتبر تھی۔''

''نہیں مریم نہیں تم تو میرا اعتبار ہو تم سے ہی میرا یقین قائم ہے۔'' میں نے اضطراب سے

کہا۔ ”مگر کبھی کبھی آدمی کا دماغ الٹ بھی جاتا ہے نا..... میں سمجھتا تھا کہ تمہاری کھڑکیاں اور تمہارے دروازے ہمیشہ میرے لیے بند رہیں گے۔“

”میرے سارے دروازے اور ساری کھڑکیاں اور سارے روشن دان تمہارے لیے وا ہیں۔“ مریم نے اعتراف کیا۔

”مریم.....“ میرے دل کے اندر ڈھیروں چراغ جل اٹھے اور میری کوئی گلی، کوئی کوچہ ویران نہ رہا۔

”مریم تم نے مجھے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہ بتایا۔“

”مجھے خود بہت دیر میں ادراک ہوا کہ میرے دل کی سرزمین تمہارے نام ہو چکی، میں اپنی ذات کی کھوج میں نکلی تھی مگر خود گم ہونے لگی، تم نے اپنے رویے کی سنگدلی سے مجھے چھلنی کر ڈالا.....“ مریم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”مجھے اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہے مریم.....“ میں نے نادم ہو کر کہا۔ ”مگر زخم زخم تو میں بھی تھا، اب میں اپنی محبت سے تمہارے سارے زخم سی دوں گا اور سارے کانٹے چن لوں اور میں ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اہل سمجھا۔“

”اہل تو تم تھے۔“ مریم کی آنکھیں جھک گئیں۔ ”بینائی میری ہی سلامت نہ تھی۔“

”بہت شکریہ مریم کہ تم نے مجھے معتبر جانا۔“ میں نے مریم کے ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”بدلے میں، میں تمہیں اپنا آپ ہی سونپ سکتا ہوں..... مگر اب کبھی گم نہ ہونا اور سوتے میں بھی حواس سلامت رکھنا۔“

”اب ایسا نہیں ہوگا.....“ مریم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اور اگر میں گم بھی ہوگئی نا تو تم مجھے کھوج لو گے ہے نا.....“

”میں تمہیں گم نہیں ہونے دوں گا، اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گا اور سارے دروازے بند کر لوں گا۔“ میری گرفت اس کے ہاتھوں پر مضبوط ہوگئی ”اور اگر تمہیں گم ہونے کا ایسا ہی شوق ہے نا تو پھر میری آنکھوں میں گم ہونا جو تمہاری محبت میں صحرا ہو رہی ہیں۔“

جذبات کی یورش سے میں بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

”تمہاری آنکھیں صحرا نہیں سمندر ہیں..... جن میں خواہ مخواہ ڈوبنے کو جی چاہتا ہے۔“ مریم کے چہرے پر شفق پھوٹنے لگی۔ ”اور اب میں کس کھوج میں نکلوں گی شہری میری تلاش تو ختم ہوگئی، تم ہی میرا گمشدہ حصہ ہو۔“

”اوہ مریم میری جان اب اپنے اس گمشدہ حصے کو بہت سنبھال کر رکھنا.....“

میں نے سرشار ہو کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اگر اب تم نے اپنی اوٹنگی بونگی حرکتوں سے مجھے کھو دیا نا تو پھر تمہیں میری تلاش میں ملک عدم تک ہی آنا پڑے گا۔“

”ایسا نہ کہو.....“ مریم نے تڑپ کر کہا۔ ”تمہیں کھونے سے پہلے میں ہی نہ مر جاؤں۔“

”نہ..... یوں نہیں۔“ ہنسی میرے ہونٹوں سے پھوٹنے لگی۔

”دونوں ساتھ ہی مریں گے..... پروگرام بنا کر ٹھیک نا.....“

”ہوں شکل دیکھی ہے۔“

مریم شرما کر ہنسی اور اس کی جلترنگ بجاتی مدھر ہنسی نرم نرم پھولوں کی طرح میری روح کو سرشار کرتی چلی گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل کے سارے زخم دھیرے دھیرے رفو ہو رہے ہوں اور جیسے میرے سارے درومٹ گئے ہوں۔

”خدایا..... اس ہنسی کو ہمیشہ سلامت رکھنا۔“ میں نے جی ہی جی میں بے حد خلوص سے دعا کی..... اور پرشوق نظروں سے اس کے گلال ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔

☆☆

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com